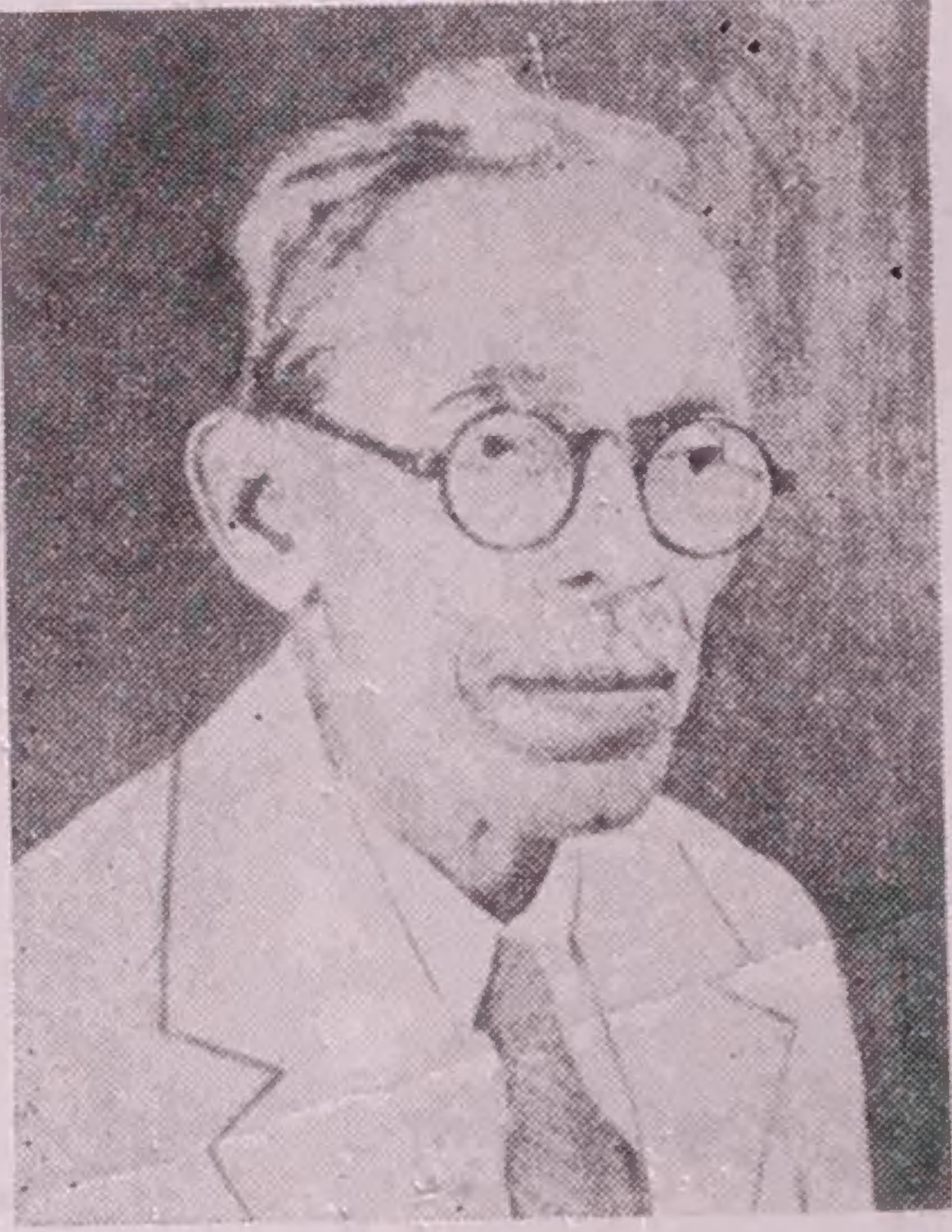


فصلج الدين بنی



جیلک اور ملارنگ

ڈاکٹر مظفر بلخی

فضائلِ دینی

حیات اور کارنامے

از

ڈاکٹر مظفر بلخی (ام۔ اے فارسی، اردو پی ایچ۔ ڈی)
ریڈر و صدر شعبہ اردو جے۔ اس۔ کالج
ڈالٹن گنج (راپٹی یونیورسٹی)

(جملہ حقوق بحق مصطفیٰ گویا عظیم آبادی مخصوصہ)

۱۔ زیر نظر تصنیف راقم کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر رانچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے جو اب ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔ کتاب میں شامل مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے مصنف خود ذمہ دار ہے۔

تعداد دو سال اشاعت _____ ایک ہزار (۱۰۰۰) ۱۹۸۸ء

صفحات _____

قیمت _____ سنہ روپے

طباعت _____ دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ ۷

ناشر _____ مصطفیٰ المصطفیٰ ام۔ اے

ملنے کے پتے

۱۔ مصطفیٰ المصطفیٰ ام۔ اے محلہ کنڈ ڈالٹن گنج پلاموں - ۸۲۲۱۰۱ بہار

۲۔ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

۳۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

۴۔ تاج بک ڈپو مین روڈ، رانچی

۵۔ مقبول منظر میگزین سنٹر مسلم نگر ڈالٹن گنج

۶۔ مکتبہ آزاد، گلزار باغ، پٹنہ ۷

فخرت

- باب اول - عظیم آباد کا ادبی پس منظر : ۱۵
باب دوم - فصیح الدین بلخی : ۲۲
باب سوم - سوانح حیات - خاندان - نسب نامہ پدری، مادری
پیدائش - تعلیم، تربیت - شادی - اولاد - ملازمت - ۵۸
عام مشاغل - اسفار - اوصاف - کمالات - وفات
باب چہارم - بہار میں اردو نشر نگاری (فصیح الدین بلخی کے عہد تک) : ۱۵۰
باب پنجم - فصیح الدین بلخی بہ حیثیت مورخ : ۱۶۸
باب ششم - " " " محقق : ۱۹۷
باب ہفتم - " " " تذکرہ نگار : ۲۵۴
باب ہشتم - " " " ناقد : ۲۸۷
باب نهم - " " " مضمون نگار : ۳۰۴
باب دہم - " " " شاعر : ۳۳۶
باب یازدہم - فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوع تصنیفات کا جائزہ : ۳۵۱
باب دوازدہم - فصیح الدین بلخی کا نثری اسلوب : ۳۶۴
کتابیات : ۳۸۴

شیر

انتساب

والد محترم پروفیسر نادم بلخی کے نام

مظفر بلخی

پیش لفظ

اُردو میں ”ادبی تحقیقات“ کی عمر زیادہ نہیں۔ تاریخی لحاظ سے ’نثری ادبیات‘ اس سیرپاہ کا مقام کہانی (fiction) اور تنقید کے بعد ہی آتا ہے۔ اس کم عرصے میں بھی، لیکن کلہاڑے تحقیق جس رفتار و شمار سے انجام پائے ہیں، کیف و کم سے قطع نظر، یہ توقع سے زیادہ ہیں۔ تحقیق واقعاتی (factual research) اور تحقیق یافت قدری (evaluative research) کے علاوہ ”ادبی تحقیقات“ کی موضوعی تقسیم پانچ ہے :-

- ۱ تصنیفی — غیر مطبوعہ / مطبوعہ شری یا نثری تصنیفات کی تدوین یا ان کی افادیت سے متعلق تحقیقات۔
- ۲ شخصیتی — گم نام / غیر معروف / معروف عام شعر اور ناشرین کی حیات و نگارشات سے متعلق تحقیقات۔
- ۳ صنفی — مختلف النوع شری / نثری اصناف کے تاریخی مطالعو یا ان کے معیار و اقدار سے متعلق تحقیقات۔
- ۴ علاقائی — اردو زبان و ادب کی علاقائی ترقی و ترویج سے متعلق تحقیقات۔
- ۵ لسانیاتی — علم لسانیات کی روشنی میں زبان اردو کے ماضی / حال سے متعلق تحقیقات۔
- ۶ نظریاتی — مختلف النوع تحریکات و رجحانات کے پیش نظر اردو ادب کے وجود و ترقی سے

متعلق تحقیقات -

دس برس پہلے کی بات ہے، اس معیار بندی کے بموجب شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی کی طرف سے ایسے تمام ملک گیر تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا تھا جو مختلف دانش گاہوں میں انجام پائے یا آزادانہ طور پر مکمل ہوئے۔ ان میں مندی اور نصابی (Ph.D. Thesis and dissertation) دونوں طرح کے مقالات شامل تھے۔ اس سروے کی روشنی میں جو اعداد حاصل ہوئے وہ مندرجہ ذیل نتائج کے حامل ہیں:-

تصنیفی مقالے ۸۹	شخصیتی مقالے ۳۹۱	صنغی مقالے ۱۶۶
علاقائی مقالے ۸۹	لسانیاتی مقالے ۳۱	نظریاتی مقالے ۹۵

(الف) سب سے زیادہ تعداد "شخصیتی مقالوں" اور سب سے کم تعداد "لسانیاتی مقالوں" کی ہے۔ یعنی، نوواردان تحقیق کے لیے کسی شخصیت (مردم / زندہ) پر ریسرچ سب سے آسان ہے۔ علم لسانیات پر یہ حوصلہ، عمل دشوار ہے کہ یہ نئی ڈسپلن ہے جس کی تعلیم و تدریس کا نظم خال خال ہے۔ (ب) "صنغی مقالوں" کا نمبر دوسرا ہے۔ یعنی روایات اور تجربات کے تناظر میں نوع بہ نوع "رنگارشات ادبی" (قدیم / جدید) کی صورتی، ہیئت و معنوی دید و شناخت اور ان تحریروں کی معیار بندی کا رجحان خاصا ہے۔

(ج) "تحقیقی مقالوں" اور "علاقائی مقالوں" کی تعداد مساوی ہے۔ یعنی، طلبہ معروف و مقبول تصنیفات (نثری / نثری) کے محاسن اور فنی لوازم و اقدار سے غافل نہیں۔ علاوہ بریں ان میں "خاک وطن" سے محبت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔

(د) "نظریاتی مقالوں" کا نمبر چوتھا ہے۔ یعنی، ہمارے طلبہ کا "مبلغ علم" محض درسی کتابوں تک محدود نہیں۔ وہ ادب کے دیگر علوم کے اہم رشتے کی صداقت کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔ محاصل (۱) نتائج ب، ج اور د یہ ثبوت ہیں کہ دانش گاہوں کے فارغ التحصیل طلبہ میں شوق مطالعہ اور ذوق تنقید کا فقدان نہیں۔ ان کے ہاں انداز قوائے ذہنی کی صحت مندانہ نو پر توجہ کی ضرورت ہے۔

(۲) شخصیات پر کام کرانے میں سخت گیری کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا باتیں بھی تمہید نہیں۔ یہ عہد اور بامقصد ہیں۔ یہ ”ادبی تحقیقات“ کی رفتار و سمت کا جائزہ اور ان سنجیدہ وادق کاموں کا محاسبہ ہیں جو ہماری دانش گاہوں میں زور و شور سے انجام پا رہے ہیں۔ تصنیف زیر نظر کی نوعیت ”شخصیتی مقالہ“ کی ہے۔ کسی شخص پر کام کرنا بہت آسان ہے، مگر اسی شخصیت کے وجود و نمونے کے خد و خال یا فہم و فکر کے نقش و نگار کو صحیح صادق بنادینا عمل دشوار ہے۔ اس کام میں کامرانی اسی وقت ممکن ہے جب موضوع اور تحقیق دونوں کے ساتھ اندازِ عمل مصنفانہ اور دیانت دارانہ ہو۔

ڈاکٹر سید مظفر بلخی کا یہ ”شخصیتی مقالہ“ کاٹا اور لے دوڑے کی مثال نہیں۔ اس سچی پیمانی کی استعداد تحقیق کے علاوہ استعانت تنقید بھی ملتی ہے، یہ بڑی بات ہے۔ یہ نوجوان اور حوصلہ مند مصنف خوش بخت ہیں کہ انہیں علم و ادب سے شوق و شغف کا بے پایاں ولولہ بطور میراث ملا۔ انہوں نے جس شخص پر ”فلم اٹھایا“ وہ ان کے جدا مجید ہیں۔ ڈاکٹر مظفر کے لیے مرحوم فصیح الدین بلخی کے روز و شب اور ان کے سرد گرم حالات شنیدہ اور دیدہ تھے۔ جہدارضی (field work) کی سخت منزل ان کی راہ میں سنگ گراں نہ رہی۔ انہیں حصول مواد، تشوید مواد اور ترزین مواد میں اپنے والد ڈاکٹر سید نادم بلخی، صدر شعبہ اُردو ڈالسن کالج، ڈالسن کالج سے خاطر خواہ سہولتیں ملیں۔ کام انہوں نے غایت محنت اور سلیقہ مندانہ کیا، انجام، لازماً حسن کارنامہ ہوا۔

ڈاکٹر سید مظفر بلخی کی اس تصنیف میں یہ ”پیش لفظ“ دو حقائق سے تعلق رکھتا ہے۔ اولاً اس کے مصنف میرے عزیز ہیں اور شاگرد بھی۔ دوم، میں نے اپنے مقالہ تحقیقی کی تکمیل (۱۹۵۲) میں جن دو چار بالکالوں کے علم و فضل سے استفادہ کیا تھا، ان میں فصیح الدین بلخی ”پہلا نام ہے۔ اس دیدہ و مورخ اور محقق پر میرا ایک سیرتی سوانحی مقالہ نمود گھسٹی میں شامل ہے۔ اسی کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

”فصیح الدین بلخی ادیب نئے، تخلیق کار نہ تھے۔ یہ حسن کے شیدائی تھے اور حسن اخلاق کے تمنائی۔ ادب اور آداب حیات کی اُلفت نے اُن کے کردار اور اطوار میں نفاست پسندی

خوش سلیقگی اور تنظیم کاری کا وہ حسن دل افزہ پیدا کر دیتا تھا جو اچھے حساس اور ہوش مند اہل ادب میں بھی کم نظر آتا ہے۔“

”انہیں تاریخ اور تحقیق سے فطری دلچسپی تھی۔ اس ذوق کی بالیدگی میں وہ ہمیشہ باشعور رہے۔ ان کی اکثر تاریخی اور تحقیقی کوششیں ”فتوحات“ کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن کامرانی کے باوجود ان کی نگارشات اور نظریہ میں DOGNATISM کے رنگ اُچھرتے۔ وہ منکسر المزاج اور دل آزاری سے دامن بچاتے ہوئے بھی حقیقی بیانی سے گریز نہ کرتے۔ قلم ہو یا تحریر، صیغہ واحد قلم سے عمداً احتیاط کرتے۔ اپنے اس سلوک اور مسلک میں وہ قاضی عبدالودود سے بہت دور اور پروفیسر سید حسن عسکری سے بہت قریب تھے۔ وہ اس مقولہ کے پیکر تھے ”SIMPLE LIVING AND HIGH THINKING“

”فیض الدین بلخی تحقیق میں قاضی عبدالودود، تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور تاریخ میں پروفیسر سید حسن عسکری کے مد مقابل ہیں؛ اصلاً وہ خادم زبان ہیں اور ایک بے لوث بندہ اردو۔ وہ بڑے محقق یا مورخ میں بھی شمار نہ ہوں گے، مگر ان کی خدمت اردو کا مقام پروفیسر آل احمد سرور کے اس خیال میں پوشیدہ ہے:۔“

”بڑا نقاد وہ نہیں جس کی رائے ہمیشہ صحیح مانی جائے۔ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جس کی رائے سے دوسروں کو کسی موضوع پر بہتر اور جامع رائے قائم کرنے کی توفیق ہو اور اس جامع رائے کا سراغ اس نقاد کی رائے سے ملا ہو۔“

فیض الدین بلخی کی علمی اور ادبی کارگزاریاں کچھ ایسی ہی عظمت کی حامل ہیں۔ صحیح معنی میں وہ ”طالب تحقیق“ تھے۔ ان کی زندگی تاریخی حقائق کی تلاش و تفتیش میں گزری۔“

”فیض الدین بلخی کا سراپہ جہدِ علمی سے بے پایاں ہے۔ ان کی تحقیقات کے مواد

یا مسالا سے بہتوں نے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر کالی کنکرت ہوں یا پروفیسر قیام الدین
 احمد پروفیسر سید اختر احمد اور یونی ہوں یا ڈاکٹر سید مظہر اقبال، فصیح الدین بلخی کے
 انمول خزانہ مخطوطات سے جھولیاں سب نے بھری اور ان کے قائم کردہ نشان راہ
 سے منزل مقصود حاصل کیا۔ وہ بحر تحقیق کے خواص تھے۔ گوشہ آب تہہ دار سے انہوں
 نے پھوٹے بڑے موتی کے خزانے نکالے۔ ایسے درہائے بے بہا جو مال بازار نہیں
 آک ادب ہوئے۔“

سید محمد حسین

۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

”الامن“

محلہ منور پور، پٹنہ ۴

۱۹۷۶ء

- ۱۔ نفاذ مجلہ شعبہ اردو، گدہ یونیورسٹی، شمارہ ۷۶-۷۵۔ مرہمہ تحقیق شعبہ اردو کھنویونیورسٹی،
- ۲۔ اس کا دوسرا اضافہ شدہ ادیشن زیر اشاعت ہے۔
- ۳۔ ملک کے مشہور تاریخ داں، گدہ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔
- ۴۔ شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کے معلم۔ وہابی تحریک اور کئی کتابوں کے مصنف۔
- ۵۔ سابق صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی
- ۶۔ صدر شعبہ اردو بھاگل پور یونیورسٹی۔

عرض حال

حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، موصوف جو محقق بھی تھے اور مورخ بھی، تذکرہ نگار بھی تھے اور ناقد اور شاعر بھی۔ جب راقم نے موصوف پر ایک تحقیقی مقالہ سیر قلم کرنے کی ہمت کی تو بڑی ذمہ داری کا احساس ہوا، اس لئے کہ ناچیز کو حضرت فصیح الدین بلخی کے نمبر ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے کہ گھر کے کسی فرد کی علمی و ادبی کارگزاریوں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔

راقم نے فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی نگارشات کے سلسلے میں مشہور اہل قلم کے تاثرات و خیالات کا مطالعہ کر کے صحیح ادبی مقام کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ادیبوں میں ڈاکٹر اختر اویس ندوی مرحوم، سہیل عظیم آبادی مرحوم، جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم، جناب سید بدر الدین بدر عظیم آبادی مرحوم، جناب قیوم خضر، ڈاکٹر عبدالمعنی، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر خواجہ افضل امام سابق ناظم شعبہ مخطوطات عربی و فارسی اور اردو پینہ یونیورسٹی، ڈاکٹر شعیب راہی، پروفیسر علی حیدر نیر وغیرہ کے تاثرات و خیالات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے بلخی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد اپنے گرانقدر مقالات ادارہ رسالہ 'کوئل'، سہ ماہی ڈالٹن گج کی گذارشوں کے بعد لکھا تھا جب کہ ادارہ کوئل نے ڈالٹن گج فصیح الدین بلخی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تھا لیکن رسالہ کوئنا سازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال یہ سودات آج بھی راقم کے پاس محفوظ ہیں۔

اس تحقیقی مقالہ کو راقم نے بارہ ابواب میں منقسم کر کے فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں

کے تمام خدوخال کا جائزہ لیا ہے بلکہ ہر معاملہ میں حقائق کی چھان بین کی ہے اور ایک واضح طریقہ کار اپنایا ہے۔

اس تحقیقی مقالہ کے حصہ اول میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے اور راقم نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عظیم آباد کی شادی میں دلی اسکول کی داغ بیل کے رنگ کی گہری چھاپ ہے اس کے علاوہ عظیم آباد کے نثری کارناموں کا بھی مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ دوم میں عصر فصیح الدین بلخی کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور عظیم آباد کی ادبی معرکہ آرائیوں کو پیش کیا گیا ہے جس میں ہندوستانی صاحب مرحوم تعلق رکھتے تھے۔ اس میں داغ اسکول کے پرستاروں اور شاگرد اسکول کے ہمنواؤں میں سخت ایسی ہشامیں چلتی تھیں۔

حصہ سوم کا تعلق موصوف کی سوانح حیات سے ہے، سب سے قبل خاندان بلخینہ کے ادبی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں سے تعارف کرایا گیا ہے۔ حصہ چہارم میں بہار میں اردو نثر کے ارتقاء سے مختصر بحث کی گئی ہے اور فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد تک کے تمام بہاری نثریوں کی تخلیقات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ پنجم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی کا جائزہ اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم کو ایک مورخ کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم تاریخ نویسی کو شعر و ادب کی عظیم منزلوں تک پہنچانے کے قائل تھے ساتھ ہی ساتھ ان کی تاریخ نویسی غیر جانبداری کی آئینہ دار ہے۔

حصہ ہشتم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کو بحیثیت ایک محقق پیش کیا گیا ہے اور بحیثیت محقق بلخی صاحب ہمیشہ نوجوان محققوں کی رہنمائی کرتے رہے موصوف اپنے تحقیقی مشن ہمیشہ فیلڈ ورک (Field Work) پر زیادہ زور دیتے رہے اس امر کے نتیجے میں ان کے حاصل شدہ مسجیدوں، مقبروں اور عمارتوں کے کتبات کی نقلیں بھی بطور حوالہ پیش کی گئی ہیں۔ نیز موصوف کی پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات عربی، فارسی اور اردو کو کیا دین ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ ہفتم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل بہار کی اردو تذکرہ نگاری کا ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے دو تذکرے ”تذکرہ نسوان ہند“ اور ”تذکرہ ہندو شعرائے بہار“ کا

ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ ہشتم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی نقوش کو پیش کئے گئے ہیں اس کے بعد ان کے تنقیدی رسالہ الشادشاہد کا تنقیدی جائزہ مختلف ادیبوں کی نگارشات کے حوالوں سے کیا گیا ہے نیز ان کی تصنیفات اور ان کے ادبی مضامین میں جو موصوف کے تنقیدی رجحانات ملتے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ بحیثیت ناقد فصیح الدین بلخی مرحوم تو کلاسیکی تنقید کے نظریہ کے قائل تھے جس کی داغ بیل حالی اور شبلی نے ڈالی تھی۔ اس گروہ کے ناقدوں میں ڈاکٹر عبدالحق، علامہ سلیمان ندوی اور ڈاکٹر محمد الدین قادری زور وغیرہ تھے۔

حصہ نہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے بلخی صاحب مرحوم کے ایسے مضامین تاریخی، تحقیقی اور دیگر فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماسوا اس کے بلخی صاحب مرحوم کے ایسے مضامین کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے جو گاہے گاہے آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوتے رہے۔

حصہ دہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کو بحیثیت ایک شاعر قارئین کے سامنے روشناس کرایا گیا ہے کیونکہ ان کا کلام بہت ہی مختصر ہے اور اس مختصر سے کلام کی روشنی میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم ایک روایتی شاعر تھے اور ان کے کلام میں میر انیس اور داغ کی فصاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔

حصہ یازدہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے جو ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہیں۔ موصوف کی ان غیر مطبوعہ تصنیفات کا منظر عام پر آنا اشد ضروری ہے۔

حصہ دوازدہم جو اس مقالہ کا آخری باب ہے اس باب میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے نثری اسلوب کا جائزہ اوسان کی تمام تصنیفات اور مضامین کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم کا نثری اسلوب وہی ہے جس کی داغ بیل میر انیس دہلوی نے رکھی تھی جو سرسید اور حالی کے بافقوں پر دان چڑھی گویا یہ کہ موصوف کا اسلوب سلاست اور سادگی کا آئینہ دار ہے۔

اس مقالہ کی ترتیب کے سلسلے میں جن حضرات نے میری معاونت کی ان میں حضرت محمود علی خاں صبا عظیم آبادی مرحوم، تمیز شاد عظیم آبادی، جناب قیوم خضر ایڈیٹر رسالہ اشارہ پٹنہ، جناب احمد یوسف ڈاکٹر حسن امام ناظم شعبہ مخطوطات عربی، فارسی اور اردو پٹنہ یونیورسٹی، والد محترم پروفیسر نادم بلخی، استاذی محترم ڈاکٹر طیب ابدالی مدظلہ العالی، ڈاکٹر شعیب راہی اور جناب کیول شرما، میں ان حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ان تمام کارکنوں کا تہہ دل سے ممنون و شکر گزار ہوں جنہوں نے حد درجہ شفقت، ہمدردی اور خلوص کا ثبوت پیش کیا۔

میں اپنے نگراں ڈاکٹر احمد سجاد یونیورسٹی پروفیسر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی کا تہہ دل سے ممنون و شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری مدد کی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ ناسپاسی ہوگی کہ میں استاذی ڈاکٹر وہاب اشرفی صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی کا شکر یہ کیوں نہ ادا نہ کروں جنہوں نے اپنے قیمتی اوقات و کال کر مجھے تعاون دیا اور ایسے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ہدایت کی اور موقع فراہم کیا۔ میں موصوف کا تہہ دل سے احسان مند ہوں۔

اس تحقیقی مقالہ کے ممتحن جناب ڈاکٹر محمد سلیمان سابق صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالقوی رسنوی سیفیہ کالج بھوپال تھے، میں ان دونوں بزرگوں کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے پی ایچ۔ ڈی (Ph.D) کی ڈگری عنایت کرنے کے لئے رانچی یونیورسٹی سے سفارش کی۔ میں اپنے بزرگ محمد رفیع الزماں قتیل کرمی کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے اس مقالہ کا مسودہ برائے طباعت نہایت ہی کاوش اور لگن کے ساتھ صاف کیا۔

آخر میں میں اپنے استاذی محترم ڈاکٹر سید محمد حسنین مدظلہ العالی سابق صدر شعبہ اردو مگدھو یونیورسٹی کا صدر جہ ممنون و شکر گزار ہوں جنہوں نے اس ناچیز کی تصنیف پر مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی اور اپنے محترم بزرگ حضرت شائق جمال ناگپوری کا بھی شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے قطعہ تاریخ برائے سال اشاعت لکھا۔

مظفر بلخی

باب اول

عظیم آباد کا ادبی پس منظر

عظیم آباد کے ادبی پس منظر کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ صوبہ بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بہار بھی ابتدائی سے علمی ماحول کا گہوارہ رہا ہے چنانچہ صوبہ بہار کے ادبی ماحول میں مختلف دور میں ہمیں شعرا و ادبا کی کثیر تعداد ملتی ہے، ان کی تخلیقات نے بہار کی ادبی فضا کو برقرار رکھا چنانچہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بہار میں بھی اردو کی ترویج و اشاعت بیشتر صوفیائے کرام کی وجہ سے ہوئی، حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد بکھی منیری اور آپ کے جانشین مولانا مظفر شمس بخٹی موتی ۸۴ھ اور دوسرے بزرگان دین کے مقولے، دوسرے اردو زبان و ادب کے نقوش ادریس ہیں یہ بزرگان دین عہد قدیم میں صوفیائے دکن، گجرات، دہلی اور پنجاب کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، ان کی خالقا ہیں اور دس گاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا مرکز بنی ہوئی تھیں، اردو شاعری یا نثر کے نمونے نویں یا دسویں صدی ہجری کے ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے۔ یہ مسلم حقیقت ہے کہ دکنی و گجراتی کے عہد سے قبل ہی اس خطہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت شروع ہو گئی تھی اور شہر عظیم آباد کو صوبہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر اختر ایدنی نے اپنی کتاب ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ میں یوں لکھا ہے:

” عین ممکن ہے کہ دکن کے دورِ اولیٰ کے متوازی بھی ادبِ قدیم کے نمونے

بہار میں مل جائیں۔“

ڈاکٹر طیب ابدالی کو دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی شاعری کا نمونہ ان کے خاندانی کتب خانہ قادیہ اسلام پورہ پٹنہ میں دستیاب ہوا۔ اس کی تفصیل موصوف اپنی کتاب ”حضرت صوفی میری کے نثری کارنامے میں یوں لکھتے ہیں:

” البتہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی ہجری کے اوائل کی شاعری کا نمونہ مجھے دستیاب ہوا ہے جس کے بارے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں چند اوراقِ منظوم فقہ کے مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں ان پر ۱۱۶۵ھ کی مہر ہے اور اس مہر پر شرف الدین بامناوی کا نام ہے۔ یہ نظم پندہ صفحات پر مشتمل ہے درمیان اواخر کے صفحات غائب ہیں۔ زبان کا ساچہ کھڑی بولی کے ساتھ اردو بولیوں سے مخلوط ہے، نظم کی ہیئت مشوی کی ہے، جابجا فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں، اس کے شاعر کا نام شمس حسن بن یار معلوم ہوتا ہے اس میں بابِ فصل کے تحت مسائل بیان کئے گئے ہیں، کتب خط نسخ میں ہے، کاغذ بھی بوسیدہ ہے، نمونہ چننا شاعر پیش کرتا ہوں۔“

ایکت راجا سرجن ہار ۛ جہنہ پوچھنے دئی سنار

تس کہیں پرسس کرتوں یاد ۛ تو تو ہووے دولہ جگ شاد

رکھی شمس حسن بن یاد

مومن کیرا جاکم بچار

چنانچہ بہار کی ادبی روایتیں بہت ہی قدیم ہیں اور جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ دبستانِ دکن کے دورِ اولیٰ کے متوازی صوبہ بہار میں تخلیقِ ادب کا کام شروع ہو چکا تھا۔

صوبہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری کے اوائل سے اردو ادب کا باضابطہ نمونہ ہمیں ملتے، مرزا عبدالقادر عظیم آبادی کی شخصیت کو لیجئے۔ بقول سید عزیز الدین راز ملخصی عظیم آبادی ہندوستان سے ایران

تک شہرت رکھتے تھے۔ موصوف ۱۵۳ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے، مدت تک شاہ محمد غلام خلف
اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ رہے پھر دکن کی سیر کو نکلے بعد دہلی چلے آئے جہاں ۱۱۲۳ھ میں
بیدل کا انتقال ہوا، ان کے رنجتہ کا ایک شعر از بخنی نے اپنے تذکرہ میں درج کیا ہے
جب دل کے آستان پر عشق آن کر بیکار
پردہ سے یار بلا بیدل کہاں ہے ہم میں

اس کے بعد گیارہویں صدی کے رنجتہ کے شعرا میں سید عماد الدین پھلواری ۱۰۶۹ھ تا ۱۱۲۳ھ، ملا محمد عظیم تحقیق عظیم آبادی ۱۰۷۰ھ تا ۱۱۶۲ھ، غلام نقشبند سجاد ۱۱۱۶ھ تا ۱۱۷۲ھ،
بی بی ولیہ، آجاگر چندا الفت، راجہ رام نرائن موزوں، شاہ آیت اللہ جوہری ۱۱۳۶ھ تا ۱۲۱۰ھ،
غلام یحییٰ حضور، شیخ محمد رشق، جوش عظیم آبادی ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۱۶ھ، شاہ نور الحق تپاں ۱۱۵۶ھ
تا ۱۲۲۳ھ، شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی، شیخ غلام علی راسخ، شاہ ابوالحسن فرد ۱۱۹۱ھ تا ۱۲۶۵ھ
ان کے علاوہ کچھ اور شعراء شاہجہاں آباد سے بھی عظیم آباد تشریف لائے اور یہاں کی ادب لٹری کے سبب
یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اشرف علی خاں، میر محمد باقر حزیں ۱۱۶۵ھ، شاہ رکن الدین عشق ۱۲۰۳ھ،
مرزا محمد علی ندوی ۱۲۱۰ھ، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، ضیا الدین دہلوی، استاد میر حسن جیسی شخصیتیں
عظمت و شہرت کی حامل ہیں۔

جناب مولوی سید احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول کے دیباچہ میں یہ خیال
ظاہر کیا ہے کہ صوبہ بہار میں اردو شاعری کی پیدائش خانقاہ میں ہوئی، موصوف یوں لکھتے ہیں:
”صوبہ بہار میں اردو شاعری خانقاہ میں پیدا ہوئی، صوفیائے کلام کی گودوں میں
پلی اور ہر دور میں اس صوبہ کی تمام خانقاہوں میں مقبول ہوتی گئی۔ پھر اس کی رعنائیوں
اور حسن دل آویزیوں نے یہاں کے ہر طبقے کے افراد کو اپنا گردیدہ بنالیا۔“

اس کے علاوہ مولوی سید احمد اللہ ندوی نے بہاری شعرا کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے،

موصوف یوں لکھتے ہیں:

”۱۔ ایک وہ گروہ ہے جس کے افراد سرزمین بہار سے اُٹھے اور وفات کے بعد

وہیں ہوندر خاک کئے گئے، جیسے علامہ شاد عظیم آبادی، علامہ آزاد شاہ بنگلہ دہی،
حمید عظیم آبادی۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے افراد پیدا ہوئے صوبہ بہار میں اور وفات پائی اس
صوبہ سے باہر دوسری جگہ میں اور وہیں لحدیں رکھے گئے جیسے مرزا عبدالقادر بیدل
عظیم آبادی، مولوی حفیظ الدین بلخی۔ سید شاہ فرید الدین بکنا امتھوی۔

۳۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ہند کے دوسرے صوبجات کے رہنے والے تھے لیکن
بسلطہ معاش کافی مدت تک صوبہ بہار کے کسی علاقہ میں رہے پھر آخر میں اپنے وطن
واپس چلے گئے جیسے سید اولاد علی کابیش جو بنوری، حفیظ جو بنوری۔

۴۔ چوتھا گروہ وہ ہے جس کے افراد ہند کے دوسرے مقامات سے ترک وطن کر کے
صوبہ بہار کے کسی علاقہ میں آئے اور یہیں کے ہو رہے جیسے حضرت یکن الدین عشق،
اشرف علی نغان وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں وہ بہاری شوا داخل ہیں جو تقسیم ہند کے
بعد بکثرت صوبہ بہار سے ترک وطن کر کے مغربی یا مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے جیسے
مولانا تمنا پھلوار دی، پروفیسر حسن عظیم آبادی، مولوی اختر سانی ساگری، فرزند ان حمید
عظیم آبادی، حسن گیادی مرحوم وغیرہ۔

۵۔ ان چار گروہوں کے علاوہ ایک اور گروہ بیرونی صوبہ بہار کے ان معزز و محترم
مہمان شوا کا ہے جو بطور مہمان کسی شاعر یا تقریب میں شرکت کے لئے صوبہ بہار
میں وقتی طور پر آتے جاتے رہے اور اپنے فیوض و برکات شری سے صوبہ بہار کے لوگوں کو
مستفید فرماتے رہے ان کی آمد صوبہ بہار کی شری زندگی کی دلیل ہے۔ درنہ بجز علاقہ
اور مردہ دل لوگوں کو کون پوچھتا ہے جیسے داغ دہلوی، حضرت سائل دہلوی، حضرت
حمید اللہ آبادی، حضرت انزل لکھنوی، حضرت امیر مینائی، حضرت نوح ناروی، مرزا دبیر لکھنوی۔

سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی نے تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کے مقدمہ میں عظیم آباد کی شاعری کے ضمن میں اپنا خیال یوں ظاہر کیا ہے :

”عظیم آباد کی شاعری میں قدیم دلی اسکول کا پاکیزہ اور مہذب رنگ نمایاں طور پر ہمیشہ قائم رہا اور یہاں کی خاک سے خوشش اور راسخ کے ایسے شعرا پیدا ہوئے جو اس دیار کے دوسرے درد اور میر تقی اور جن کے فلسفیانہ اور اخلاقی اور پھر دواور پاکیزہ کلام میں اس قسم کی غش کوئی کاشائے بھی نہیں مل سکتا بلکہ عشق حقیقی کے پاک جذبات اور فلسفیانہ و تصوفانہ رنگ کے اعتبار سے راسخ تویر سے آگے نکل گئے۔“

عظیم آباد کی شاعری نے داخلی رنگ گہرا قبول کیا ہے، داخلی شاعری سے مراد شاعر کے اندرونی جذبات اور کیفیات اور واردات قلبی کی تشریح ہے۔ چنانچہ میر کا سوز و گداز اور درد کا کیف و درد بھی داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔ چنانچہ شعرائے دہلی نے ذوق، غالب اور مومن کے زیادہ تر داخلی پہلو کو برتا ہے، چنانچہ راز بلخی نے اساتذہ دہلی کے کلام سے عظیم آباد کے اساتذہ کا موازنہ پیش کیا ہے، مثال ملاحظہ ہو۔

میراجی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر : کہ جس نے آسے پر گل کے چھوٹا آشاں اپنا
(منظر جان جاناں)

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے : معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے
(درد)

تمہاری بات لے راسخ سمجھ میں کچھ نہیں آتی : گلہ بھی یاد کا کرتے ہوا دے دیتے بھی جاتے ہو
(راسخ)

لے مقدمہ تاریخ شعرائے بہار مصنفہ سید عزیز الدین بلخی راز بلخی مرحوم نے تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کا مقدمہ اپنی زندگی میں شائع کر لیا تھا یہاں تک کہ جلد دوم چھپنے کی لاہور آئی کہ کاتب تقدیر نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا، غالباً ان کا مخطوط ان کے منجملے صاحبزادے منظر احمد بلخی مقیم بنگلہ دیش کے پاس محفوظ ہو۔

خدا پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں : کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں
(ذوق)

تاکہ پھر انتظار میں نیند آئے عمر بھر : آنے کا وعدہ کی گئے آئے جو خواب میں
(غالب)

کہا اس بت سے مڑتا ہوں تو مومن : کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی
(مومن)

شعرا نے عظیم آباد نے داخلیت کا اتباع کس قدر کیلئے اس کی مثال ملاحظہ ہو سہ
ہوئی مدت کہ دیکھا تھا کرشمہ ان نگاہوں کا : مگر دل پر وہ گزری ہے کہ اب تک یاد کرتے ہیں
(شاہ الیاس یا اس بہاری)

قیس اپنی دھن میں یہاں سے اس کی خبر نہیں : محل میں کیا گزرتی ہے محل سوار پر
(ریاض حسن خاں خیال)

جا چکی گلشن سے جب فصل بہار : آہ کبر رخصت ملی پرواز کی
(آزاد عظیم آبادی)

چشم مجنوں سے اگر پردہ غفلت اٹھ جائے : بے دل ہی میں جمال رخ سیلی دیکھے
(اثر عظیم آبادی)

یہاں ہے کہاں اور تیرا دشت کہاں ہے : اے قیس عشق نہیں ہے خفقاں ہے
(اکبر وانا پوری)

پردانہ بن تو پہلے کسی شمع ناز کا : یوں لطف تو ملے گا نہ سوز و گماز کا
(باتر عظیم آبادی)

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو : موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو
(شاد عظیم آبادی)

کچھ ایسے واقعات مرئے ل کے ساتھ ہیں : جیتے تو ہیں مگر بڑی شکل کے ساتھ ہیں ()

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سادول میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

(ضیا عظیم آبادی)

جرس قافلہ ہم اپنی نغاں رکھتے ہیں : تو شدہ دل شباب و قفاں رکھتے ہیں
(مشرقی منیری)

دل کے جانے کا تھا اک ماتم بپا : ہوش بھی کھو بیٹھے اس کہرام میں
(نصیر نگر نہسوی)

جذالہ اب تک آتا ہے وہ بیتاب نہ آتا ہے : دل بیتاب کا کہتا ہوا افسانہ آتا ہے
(مبارک عظیم آبادی)

گلانہ کاٹ سکے اپنا دائے ناکامی : پہاڑ کاٹتے ہیں رات دن مصیبت کے
(مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی)

ضبط فریاد سے بھی راز محبت نہ چھپا : کھل پڑے آنکھوں سے اشکوں کے ڈھریلے
(راز بلخی عظیم آبادی)

مذکورہ بالا عظیم آباد کے شعرائے کلام سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ عظیم آباد کے
شعرائے دلی اسکول کی داخلیت کو قبول کیا ہے لیکن ایسی بات نہیں کہ عظیم آباد کے شعرائے لکھنؤ اسکول
کی نمایاں خصوصیت خارجیت کو نظر انداز کر دیے، وہ اپنے کلام میں لکھنؤی خصوصیات کو بھی جا بجا
خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صغیر بلگرامی اور شاد عظیم آبادی کی شاعری دبستان لکھنؤ
دلی کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے، جہاں تک صغیر بلگرامی کا تعلق ہے انہوں نے ناسخ کے شاگرد
میرامن علی تھر سے بھی مشورہ سخن کیا تھا اور غالب دہلوی سے بھی اصلاح لی تھی، اسی طرح شوق نیوی کی
شاعری میں لکھنؤ اسکول کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے جیسا کہ فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنے مقالہ علانہ
شوق نیوی رسالہ "اشارہ" (پٹنہ دسمبر ۵۸ء) میں کہا ہے :

"یاس بہاری کے کلام میں وزیر لکھنؤی اور صبا لکھنؤی کا رنگ نمایاں طور پر

غالب ہے اور یہ قول بھی فصیح الدین بلخی مرحوم کا ہے جیسا کہ موصوف نے یاس بہاری کی شاعری سے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔
 ڈاکٹر کلیم عاجز اپنے گرانقدر تحقیقی مقالے ”بہار میں اردو شاعری ۱۸۵۵ء سے ۱۹۱۴ء تک“ میں بہار کی اردو شاعری کے متعلق اپنے خیال کا یوں اظہار کرتے ہیں :
 ”بہار میں اردو شاعری کی روایتیں پرانی ہیں، بہار کی شاعری کا عام میلان دہلوی ہے، صوفیانہ علامت نمایاں ہے جو یہاں کی نمایاں انفرادیت ہے، سجاد اور راسخ کا تغزل اپنے میلان اور مزاج کے لحاظ سے دہلوی روایت کا حامل ہے، کئی اساتذہ نے لکھنؤی متاذوں سے تلمذ کیا تھا، ان اسباب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤی مزاج بھی پٹنہ میں داخل ہو گیا اور ایک ملت تک چھاپا رہا۔ لیکن بہار میں سجاد اور راسخ کی روایتیں مستحکم تھیں.....“

ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنی تصنیف ”مرزا محمد علی فذوی“ میں لکھتے ہیں کہ عظیم آباد کی شاعری دبستان دہلی سے زیادہ قریب ہے، موصوف یوں لکھتے ہیں :
 ”عظیم آباد کو لکھنؤ سے قربت نصیب ہے مگر یہاں کی شاعری دبستان دہلی سے زیادہ قریب ہے، دہلی اسکیں کاسنگ و آہنگ عظیم آباد کی شاعرانہ قدروں میں صاف جھلکتا ہے۔ عظیم آباد میں مذاق شاعری اس آن بان اعداس انہماک کے ساتھ نظر آتا ہے جو شاہجہاں آباد میں موجود تھا۔“

عظیم آباد کے شعرائے دہلی کے صوفیانہ کلام کو سب سے پہلے قبول کیا اور اپنی شاعری منظر حیاں جاناں اور خواجہ میر درد کے گہرے رنگ کو قبول کیا۔ صوفیانہ شاعری میں اس لحاظ سے قصبہ بھلپوری کا نام بہت اہم ہے جو ابتدا ہی سے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کا مولد و مسکن رہا ہے۔ درس تبلیغ کے علاوہ یہاں کی

بزرگ و مقدس ہستیوں نے شعر شاعری سے دلچسپی رکھی۔ سجاد، تپاں اور جوہری کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کے کلام میں خواجہ میر درد اور منظر جان جاناں کا رنگ ملتا ہے۔
چند شعراء کے اس رنگ کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

تپاں :

اللہ ہے اللہ ہے اللہ نام اللہ کا
کیوں کہیں یہ شمس و قمر کس پر ہیں یہ ارض و سما
معراج ہے معراج ہے جس کا تلاوت نام ہے
کہتے ہیں جس کو سب تپاں میخوار و خدا ایک ہے
ہوئے جو کچھ آدے نظر جلوہ تمام اللہ کا
بو جھے گی اس کو عقل کیا انتظام اللہ کا
ہے گفتگو اللہ سے پڑھتے کلام اللہ کا
خم خانہ توحید میں پیتا ہے جام اللہ کا

سجاد :

رکھے ہیں خمیں در پہ تیرے گنبد گردوں
سجاد جو سمجھے ہے خود اپنے تئیں موجود
سجدہ تیرے دروازے پہ خورشید کرے ہے
وہ فہم نہیں معنی توحید کرے ہے

جو ست مش :

جود کہ جلوہ گاہ ہوا اس کے نور کا
ز نہار عکس غیر نہ ہوا اس میں جلوہ گر
تو ڈھونڈتا ہے جس کو وہ شہرِ رگ ہے قریب
مشتاق وہ نہیں ہے تجسلی طور کا
یہ دل تو آئینہ ہے کسی کے صہور کا
خوشحال خیال دل میں نہ رکھ دو دردور کا

راسخ :

کس قدر بوفلموں جلوہ ہے اپنا محبوب
ہو دیوانہ ہر اک فرزانہ تیرا
سربازار وجود آپ سے کیا نہیں میں
ورق آب زدہ سا ہے یہ میرا نسخہ
ایک بھی اُس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا
جلوہ دکھلائے کو اپنا کوئی لایا ہے مجھے
صفحہ ہستی سے جو حرف اٹھایا ہے مجھے

نالاں :

دیر و کعبہ پر نہیں موقوف شیخ و برہمن ۔ کون سی جگہ جہاں جلوہ نہیں اللہ کا
دیکھ لی آج جو اس ماہ لقا کی صورت ۔ فی الحقیقت یہی ہووے گی خدا کی صورت
مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے مفاہین عارفانہ اور درویشانہ کے بعد شعرائے عظیم آباد
نے جو دوسرا رنگ قبول کیا وہ میر تقی میر کی گریہ و ناری اور سحر بیانی ہے۔ میر تقی میر کا رنگ اردو شاعری
پر بہت تیزی سے چھایا چنانچہ عظیم آباد کے رنگ تغزل میں میر کی غزلوں کا جو سوز و گداز، درد اور شمس
موجود ہے۔ عظیم آباد کے شعرا میں بخشش، رضا، امین، حسرت، حضور، خلیل، شورش، دل، اور
ستیا دے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

میر کا شعر ہے ۔

احوال میر جی کا مطلق کیا نہ سمجھا کچھ زیر لب کہا بھی دیر دیر دو کہ
راسخ یوں کہتے ہیں ۔

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے ۔ گھل بھی یار کا کرتے ہو اور روئے بھی جاتے ہو

رضائے اسے یوں ادا کیا ہے ۔

اُس گفٹی کچھ تھے اور اب کچھ ہو کیا تاشا ہے تم عجب کچھ ہو
ایک جگہ میر کہتے ہیں ۔

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح ۔ اس میں بے اختیار، میں ہم بھی

مجھے کام روئے سے اکثر ہے ناصح ۔ تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

چنانچہ اس جذبہ کو راسخ نے یوں پیش کیا ہے ۔

نصیحت گریہ تو ہے پردل پہ جواک چوٹ سی ہے

قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار منونہ

ٹپک پڑے ہیں راسخ آنسو : دل ہے کتنا گداز تیرا

اور امین کا بھی یہی عالم ہے ۛ
 عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی : دن کٹا فریاد میں اور سات زاری میں کٹی
 رضا پر بھی یہی کیفیت طاری ہے، لوگ پوچھتے ہیں ۛ
 سچ کہو میرا رضا کس پہ ہوئے ہو عاشق بے سبب تو نہیں یہ ہر گھڑی رویا کرنا
 اور پوچھنے والے کا پھر کیا عالم ہوا ۛ

حال جس نے مرا سنا ہوگا اُس نے سنتے ہی رو دیا ہوگا

فداوی کے ایک شاگرد ثابت کی بھی یہ گریہ زاری ہے ۛ

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہہ دل اب کیا کام کریں

شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

میلو کی دنیا تاریک ہے ان کا دل مفلس کا چراغ ہے ۛ

شام ہی سے بجھا سار ہوتا ہے : دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ثابت کی دنیا میں بھی چراغ محبت روشن ہے مگر کیسا ۛ

روشن ہے مگر شیشہ سوزاں میں داغ ایک : تاریک گھر میں جلتا ہے جیسے چراغ ایک

جوشش کے دل کا داغ بھی چراغ روشن سا وجود رکھتا ہے ۛ

جس طرح دل کا داغ جلتا ہے : اُس طرح کب چراغ جلتا ہے

رضا کہتے ہیں ۛ

نہیں یہ داغ سے جلتا دل و جگر اپنا : چراغ لے کے دکھاتے ہیں غم کو گھر اپنا

میر کے اس رنگ کو برتنے میں شعراءِ عظیم آباد کے یہاں آدھ نہیں بلکہ آدھ ہے، ذیل میں

شعراءِ عظیم آباد کے نمونہ کلام کو پیش کیا جاتا ہے ۛ

امین :

عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی دن کٹا فریاد میں اور سات زاری میں کٹی

تپاں :

جب محبت کا نام کوئی لے
دل یہ چلائے ہے کہ اب ہم کو
جوششش :

ٹک صبری سے کام کوئی لے
دونوں ہاتھوں سے تھام کوئی لے

یار بن لطف کیا ہے جینے کا
مغتنم جانا ہوں رونے کو
خلیل :

ایسی ہم زندگی سے درگندے
گر مری یوں ہی عمر بھر گزرے

اے اشک نہ کیجیو آشکارا
نالہ مرا سن گلی میں پوچھا
لوگوں نے کہا خلیل ہو گا
حصنور :

منہ پر نہ چڑھے جو کچھ نہاں ہے
بے رحم کسی کی یہ فغاں ہے
بولا کہ وہ اب تلک یہاں ہے

ہٹا فوس اے عمر جانے کا تیرے
یہ لوفان اشک اس میں آنکھوں کی کشتی
سشورش :

کہ تو میرے پاس ایک مدت رہی ہے
تعجب ہے کیونکر سلامت رہی ہے

سشورش یہ تیرے نالہ جانکاہ ہے تو مات
دل :

چاہا کہ سوؤں کوئی گھڑی پر نہ سو سکا

منہ ڈال کے جب دیکھا غنچے کے گریباں میں
کس طرح سے رہیگا اس خانہ دیراں میں

شرمندہ ہوا آخر میرے دل پُرخوں سے
دیکھا جو مرے دل کو یہ بات کہی غم نے
سجاد :

گہرا دے مت وہ آدے ہے
پہچان بھی کوئی پاوے ہے
سجاد وہی کہلاوے ہے

میں دل کو یوں سمجھاؤں ہوں
اک دم دبلا ہڈی ہڈی
بن بن جو پھرے مارا مارا

راسخ :

یہ رنج غریبی سبب خستہ تھی ہے : جوں نقش قدم اپنا وطن بے وطنی ہے
 اے اہل طلب بزم میں ہم ماتیوں کے : مت آیویاں نوہ گری سینہ زنی ہے
 جلنے پہ مرے دل کے تم آئسو نہ بہاؤ : مت آب فشان یہ بنا سوختہ تھی ہے
 رصا :

یارین اپنی زندگی اے خضر : موت ہے موت ہے عذاب عذاب
 گسریاں :

جدائی سے تری رہتا ہے دل رنجور پہلو میں : رہے گیت ملک غیروں کے تو مغرور پہلو میں
 ہمارے یار بھی دشمن بغل کے ہو گئے گریاں : کریں ہیں ہر گھڑی کس کا یہ سب کو پہلو میں
 نالان :

گر نہ ہوتا تھا فلہ ہمراہ اشک آہ کا : پہنچنا معلوم تھا اس تک دل گمراہ کا
 مشتاق :

کیا دکھا دیں گے منہ و وفا کو ہم : چشم میں نام کو بھی نم نہ رہا
 کون سا نالہ تھا کہ سر نہ رہا : آہ دل میں ترے اثر نہ رہا
 چنانچہ عظیم آباد کی شاعرانہ مناسبتیں میر کا رنگ اس قدر مقبول عام ہے کہ دور متاخرین کے
 شعرائے بھی اس رنگ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے، حالات نے بھی ذیل کے دو عظیم
 آبادی شعرا کو کچھ ایسا حرام نصیب بنا دیا کہ ان کا کلام درد و اثر سے پُر معلوم ہوتا ہے، درد و اثر
 میں مماثلت کی بنا پر لوگوں نے ان کے کلام کو میر کے نام سے منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔
 اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سادل میں ہوتا ہے
 ہیں رات کو اٹھ اٹھ روتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے
 ضیہ عظیم آبادی

صحرا صحرا دریا دریا مارے مارے پھرتے ہیں :۔ آہو جان کے وحشی ہم کو ساتھ بہا کر پھرتے ہیں

آخر عظیم آبادی

شاد عظیم آبادی کے کلام میں میر کا گہرا رنگ موجود ہے، مثال کے طور پر شاد کا ایک مشہور شعر ہے یہ

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا :۔ زندگی چھوڑ دے بیچھا مرا میں باز آیا
دور متاخرین کے شعراء کے کلام میں یہ رنگ کس قدر مقبول عام ہے اور اس کا اندازہ کرنے کے لئے
یہاں چند شعراء کے کلام بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں یہ

آئے اشکوں میں خونِ دل دل کے

نطفِ رونے کا جب ہے اے غم یار

حوصلے پست ہو گئے دل کے

ریخ اتنے اٹھائے اے شاد آب

شاد آب ریل پوری تلمیذ امیر مینائی

دلی تھی جو پرانی چوٹیوں اس کو ابھرتا تھا

کلیجے کا پھپھولا دیکھ کر جی میرا بھر آیا

وہی اچھے ہے جینے سے اچھا جن کا مرنا تھا

شفق جینے پہ جومتے تھے مرے اور دکھ سہتے

شفق عماد پوری

یوں دل کی آند و دل مضطرب رہ گئی :۔ آندھی سی اٹھ کے گنبدِ بید میں رہ گئی

فیض الدین ملکی عظیم آبادی

جنالہ لب تک آتا ہے وہ بتا بانہ آتا ہے :۔ دل بیتاب کا کہتا ہوا افسانہ آتا ہے

ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

یہاں تک کہ دورِ جدید کے بہار کے مشہور شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے جن کی
شاعری میں میر کے کلام کی بھرپور جھلک ہے۔

یہ امر بھی کافی غور طلب ہے کہ داغ کی شاعری کا اثر خصوصی طور پر عظیم آبادی شعراء کے کلام

میں ملتا ہے مثال کے طور پر داغ کے نامور شاگرد ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر

ہے جنہوں نے اپنے استاد کے رنگ کے اتباع کو کمال کی منزل تک پہنچایا یوں تو داغ دہلوی کے

شاگردوں میں ڈاکٹر اقبال بھی ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں بطور احترام ذکر کیا ہے لیکن ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ ان کے اشعار بالکل داغ کے رنگ کے معلوم ہوتے ہیں، داغ دہری
عظیم آباد میں جناب باقر عظیم آبادی کے گھر پر تشریف لائے تھے۔ چنانچہ ان کے اشعار سے ظاہر
ہوتا ہے۔

چاردن کی جو سیر پٹنے کی یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی
میر باقر کے گھر قیام ہوا خوب دعوت کا اہتمام ہوا
داغ کے بہاری شاگردوں میں جناب ہالفت پچنوی، جناب نسیم ہسوی، جناب نظام الدین بٹنی اہل
ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے۔

شعرا نے عظیم آبادی نے مثنوی نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ کی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں
راہِ سخن نے اپنے کمال دکھائے، قاضی عبدالغفار غفار کی مثنوی جو اہر الاسرار ۱۹۱۱ھ، محمد فقیہ کی
مثنوی ساتی نامہ، شاہ حضرت رکن الدین عشق کی مثنوی ساتی نامہ۔ اسی طرح شیخ غلام یحییٰ حصود کی
دو مثنویاں خالقہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں موجود ہیں، شاہ آیت اللہ جوہری کی مثنوی گوہر جوہری
بطور خصوصی قابل ذکر ہے (اس مثنوی کو پروفیسر سید حسن عسکری نے منظر عام پر لایا) جو شش کی چار
مثنویاں، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کی مثنوی زیبا۔ شعرا نے متاخرین نے بھی مثنوی نگاری کی طرف
توجہ کی ہے، شوق نیوی کی مثنویاں نغمہ راز ۱۳۰۳ھ، سوز و گداز ۱۳۱۲ھ شہرت کی حامل ہیں۔
شاہ عظیم آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ ۱۳۰۸ھ مثنوی چشمہ کوثر غیر مطبوعہ اور ایک قوی
مثنوی مادرِ جہد لکھی۔ شاہ امیر الدین وجد کی بھی تین غیر مطبوعہ مثنویاں موجود ہیں۔ کیفی بہاری کی قوی
مثنوی ۱۹۱۲ھ مولانا عبدالحلیم شرر کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ باقر عظیم آبادی نے بھی مثنوی کیمیائے دل
کہی۔ احقر بہاری مشرقی منیری کی بھی غیر مطبوعہ مثنویاں یادگار ہیں۔

عظیم آبادی شعرا نے مثنوی نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ عہد متقدمین میں جوہری کی شخصیت

نمایاں طور پر قابل ذکر ہے اس کے علاوہ نذر الحق تپاں اور ظہور احسن کی شخصیت ہے جنہوں نے کئی مرثیے لکھے، جناب قاضی عبدالودود نے عہد متقدمین اور متاخرین کے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر ڈاکٹر اختر اور بیوی نے اپنے مقالہ ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء“ ۱۸۵۷ء میں نہیں کیا ہے بہر کیف قاضی صاحب یہ لکھتے ہیں :

”مصنف نے پھلواڑی کے مرثیہ نگاری کی طرف خاص توجہ کی ہے لیکن خاص عظیم آباد کے مرثیہ کہنے والوں کا ذکر نہیں کیا۔ حیران عظیم آبادی مرثیہ میں مظلوم تخلص کرتے تھے اور بقول شورش مرثیہ گوئی میں شہرت تام رکھتے تھے، شورش وغیرہ نے دوسرے عظیم آبادی مرثیہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے.....

سلیم گریاں (برادر کلیان سنگھ) غلام بنگالی (دکن) عشرت سعد اللہ تخلص بہ شاہ راغب، رند، کرم علی خاں کرم (صاحب دیواں) محمد سعید، حسرت، ثبات، ذریع، یکتا، صوفی مینری وغیرہ قابل ذکر تھے۔“

جناب صفیر بنگالی نے بھی مرثیہ لکھا۔ شاد عظیم آبادی نے اس سلسلہ کو قائم رکھا، بالکل دور جدید کے شعراء میں علامہ حمیل مظہری مرحوم، راز عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے۔ میراجیس اور مرزا دبیر مرحوم برابر محرم کی مجالس میں شرکت کے واسطے آتے رہے اس کے بعد میراجیس اور مرزا دبیر کے خاندان والے برابر اس سلسلہ کو قائم رکھے رہے۔

عظیم آباد کے شعراء نے ہجو کی طرف کم توجہ کی ہے البتہ اشرف علی خاں فحاش کا نام قابل ذکر ہے جنہیں ظریف الملک کہا جاتا ہے۔

شعراء عظیم آباد کے کلام میں لکھنوی طرز بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ راسخ عظیم آبادی دوبار لکھنؤ تشریف لے گئے، راسخ جب دوسری مرتبہ لکھنؤ گئے تو وہ زمانہ غازی الدین حیدر کا تھا اور راسخ کا طوطی بولتا تھا، بقول قاضی عبدالودود راسخ کے زمانہ ہی سے عظیم آباد کے شعراء پر راسخ کا اثر ہونے لگا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر کے شعراء نے راسخ کا گہرا رنگ قبول کیا۔ مہدی عظیم آبادی نمبر ۱ مصنف سیر المتاخرین کے کلام میں راسخ کا طرز نمایاں طور پر ملتا ہے ان کا دیوان

کتب خانہ خدا بخش میں ہے۔ اس میں ناسخ کے متعلق یہ مطلع ہے
 ہو سکے مہدی سے کب ناسخ کے دیوان کا جواب
 مور کی کیا تاب ہے دے جو سیماں کا جواب
 دیوان میں طرز ناسخ کی بہت سی غزلیں ہیں، اس رنگ کا ایک شعر ملاحظہ ہو
 ہو تصور کیوں نہیں اس کے رُخ پر نور کا : ہے مدام اقرص کا نور اس دل محروک کا
 شاد عظیم آبادی کے استاد محترم حضرت الفت حسین کا اردو کلام زیادہ نہیں، بہر حال ان کے کلام میں
 ناسخ کی جھلک نظر آتی ہے۔

خوں ہونے کے دل عبث غم دوری سے بہہ گیا : یہ آبلہ تو زیبِ کفِ پائے یار تھا
 فریاد کے شاگرد مہدی بخش تسلیم کا دیوان سراسر ناسخ کے رنگ میں ہے اور ان کا دیوان کتب خانہ
 خدا بخش میں موجود ہے ان کے دو اشعار دیکھئے۔

جگر میرا ہے گلشنِ لالہ نار داغِ بچراں کا : شکافِ زخمِ بیل چاک ہے میرے گریباں کا
 میں ہوں دیوانہ ملک بے نشانِ شتِ پنہاں کا : رگِ مرگانِ عناقِ سبزہ ہے میرے بیباں کا
 لے خواجہ سلطان خاں سلطان متوفی ۱۲۷۲ھ، صاحبِ دیوان ان کا دیوان کتب خانہ
 خدا بخش میں موجود ہے، بیشتر غزلیں ناسخ کے رنگ کی ہیں، ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔
 وار کیا معلوم تیغِ نگاہِ یار کا : ساحلِ بحرِ فنا ہے گھاٹِ اس تلوار کا
 سو جو آبِ زمرہ سے مری زنجیر ہو : ہوں میں دیوانہ کسی کے سبزہِ خسار کا
 فیض عظیم آبادی بھی مصحفی کے آخری زمانہ میں ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کے یہاں بھی
 ناسخ کے رنگ کے شعر ملتے ہیں۔

آسماں پر اشک کو لے جائیگی تحریکِ آہ : یہ ہوا اُٹھتے ہی دریا موجِ فوں ہو جائیگا
 فیض اب اس کو ندامت ہے ملکِ پاشی سے : تیرے زخموں نے عبث اس پر شکرِ خند کیا

سید علی خاں قائل عظیم آبادی شاگرد رنگ لکھنوی سراپا سخن اور سخن شعراء میں ایک شعر

درج ہے ۵

نامے کئے ہیں دیکھ کے تل تیری ہونٹ کے : مکھی بنا کشنگ کی ایک ایک خالی لب
مرشد حسن کا تل عظیم آبادی شاگرد وزیر لکھنوی سراپا سخن اور سخن شعراء میں ان کا کلام ہے ۵
چٹکی انگشت حسائی سے بجا کر کہتے ہیں بولتا ہے لال لودیکھو حنا کے رنگ کا
صفیر بگڑامی کی تقریباً ساری عمر بہار میں گذری وہ میرا مان علی سحر شاگرد ناسخ و برق سے لہذا اختیار
کر چکے تھے صفیر ناسخ کے مداح تھے ان کا کلام بالکل لکھنوی رنگ میں ہے۔

جناب قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق بہاری شعراء نے ریختی بھی کہی ہے۔ موصوف
نے ڈاکٹر اختر اور مینوی کی کتاب بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک پر ایک گراں قدر
تبصرہ کیا جو رسالہ سماہی نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا بعدہ
جناب کلیم الدین احمد نے قاضی صاحب کے ان مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کیا، قاضی صاحب بہار
میں ریختی گوئی کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں۔

۱۔ بہاری شعراء نے ریختی کہی ہے، مہدی عظیم آبادی کے دیوان میں تو ریختی کے
اشعار برائے نام ہیں مگر دعاء بقول قاسم حسن خاں کتاب دار خدا بخش خاں
ان کے پردادا کے کلیات کتب خانہ خدا بخش میں ان کا دیوان ریختی شائع ہے
یہ انشاء کے بڑے مداح اور ان سے متاثر تھے۔ دعاء کا ایک شعر یہ ہے ۵
حضرت انشاء تلک ساری بات : رہ گیا ہے اب دعاء نام سخن
عظیم آبادی میں مشاعرہ کا رواج عہد جو بخش اور ناسخ میں موجود تھا، ان مشاعروں میں سے کسی ایک
مشاعرہ میں ناسخ نے اپنی مشہور غزل پڑھی تھی جو سراج کی مقبول و معروف غزل پر کہی گئی تھی جس کا

۱۔ ملاحظہ ہو مقالات قاضی عبدالودود مرتبہ کلیم الدین احمد ص ۱۶۳ تا ۱۶۴

۲۔ عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ مصنفہ ڈاکٹر یوسف خورشیدی ص ۳۴ تا ۳۵

یہ شعر تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔

نہیں ہوش فالوں سے کچھ غرض مجھے شک ہے تو انہیں یہ ہے

جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

عظیم آباد میں ابوتراب خاں کے دولتکدہ میں بڑے دھوم دھام سے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں راسخ اکثر و بیشتر شرکت فرماتے تھے۔ عمر ان کی اس وقت ستر سے زیادہ تھی۔ شاہ عظیم آبادی کے استاد محترم حضرت فریاد نے اپنی پہلی غزل راسخ کی موجودگی میں پڑھی تھی۔

حضرت فریاد کی نانیہال محلہ دھول پورہ متصل حاجی گنج میں بھی ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کو مشاعرے ہوتے تھے ان میں دو مشاعرے کافی کامیاب ہوئے، ان مشاعروں میں مہبت سنگھ یادگار خاندان ہمارا جہ شتاب رائے، نواب فیروز جنگ، نواب سہراب الدولہ، نواب شجاع قلی خاں وغیرہ رؤسائے شہر نے شرکت کی۔ شعرا میں راسخ عظیم آبادی، منشی کاظم علی خاں، حکیم ابوالحسن مفتوں، نواب مرزا مہدی خاں کے نام سرفہرست ہیں۔

راجہ پیارے لال الفتی کے پوتے کنور سکھراج بہادر رشتہ بڑے دھوم دھام سے مشاعرہ کرایا کرتے تھے جن میں صوبہ بہار کے نامور شعرا شرکت فرماتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۹۵ھ میں نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ پانچ مشاعرے کئے تھے اس کے علاوہ رائے بیچنا تھ پر شاہ غنیمت کا بھی نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ۱۲۹۵ھ میں مشاعرہ کرایا تھا۔ بادشاہ نواب رضوی نے شعر و سخن کی کئی ایسی مجلسیں منعقد کرائیں جو آج بھی بطور یادگار ہیں۔ بادشاہ نواب رضوی کے بعد دوسری شخصیت سپہ شاہ حامد حسین حامد عظیم آبادی کی ہے جن کی دعوت پر ہندوستان کے ممتاز شعرا سائل دہلوی، سیلاب اکبر آبادی، نوح زار دی اور احسن مارہروی بلا بر عظیم آباد آتے تھے اور درگاہ شاہ ارزاں کے مشاعرے میں شرکت فرماتے تھے۔

دبستان عظیم آباد بحیثیت مجموعی طور پر ہندوستان کے ادبی مراکز میں ہے۔ اس کی

خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت اور بھی چھوٹے چھوٹے ادبی مراکز مختلف محلوں اور ٹولوں میں موجود تھے۔ مثالی کے طور پر علامہ صاحب پور کو لیجئے جہاں مولوی عنایت علی اور مولوی ولایت علی جیسی شخصیتیں گزری ہیں۔ مذکورہ صادقہ کو بڑھانے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی جیسی شخصیتیں ہندوستان گیر غریب کی حامل تھیں۔ جب آپ دہلی تشریف لے جاتے ہیں تو آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کو دہلی میں آپ کی تشریف آوری کی خبر ملتی ہے تو حکیم مومن خاں مومن کے توسط سے وہ اپنے محل میں مدعو کرتے ہیں چنانچہ مولانا موصوف دہلی تشریف لے جاتے ہیں ان کی ایسی عظیم شخصیت تھی کہ حضرت سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد ہندوستان گیر طور پر دہلی تحریک کی امامت انہیں کے سپرد ہوئی۔

صوبہ بہار کو اس امر کا غریب ہے کہ نہ صرف کسی شہر بلکہ قصبات اور دیہات سے اپنے ادبی چشم و چراغ پیدا کئے جنہوں نے دنیا کے ادب میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ چنانچہ ڈاکٹر کلیم عاجز اپنے گرامر قدرتِ تعالیٰ میں انہیں پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

”بہار میں عہد جدید شاعری کا علمبردار علامہ فضل حق عظیم آبادی گیا ضلع کے ایک کوردہ گاؤں شاہ بگہ کے رہنے والے تھے، انگریزی ادب اور انگریزی شاعری کا آہنگ اردو شاعری میں بھرپور طریقے سے سمونے والا اور اردو شاعری کا آسمان میں سب سے روشن گمرب سے غیر معروف شاعر نظیر اکبر آبادی کے صحیح مقام اور صحیح حیثیت سے اردو دنیا کو پہلی مرتبہ متعارف کرائے والا پروفیسر عبدالغفور شہباز ایک نہایت کوردہ گاؤں سرسہرا کا رہنے والا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری نصف سے لے کر عہد حاضر تک اکثر و بیشتر صاحب فن و کمال نے صوبہ بہار کی اردو شاعری کو نہیں لکھا اردو دنیا کو اردو شعری ادب سے روشناس کرایا

۱۔ ملاحظہ ہو بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء اردو شاعری تحقیقی مقالہ مصنفہ ڈاکٹر کلیم عاجز ص ۱۱۱ محزونہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری۔

ان میں شفقِ عماد پدی، احقر بہاری، صوفی منیری، صفیر بلگرامی، نسیم ہوسوی، فوقِ مفتی گنجوی، عرش
گیادی، وحشر بیتوی، ولی منڈی، عطا بہاری، کیفی بہاری دیہات و قصبات کے رہنے والے ہیں۔
جناب سید سلیمان ندوی مرحوم نے عظیم آباد کے ادبی پس منظر کے ضمن میں اپنا پوں خیال
ظاہر کیا ہے، موصوف نے لکھا ہے۔

”پٹنہ عظیم آباد ہندوستان کے ان قدیم شہروں میں ہے جو کئی ہزار سال سے
علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ ابتداً نے عہد کو چھوڑ کر صرف آخری صدیاں جن کے
ہر دور میں اس خاک سے ہزاروں ادبا بکمال اُٹھے ہیں جن کی شہرت کا فسانہ
اب تک تاریخ کہن نہیں بنا ہے۔“

صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوہ خضر میں غلط نہیں لکھا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے
بعد اردو کا تیسرا مرکز عظیم آباد ہے۔

بہرام جنگ، مظفر جنگ، سید ہدایت علی وغیرہ صوبہ دارانِ پٹنہ نے بھی اپنے بعد
اپنے علمی قدردانی کے کارنامے چھوڑے ہیں۔ مسلمان شعرا کے پہلو بہ پہلو راجہ شتاب
رام نے، راجہ پیارے لال، مفتی کا نام لینا چاہئے۔ جن کی سرپرستی، تحن نئی اور تحن فہمی
نے عظیم آباد کو لکھنؤ بنادیا۔

لیکن جناب ثاقب عظیم آبادی اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ موصوف یوں لکھتے ہیں:
”اے میں یہاں پر حضرت صفیر بلگرامی اور علامہ موصوف سے بہ ادب اختلاف کرنے
کی جرات چاہتا ہوں، تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ عظیم آباد میں لکھنؤ سے پہلے شعرو
شاعری کا چرچہ زیادہ تھا اور دہلوی شعرا کی آمد سے پہلے ہی پٹنہ میں بالکمال شعراء
موجود تھے مثلاً بارہویں صدی کے ربیع ثالث میں انیس، جو شخص دل جیسے

۱۔ مقدمہ کلام شاد مصنفہ علامہ سید سلیمان ندوی بحوالہ یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی ص ۲۵

۲۔ یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی ص ۲۶

استاد فن اپنی بساط سخن بچھائے ہوئے تھے۔ اس دور میں اور اس کے بعد
فخاں، میر ضیا، عشق، فردوسی، حسیں، بسمل وغیرہ آئے اور دہلی کے اس
اختلاط نے عظیم آباد کی شاعری کی رونق دوبارہ دی لیکن بخلاف اس کے لکھنؤ کا یہ
دور کسی باکمال رسوختہ گو سے آشنا نہیں۔

دبستان عظیم آباد کی ایک عظیم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دبستان ہمیشہ علاقائی عصبيت سے بالکل پاک
رہا۔ غیر مسلم شعرائے اردو زبان کی تردید و شاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر راجہ رام نرائن موزلا،
اُجاگر چندا لفت، کنور سکھراج بہادر رجمتی اور بابو امداد کشر رکشہ گیادی اور جگیسر پرشاد خلش کے
نام خصوصی طور پر لئے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو کے مشہور محقق و خواجہ عبدالرؤف عشرت کا تذکرہ
ہندو کے اردو شعراء اور فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے موازنہ سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوگی۔
خواجہ صاحب کا یہ تذکرہ لگ بھگ پانچ سو شعراء کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے اور بلخی صاحب مرحوم کے اس تذکرہ میں
لگ بھگ ایک سو پچیس شعراء کے حالات ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دبستان عظیم آباد عصبيت سے بالکل پاک ہے۔
محلہ حاجی گنج کو بیچے، خان بہادر علی محمد تاد جیسی شخصیت نے اس محلہ میں جنم لیا، محلہ
مغلیوہ میں لاڈلے صاحب بیتاب تھے جن کی شخصیت خدمت ادب میں وقف تھی۔ محلہ خواجہ کلاں
میں عبدالحمید پریشاں جیسی شخصیت موجود تھی۔ محلہ لودی کٹرہ جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ آج بھی راسخ
عظیم آبادی کی قبر عہد ماضی میں ادب و نوازی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ وہاں حمید عظیم آبادی اور پرنیز
شاہدی ناز کرنے کے قابل ہیں۔ محلہ گورہٹہ ایک نہایت چھوٹا سا محلہ ہے اس کو اس بات پر ناز ہے کہ
باقر عظیم آبادی اور ضیا عظیم آبادی جیسے اعلیٰ پایہ کے شاعر گذرے۔ عظیم آباد کے ان محلوں کا لوہا
ذکر ہو چکا ان میں بخشی محلہ کو بھی کم فوقیت حاصل نہیں جس نے ڈاکٹر غیاث الدین بلخی، فصیح الدین بلخی
مرحوم، عزیز الدین بلخی مرحوم، نظام الدین بلخی مرحوم جیسے ادب کے نگینوں کو پیدا کیا جہاں غالب دہلوی
کے عزیز شاگرد و خواجہ غفر الدین سخن اس طرح آئے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عظیم آباد کے ادبی ماحول میں
بخشی محلہ کو ایک خاص خصوصیت حاصل تھی کیوں کہ اس کا تعلق عظیم آباد کے دور دراز محلوں کے ادبی
مرکزوں سے بھی گہرا تھا اور کم و بیش روزانہ ادبی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جس میں ضیا عظیم آبادی یا عظیم آبادی

دیا سنیگان چکنری (خواجہ فخر الدین سخن، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، حکیم نسیم الدین احمد اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد جیسی شخصیتیں تشریف فرما ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی مرحوم مصنفہ تاریخ شعرائے بہار کے مکان کا وسیع کمرہ صرف ادبی مفیوں کو منعقد کرنے کے لئے وقف تھا، یہ ایک ایسا ادبی مرکز تھا جہر اعتبار سے ادبی معاملوں میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔

حفیظ الدین بلخی مرحوم نے اپنی ادارت میں ایک ادبی رسالہ "تحفہ بہار" نکالا تھا۔ اس کی ادارت میں جناب سید فرید الحق فرید عظیم آبادی بھی تھے (فرید عظیم آبادی خواجہ فخر الدین سخن کے ممدھی تھے) چنانچہ جناب حکیم الدین احمد نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات "اپنی تلاش میں" اس رسالہ (تحفہ بہار) کا ذکر کیا ہے، موصوف کے اپنے بڑے چچا مولوی حکیم نسیم الدین احمد مرحوم بھی حفیظ الدین بلخی مرحوم کے گہرے دوستوں میں تھے۔ حکیم صاحب مرحوم نے حفیظ الدین بلخی کی ابتدائی تین غزلیں اپنی تلاش میں، پیش کی ہیں۔

رسالہ تحفہ بہار میں ہر ماہ شعرا کی طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ گویا یہ رسالہ ایک گلدستہ کی شکل رکھتا ہے۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ بابت فردی سال ۱۸۹۷ء راقم کی نظر سے گذرا ہے جس میں یہ مصرعہ طرح ہے ط

جناب عزیز الدین بلخی مرحوم نے اپنی ادارت میں ایک رسالہ "رفقار زمانہ" جاری کیا تھا چنانچہ یہ رسالہ ادبی مرکزہ آرائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا، اس دور کے عظیم آبادی میں عظیم آبادی شعرا و گردپ میں منقسم تھے۔ ایک شاہد اسکول کا ہونا تھا اور دوسرا داغ اسکول کا پستار، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اور نظام الدین بلخی مرحوم داغ دہلوی کے براہ راست شاگردوں میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ حضرات بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بالخصوص حکیم نسیم الدین احمد اور خواجہ فخر الدین سخن جیسے لوگ بھی ان ادبی مرکزہ آرائیوں میں حصہ لیتے تھے چنانچہ رسالہ صسم کے بہار نمبر سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جب صفیر بلگرامی اور خواجہ فخر الدین سخن میں آن بن ہوئی تو سخن نے صفیر کی ایک مشہور غزل پر مصرع طرح لگا کر ان کی ہجو گوئی کی۔ صفیر بلگرامی کی زبان میں لکنت تھی۔ فیض الدین بلخی مرحوم خود فرماتے تھے کہ جس وقت صفیر مرحوم شاعروں میں شر پڑھتے تھے اکثر لکنت کے سبب وہ لیٹ جایا کرتے تھے اس کی

غزلے گفتہ ام برائے اصلاح ابلغ خدمت است۔ قصہ سخن دکر م خوردہ اگر
طیار شدن باشد ز حمت شرمندہ شود (دکر خوردہ) از نام ندوی ام درای داخل
کردہ شدند گردد۔

فقط دستخط سید فخر الدین سخن معنی عنہ

بعض مرتبہ یہ ادبی معرکہ آرائیاں ناخوشگوار تعلقات کے بنا پر ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر
خواجہ فخر الدین سخن کے انتقال کے بعد ان کا غیر مطبوعہ دیوان ان کے چھوٹے لڑکے خواجہ حفیظ الدین
کے گھر سے چوری ہو گیا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ملے والے دستوں میں سے ایک صاحب نے ایک
غزل عزیز الدین بلخی مرحوم کے کمرے میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں سنائی۔ فصیح الدین بلخی
مرحوم بھی موجود تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے کے اختتام کے بعد بہت سے شعرائے کرام
کے اشاران کو یاد ہو جایا کرتے تھے۔ جب وہ حضرت نے چرائی ہوئی غزل سنائی تو مشاعرے میں
فصیح الدین بلخی مرحوم نے اس غزل کے اور بھی اشعار سنا دیئے۔ اس پر وہ حضرت بہت خفا ہوئے اور
چلتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ کوشش کی کہ گزشتہ غیر مطبوعہ دیوان کسی نہ کسی طرح حاصل ہو جائے۔
جب اس میں ناکامی ہوئی تو فصیح الدین بلخی مرحوم نے ایک ایسی چوڑی نظم بطور دیوان کا لکھ کر لکھ ڈالی
جس کا درجہ ذیل شعر آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

دیوان گزشتہ پہ میں پڑھ لوں گا قانع

آپ اپنی شاعری کا جتنا زہاٹھائیے

صوبہ بہار میں اردو شاعری کی طرح اردو نثر نگاری کی ترویج و اشاعت بھی صوفیوں کے
ذیر اثر ہوئی۔ تحقیق کی روشنی میں حضرت عابد الدین قلندر بھلواروی کا ایک مذہبی مختصر رسالہ ہے
جو "صراط مستقیم" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۳۲ھ میں لکھا گیا اس کے بعد حضرت
ظہور الحق ظہور شاہ ۱۳۳۲ھ تا ۱۳۳۳ھ کے چاند شری ریسے پائے جاتے ہیں۔

۱) رسالہ نماز (۲) فضائل رمضان (۳) فیض عام (۴) کتب النبی

یہ سب رسالے ۱۳۳۲ھ تا ۱۳۳۳ھ میں لکھے گئے۔ حضرت مخدوم شاہ حسن علی متوفی ۱۳۳۲ھ

خلیفہ مرید مجاز حضرت منعم پاکباز عظیم آباد کے ایک خلیل القدر بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کے خطوط کا ایک مجموعہ کتب خانہ قادریہ اسلام پور میں محفوظ ہے۔ ایک خط زبان اردو ہندی میں ہے۔ حضرت تقی حسن بلخی متوفی ۱۲۵۵ھ حضرت حسین نوشہ توحید بلخی کی اولاد میں ہیں۔ آپ نے ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۲۸۲ھ میں کلکتہ سے چھپ چکی ہے۔ اس میں عقائد و ایمان اور دینی مسائل ہیں۔ حضرت محمد اسحاق عرف پیر دہریا ۱۲۳۳ھ کا دور سالہ احکام مشرع ۱۲۶۶ھ اور دوسرا جذبات معینہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، محمد حسن گیلانی ۱۲۶۲ھ اور مولوی شجاع الدین رضوی متوفی ۱۲۳۳ھ کے بعض رسائل میں جن کی نوعیت مذہبی ہے، شاہ عطا حسین شمیمی نے ۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ ہدایت المسافرین تالیف کی، علمائے صادق پور نے بھی اردو نشر کی تحقیق میں نمایاں حصہ لیا۔ مولوی دلایت علی اور عنایت علی نے مختلف رسائل ایمان اور عقائد سے متعلق لکھے ہیں۔ عبدالرحیم صادق پوری نے سوانح نگاری میں ایک تذکرہ الدر منشور لکھا۔

لکھنؤ اور دہلی میں داستان طرازی کا رواج عام تھا۔ چنانچہ بہار نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ عالم عظیم آبادی نے داستان خیال کا ترجمہ کیا۔ خواجہ فخر الدین سخن نے سروش کی ایک طبع ناد داستان یا قصہ ۱۲۸۱ھ میں لکھا۔ یہ فسانہ عجائب کے جواب میں لکھا ہے۔

صوبہ بہار میں جہاں تک ناول نگاری کا تعلق ہے، شاد عظیم آبادی نے اپنا ناول 'موزہ الخیال' المعروف 'ولایتی کی آپ بیتی' موصوف کی ذات سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر عنایت الدین بلخی نے اپنا ناول 'طرز معاشرت' لکھا۔ نقش طاؤس محمد اعظم علی کا ناول ہے جو ۱۸۸۱ء میں طبع ہوا۔ سید افضل الدین عظیم آبادی متوفی ۱۹۰۶ء کا ناول 'افسانہ تورشیدی' ۱۳۰۳ھ میں طبع ہوا، صغیر بلگرامی کا ناول 'جوہر مقالت' ۱۸۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کا دوسرا ناول 'گلبن موزوں کے نام سے مشہور ہوا۔ رشید النساء ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۹ء نے ایک اصلاحی ناول 'اصلاح النساء' لکھی جو ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوئی۔ علی سجاد عظیم آبادی کے دو ناول 'نئی نوبلی' اور 'محل خانہ' مشہور ہیں جن میں سے محل خانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مطبوعہ ہے اور دوسرا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ صغیر الدین احمد عرش گیادی نے 'ثمرہ نافرمانی' کے نام سے ایک ناول لکھا۔ اسلم عظیم آبادی نے بھی ایک ناول 'فسانہ شبیر' تالیف کیا۔ اختر اور نبوی کا ناول 'حشر' تعمیر

افسوس اعلیٰ عظیم آبادی کا ناول بے جر کے پودے، قابل ذکر ہیں، مختصر یہ کہ ناول نویسی کے اعتبار سے صوبہ بہار قابل قدر ہے۔

”تذکرہ نگاروں کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اردو شاعری کا جو پہلا تذکرہ لکھا گیا ہے وہ عظیم آباد میں تذکرہ شورش اور تذکرہ مسرت افزا اُس کی روشن دلیل ہے۔ تذکرہ نویسوں میں غلام حسین شورش کا تذکرہ ”تذکرہ شورش“ ابوالحسن کا تذکرہ ”مسرت افزا“ نواب علی ابراہیم خاں فلیل کا تذکرہ ”گلزار ابراہیم“ وجیہ الدین عسقلی کا تذکرہ ”تذکرہ عشقی“ عبدالغفور خاں نساج کا تذکرہ ”سخن شعراء“ صفیر بگرامی کا تذکرہ ”جلوۂ خضر“ نواب امداد امام اثر کا تذکرہ ”کاشفاً الحقائق“ عزیز الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ”تاریخ شعرائے بہار“ فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ”تذکرہ نسوان ہند“ اور ”تذکرہ ہندو شعرائے بہار“ اور مولوی احمد اللہ ندوی کا تذکرہ ”تذکرہ مسلم شعرائے بہار“ (جلد ۶) وغیرہ ایک اہم ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوانح نگاری کا جہاں تک تعلق ہے، حیات فریاد کا مصنف علی محمد شاد، حیات مومن کا مصنف عرش گیاروی، زندگانی بے نظیر کا مصنف پروفیسر عبدالغفور شہباز آپ کو ملے گا۔ محققین کا جہاں تک تعلق ہے قاضی عبدالودود، پروفیسر معین الدین درانی اور خود فصیح الدین بلخی کا نام لینا کافی ہے۔

نقادوں کا جہاں تک تعلق ہے کلیم الدین احمد کو کون نہیں جانتا۔ جن کے نام سے ہندوستان اور پاکستان کا چہرہ چہہ واقف ہے ماسوا اس کے ڈاکٹر اختر امینوی، ڈاکٹر فکیل الرحمن اور ڈاکٹر عبدالغنی کا نام بھی محتاج تعارف نہیں۔

انفرن سطور بالا میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالص ادبی ماحول تھا اور اس ادبی ماحول کے پروردہ ہو کر انہوں نے یہ مقام حاصل کیا جس نے ان کے نام کو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھا ہے۔

باب دوم

عصرِ الدین بلخی مرحوم

فصیح الدین بلخی مرحوم نے سب سے پہلے (۱۷۷۱ء) سال کی عمر میں ذمات پائی۔ یہ دور خصوصی طور پر عظیم آباد کا ایک زریں عہد کہا جاسکتا ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱۸۸۵ء کی ہے اور وہ سال ۱۹۶۲ء۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اُنیسویں صدی کے بالکل اواخر حصہ کے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور بیسویں صدی کے اواخر حصہ میں موصوف کی ادبی حیثیت اس طرح ہوئی جس طرح ایک طالبِ العلم کی حیثیت دارالعلوم میں ہوتی ہے اور ایک طالبِ العلم کے لئے علم دانی کا نہیں بلکہ علم سیکھنے کا ہوتا ہے۔

ان کے بچھے بھائی مولوی نظام الدین بلخی مرحوم کا قول ہے کہ جب ان کے والد محترم ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کا انتقال ہوا، ان کی عمر لگ بھگ مشکل سے پندرہ برس کی ہو گئی۔ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی بذاتِ خود ایک جید عالم تھے نیز علم نجوم میں کافی مہارت رکھتے تھے اور یہ فن بلخی صاحب مرحوم نے اپنے والد محترم سے سیکھا۔ اس ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کے استاد بلخی صاحب مرحوم کے والد تھے۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کم عمری میں اپنے والد محترم سے یہ فن سیکھا جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔ ظاہر ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ خالص علمی و ادبی ماحول تھا۔ ان پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے سطور ذیل میں ہم عصر فصیح الدین بلخی کا جائزہ لے رہے ہیں۔

بالیدہ شعور ہونے کے بعد فصیح الدین بلخی مرحوم کو کچھ نہیں تو کم از کم ساٹھ برس کا ایک ایسا دھ

نصیب ہوا جس کا عہد کا عظیم آباد علم و ادب کا خصوصی طور پر مخزن تھا۔ محلے محلے علم و ادب کے چرچے اور علوم و فنون کے مراکز تھے عصر فصیح الدین بلخی علم و ادب کا ایک ایسا عہد ہے جس کو خاص صنف ادب ہی کے لئے نہیں کہا جاسکتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جس کو جبکہ صرف شروشاہی کا نہیں بلکہ شری ادب کے فروغ کا دور کہا جائے گا۔ جن بزرگوں سے درجہ قربت فصیح الدین بلخی مرحوم کو حاصل ہوئی ان میں سقیر بلکاری بھی تھے اور خواجہ غفر الدین بن دہلوی بھی، سلطان عظیم آبادی بھی، فضل حق آزاد بھی اور جن بزرگوں کو انہیں دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ان میں داغ دہلوی بھی تھے، وحید آبادی بھی، ساکلی دہلوی بھی، شاہ عظیم آبادی بھی، ضیاء عظیم آبادی بھی اور شوق نیوی بھی، ان کے بچپن کی ادبی محفلیں جن میں شریک ہونے کا انہیں موقع ملا ان کا ذکر وہ اپنے گھر والوں سے بار بار کرتے تھے، اس ضمن میں سید بدر الدین بدیع عظیم آبادی مرحوم اپنے گراں قدر مقالے ”مولوی فصیح الدین بلخی“ میں یوں لکھتے ہیں۔

”صرف تاریخ سے ان کو دلچسپی نہیں تھی، ہر پرانی چیز سے ان کو لگاؤ تھا۔ اس زمانہ کے شادیات کے چلن، تہواروں اور میلوں کے تذکرے، پٹنہ کی گندی، مولیٰ محفلوں کی داستانیں، پٹنہ کے نامی اور معرکہ کے مشاعرے کے قصے یاد تھے شاعروں کی ہنسیکیں یاد تھیں اور حضرت شادادہ آجی کے جھگڑے یاد تھے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم کے بچپن کے زمانے میں بالخصوص ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، لودی کٹرہ کے مشاعرے، حاجی گنج کے مشاعرے، بخشی محلہ کے مشاعرے، گورہ پٹہ کے مشاعرے اور بادشاہ نواب رضوی کے دولنگدے کے مشاعرے، ماہ محرم میں مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں انہیں دبیر کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مولیٰ لگاؤ شریک ہوتے تھے۔ ظاہر ہے فصیح الدین بلخی مرحوم کے عصر اس آج کے عہد میں نمایاں فرق ہے، عظیم آباد کا وہ پٹنہ سیٹی جو علم و ادب کا مخزن تھا آج دیوانہ ہے۔ فصیح الدین بلخی کا عصر بھی اسی بیسویں صدی کا دور ہے جو حقیقتاً ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۶۵ء کو ختم ہوتا ہے جس نے انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ ۱۹۰۰ء یعنی بیسویں صدی کے بالکل آغاز سے جو دور شروع ہوتا ہے یہ دور نہ صرف عظیم آباد کے لئے ایک مخصوص نوعیت کا دور ہے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے، ٹھیک اسی طرح عہد اولیٰ سے لے کر ۱۸۰۱ء تک کا

دور ہے جو ادبی اعتبار سے صرف شاعری کے لئے سر بلندی کا دور کہا جائے گا۔ اس وقت تک شعری ادب کے مقابلہ میں شعری ادب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شریکاری سے اردو ادب ہلکا ہوتا ہے۔ شاید اس حقیقت کو دہرانے کی کوئی ضروت نہیں، اور ۱۸۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۱ء تک کا جائزہ لیجئے تو اس ایک مکمل صدی کے عہد میں ہمارے شعری ادب نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ادب کے معاملہ میں ایک صدی کا عرصہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ٹھیک اسی طرح دہلی کالج بھی اس کے فروغ اور ترقی کا علمبردار ہوا چنانچہ دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ کا رواج اپنی زبان میں کتب نوہی کے مذاق میں تبدیل ہو گیا اور تمام علوم و فنون، علم ریاضی، علم معاشیات، منطق، فقہ وغیرہ کی کتابیں اردو زبان میں بھی شائع ہونے لگیں۔

نتیجہ ہم یہ نکالتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے اردو کا شعری ادب بھی اچھا خاصا فروغ حاصل کر لیتا ہے، ہندوستان گیر طور پر اگر غور کیجئے تو میراجی دہلی، رجب علی بیگ سرور سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد تک صف اول کے شاعروں کی ایک فہرست ملتی ہے، جن میں سر سید، حالی، شبلی، منشی ذکار اللہ اور عبدالغفور شہباز وغیرہ نامور لنگاروں کے ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، اور مرزا محمد ہادی رسوا وغیرہ آتے ہیں۔

صوبہ بہار کا جہاں تک تعلق ہے یہ بھی اس معاملے میں بیرونی صوبے کے اہم مراکز سے کسی طرح پیچھے نظر نہیں آتا، اس عہد کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اردو شاعری ہر اعتبار سے علم و ادب کی محفل میں اپنا قدم جما چکی تھی اب اردو شری بھی کسی طرح سے پیچھے نظر نہیں آتی اور صوبہ بہار میں خصوصی طور پر عظیم آباد اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ تذکرہ نوہی کے ضمن میں عظیم آباد سے کئی اہم تذکرے منظر عام پر آئے۔ ان میں صفیر بکراچی کا تذکرہ "جلوہ خضر" عبدالغفور نساج کا تذکرہ "سخن شعرا" اور املا دلام اثر کا تذکرہ "کاشف الحقائق" اس طرح ادبی نوعیت کی سوانح خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگار غالب" لکھی۔ ٹھیک اسی نوعیت کی علی محمد شاد کے قلم سے ان کے استاد کی سوانح حیات فریاد منظر عام پر آئی۔

فیض الدین بٹنی مرحوم نے جب میدان علم و ادب میں اپنا قدم رکھا تو ان کی نگاہ یہ دیکھنے سے قاصر نہ رہی کہ علم و ادب کے فروغ میں تحقیق و جستجو کو ایک اہم مقام حاصل ہے اس لئے کہ زمانے کے

بے دروہاتوں سے کہنے اعلیٰ پایہ کے فنکار ہمیشہ کے لئے گمنام رہ جاتے ہیں جیسا کہ خود صوبہ بہار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نظیر اکبر آبادی واقعی ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود اور ان کی اعلیٰ شاعری کے باوجود وہ اپنا اصل مقام حاصل نہ کرتے جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر بہار کا ایک فرد عبدالغفور شہباز حیات "زندگانی بے نظیر" نہ لکھتا۔ شاید ایسی ہی باتوں نے فصیح الدین بلخی مرحوم کو متاثر کیا جس کو اپنانے کے نتیجے میں وہ اعلیٰ پایہ کے محقق ثابت ہوئے۔ فصیح الدین بلخی پر غور کیجئے تو ان کا دخل شاعری میں بھی تھا اور شریک کاری میں بھی۔ لیکن خدمتِ ادب کے معاملے میں انہوں نے اپنا زیادہ وقت شریک کاری کو دیا۔ موصوف نے تحقیق کے علاوہ تاریخ نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔

بلخی صاحب مرحوم جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کو بزرگانِ دین پر ناز ہی نہیں بلکہ اس خاندان کے بزرگانِ ماسرین علوم شروع ہی سے رہے ہیں۔ ان بزرگوں میں مولانا شمس الدین بلخی، مولانا معز الدین بلخی، مولانا مظفر بلخی، مولانا حسین نوشہ توحید بلخی اور مولانا احمد لنگر دریا بلخی جیسے صوفیائے کرام اور صاحبانِ قلم گذرے ہیں۔ جس عہد سے فصیح الدین بلخی مرحوم تعلق رکھتے تھے اس عہد کے صوبہ بہار اور عظیم آباد میں صرف اہلِ گنے ادنیٰ درجہ کے شعرا و ادبا موجود نہ تھے بلکہ ایسے بھی اہلِ قلم موجود تھے جو علم و ادب کے معاملے میں ہندوستان گیر حیثیت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی، فضل حق آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عظیم الدین عظیم آبادی، 'عرش گبادی' امداد امام اثر، انجم مانپوری، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اور حمید عظیم آبادی جیسے اہلِ قلم کا نام آج ہندوپاک میں محتاجِ تعارف نہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد کا صوبہ بہار اس اعتبار سے خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ہیرن بہار کے حضرات صوبہ بہار اور عظیم آباد کو آنکھ لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ دلی یا لکھنؤ کا فن کا اپنی خود پرستی (egorism) کا شکار تھا۔ صرف اس عہد کے ادبا یا شعرا جانتے تھے کہ عظیم آباد کے فرخِ دل ادب و انداز کو مدعو کریں وہ اپنا رنگ جملنے کے لئے صوبہ بہار میں اپنا قدم رکھیں۔ یہاں کے بھی فنکار کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں لیکن خدمتِ علم و ادب میں صوبہ بہار خصوصی طور پر عظیم آباد کی خصوصیت کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ اپنے برتاؤ کے باوجود خدمتِ علم و ادب کے معاملے میں صوبہ بہار نے تنگ نظری سے کام نہیں لیا اگر ایسا ہوتا تو عبدالغفور شہباز نظیر اکبر آبادی پر اپنی

جستجو و تحقیق سے گریز کرتے آگے بڑھتے تو آپ پائیں گے کہ دلی اسکول کا مایہ ناز شاعر مومن دہلوی جو
 ۱۸۵۳ء میں راجہ ملک عدم تو ہے جس نے اپنے شاگردوں کی ایک لمبی چٹری قطار چھوڑی۔ کسی کو
 بھی تو فائق نہیں ہوئی کہ حق شاگردی کو مد نظر رکھتے ہوئے مومن کی سوانح حیات قلمبند کرے۔ چنانچہ اس اہم
 ترین کام کے سلسلے میں اگر کسی کی نظر پڑے تو کسی بہاری کی، چنانچہ عرش گیاوی نے بڑی کاوش اور
 محنت سے "حیات مومن" لکھ چھوڑی۔

خیالِ عظیم آبادی ۱۸۸۸ء سے ۱۹۳۲ء، سید کاظم حسین زار ۱۸۹۶ء سے ۱۹۶۳ء تک،
 سریر کا بری ۱۳۰۶ء سے ۱۹۶۳ء تک، سید سلیمان ندوی ۱۸۸۴ء سے ۱۹۵۳ء تک، شاد
 عظیم آبادی ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۶ء تک، الامداد امام آخر ۱۸۴۱ء سے ۱۹۳۲ء تک، احقر بہاری
 ۱۲۶۲ء سے ۱۳۲۸ء تک، فضل حق آزاد ۱۹۲۲ء میں وفات، انجم مانپوری ۱۳۰۱ء سے ۱۳۷۸ء تک،
 باقر عظیم آبادی ۱۹۲۶ء میں وفات، سہیل عظیم آبادی ۱۹۰۹ء یکم نومبر سے ۱۹۷۹ء تک، سید نظام الدین بٹنی
 ۱۲۸۲ء سے ۱۹۶۶ء تک، لاڈلے صاحب بیٹاب عظیم آبادی ۱۹۲۸ء میں وفات، ثمر آردی ۱۹۳۹ء میں
 وفات، حمید عظیم آبادی ۱۸۹۶ء سے ۱۹۶۳ء تک، جمیل مظہری ۱۹۰۵ء سے ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء تک،
 محمود علی خاں صبا عظیم آبادی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۸۷ء ضیا عظیم آبادی ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۹ء،
 عطا کا کوئی ۱۳۲۲ء بقید حیات، ڈاکٹر عظیم الدین احمد ۱۸۸۰ء سے ۱۹۴۹ء تک، سید صدر الدین
 فضا ۱۹۱۷ء سے ۳ مارچ ۱۹۷۷ء، کبیر دانا پوری ۱۳۱۱ء سے ۱۹۸۵ء، نواب محمد نقی جان
 قمر گزادی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۶۶ء تک، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی ۱۸۶۹ء سے ۱۹۵۶ء تک، پروفیسر
 مسلم عظیم آبادی ۱۳۰۵ء سے ۵ فروری ۱۹۷۷ء تک، مناظر گیلانی ۱۳۰۱ء سے ۱۳۷۵ء تک، ولی
 سٹودی ۱۲۹۶ء سے ۱۳۵۰ء تک، ولی کا کوئی ۱۹۶۳ء میں وفات، یاس بہاری ۱۲۸۰ء سے
 ۱۹۶۰ء میں وفات، یاس پگمانہ چنگیزی ۱۸۸۳ء سے ۱۹۵۶ء تک۔

ان جتنے عظیم آباد کے فوجی کالوں کا تعلق ہے ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن سے فیض الدین بٹنی
 مرحوم کے گہرے تعلقات تھے، ناز عظیم آبادی مرحوم، سریر کا بری، شمس مینوی، انجم مانپوری، سہیل عظیم آبادی
 بسمل سنہاروی، عبدالمنان بیدل، ثمر آردی، جمیل مظہری، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، قمر گزادی، پروفیسر

مسلم عظیم آبادی، یاس بہاری اور یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ۔

فصیح الدین بلخی مرحوم اپنے گھروالوں سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور ان کے اشارہ سنایا کرتے تھے، یاس یگانہ چنگیزی نے عظیم آباد سے ترک وطن کر کے لکھنؤ کی راہ لی اور وہیں ان کی وفات ہوئی لیکن جب تک پٹنہ میں ان کا قیام رہا وہ برابر بخشی محلہ تشریف لاتے تھے، پروفیسر مسلم عظیم آبادی مرحوم نے ترک وطن کر کے پاکستان کی راہ لی لیکن جب تک وہ اپنے وطن میں رہے ہزاری بلخ سے پٹنہ آتے تھے تو بلخی صاحب مرحوم سے ضرور ملتے تھے، مگر گیارہویں مرحوم سے اس قدر تعلقات تھے کہ وہ خاص کر مہرام سے ملنے کی غرض سے ان کے یہاں تشریف لاتے تھے۔

ڈاکٹر اختر اور مولوی مرحوم اور صدر الدین فصحا مرحوم سے قربت ہونے کی خاص وجہ یہ ہو گئی تھی کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں بلخی صاحب مرحوم پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کے انچارج رہے اور لگ بھگ روزانہ ان حضرات سے ملاقات ہوجاتی، ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم سے ان کے تعلقات کا حال یہ تھا کہ ایک جان دو قالب، ضیاء عظیم آبادی مرحوم ان کے سچے بھائی مولوی عزیز الدین بلخی کے گھر۔ دوستوں میں تھے اور ضیاء مرحوم روزانہ بخشی محلہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم ضیاء کی شاعری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ضیاء کی شخصیت اور فن پر ایک گرائڈر مقالہ سپرد قلم کیا جو رسالہ تہذیب پٹنہ سے شائع ہوا۔ محمود علی خاں صاحب بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت سے فیضیاب ہونے کے لئے برابر ان کے گھر پر ملا کرتے تھے۔ قربت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد شعبہ مخطوطات کو ان کے حوالہ کیا گیا۔ علامہ جمیل منہری سے ان کے تعلقات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جمیل صاحب ان کے بھتیجے رفیع الدین بلخی کے گھرے دوستوں میں تھے اور ان کی عالمانہ شخصیت کے معترف وہ آج بھی ہیں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ایک درد انگیز قطعہ تاریخ لکھا۔

نثر آردی گورنمنٹ اسکول میں بڑے مولوی تھے اور بلخی صاحب مرحوم کی کسرال سے منقل محلات کا میدان میں ان کا قیام تھا چنانچہ اکثر غزل سننے کے لئے اور موضوعات شاعری پر تبادلہ خیال پران سے ملے تھے۔ بسمل سنہاروی مرحوم اور نواب نفی جان گیارہویں سے ان کی دوستی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات سے متاثر ہو کر ان حضرات نے نہایت درد انگیز قطعہ تاریخ قلمبند کئے۔

بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت صرف صوبہ بہار ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان کا ہر
اہل قلم ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے ان کی مشہور کتاب تاریخ مگدھ کو انجمن
ترقی اردو دلی سے شائع کرانے کی خواہش ظاہر کی اور تیج بہادر سپرو کا خط دلی سے آیا۔ چنانچہ بلخی صاحب
مرحوم کی کتاب انجمن ترقی اردو دلی سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی اور اس کی نشاندہی سہیل عظیم آبادی
کے مضمون "بلخی صاحب" سے ہوتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی رقم طراز ہیں:

"شاید ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی اردو دلی نے ان کی کتاب تاریخ مگدھ شائع
کی۔ ان دنوں میں انجمن ترقی اردو دلی سے منسلک تھا۔ بابا نے اردو کی خدمت میں
اکثر باریابی کا موقع ملتا تھا۔ بابا نے اردو نے اس کتاب کی تعریف کی۔"

بلخی صاحب مرحوم ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے شاید اس لئے کہ تحقیق و جستجو
تواریخ نگاری سے انہیں بھی ذاتی لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے بلخی صاحب مرحوم صوبہ
بہار کے مشہور مدرس پرذ فیسر عسکری سے حد درجہ قریب تھے۔

میں نے سطور بالا میں اس امر کی طرف نشاندہی کی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت صرف
صوبہ بہار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ملک کے دوسرے اہل قلم ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ رام بابو
سکسینہ بلخی صاحب کی مشہور و معروف تصنیف "تذکرہ نسوان ہند" سے متعلق اپنے گرائڈر رائے
کا اظہار خطوط میں یوں کرتے ہیں: یہ خط انگریزی زبان میں ہے۔

Ram Babu Sakseena
Dhill Hen Canse
Member Sahitya Academy

c/o K. Kishore I.A.S
joint Secretary U.P Govt.

Finance Department

Council House

Lucknow

21-11-1956

My dear Balkhi Sahab

Mr. Naim private secretary to Dr. Syed Mohammad has very kindly mentioned your name to me and has written to you.

It was a great pleasure to know that you have written a Tazkera of women after a considerable research and that you are devoting your life to a pursuit of literature - a noble end.

I shall be obliged if you will kindly let me have all information you possess or can collect of Urdu and Persian poets of Bihar who also wrote in Hindi.

I shall also need all information about the Medieval Urdu Literature in Bihar.

I enclose a paper which you may kindly see and return. I shall also send you a paper from Lucknow.

Needless to say that I will do all
what I can in furtherance of your
scholarship.

Looking forward to the pleasure
of receiving reply.

With all good wishes and thanks

yours sincerely

Ram Babu Saksena

ملک کے مشہور و معروف محقق مالک رام سے بھی بلخی صاحب مرحوم کی خط و کتابت
ہوتی تھی، مالک رام بلخی صاحب کو یوں لکھتے ہیں۔

12/5 WEA

Kearal Bagh

نئی دہلی ۱۸-۹-۱۹۵۸ء

کرم نامہ ملا۔ عنذی قبلہ قاضی عبدالودود صاحب نے اطلاع دی ہے
کہ سید فخر الدین حسین سخن کی تصویر آپ نے انہیں دی تھی لیکن وہ یہ بھول گئے، میں کہ
یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی تھی، انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ سے رجوع کر کے
دریافت کریں۔ اس لئے کرم فرما کر اس تصویر کے ماخذ کا پتہ دیں، اس کا نام اور
سخن سے کیا رشتہ تھا۔

والسلام

خاکسار مالک رام

بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے چنانچہ موصوف کا
ایک مقالہ رسالہ لنگار لکھنؤ میں بھی شائع ہوا، اس ضمن میں ان کی اکثر خط و کتابت علامہ نیاز فتح پوری
سے بھی ہوئی تھی۔ نیاز فتح پوری اپنے ایک مراسلہ میں بلخی صاحب کو یوں لکھتے ہیں:

دفتر نگار لکھنؤ

اپریل ۱۹۵۲ء

محترمی تسلیم

مقالہ مل گیا، شکریہ۔

والسلام

نیاز

حکومت پنجاب کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی ہے اس میں علامہ یحییٰ بہاری اور نقاب ابراہیم علی خاں کے حالات یونیورسٹی نے موصوف ہی سے لکھوائے، اس کا تفصیلی جائزہ آئندہ کے اجاب میں لیا جائے گا۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ بلخی صاحب مرحوم کا عہد عظیم آباد کا ایک ایسا عہد تھا جب کہ علم و ادب کا آج کے اس اجڑے دیار میں طوطی بولتا تھا، شاعری کا چرچہ اور ذوق زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بلخی صاحب نے جب اپنا قدم رکھا تو ایک شاعر کی حیثیت سے، لیکن انہوں نے اپنی ذات کو صرف اس دائرے تک محدود نہیں رکھا اس لئے کہ فطرت نے ان کو وسیع النظری بخشی تھی اور حالات نے ایسے مواقع فراہم کئے کہ ہندوستان کے چپے چپے گھومنے کے مواقع نصیب ہوئے بلکہ بیرونی ممالک کے سفر بھی نصیب ہوئے اور ساتھ ساتھ ایسا ماحول بھی ملتا گیا جو ان کی قلم کاری کو وسعت دیتا گیا یعنی بلخی صاحب صرف ایک شاعر ہی ہو کر نہ رہ گئے، بلخی صاحب مرحوم نے شاعری تو ترک کر دی تھی جو کلام کا ذخیرہ بیاض کی شکل میں تھا چوری ہو گیا اور جو محفوظ رہ سکا وہ یادداشت کا نتیجہ ہے۔ بلخی صاحب کی شخصیت نے نمایاں شہرت جو حاصل کی ہے وہ دو وجہوں سے۔ ان کی ایک حیثیت محقق کی ہے اور دوسری حیثیت مورخ کی ہے۔ شاعری سے نثر نگاری کی طرف راغب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملازمت کے سلسلہ میں انہیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا ماحول بھی نصیب ہوا، کلکتہ میں کئی بار انہیں بھی لمبی مدت تک رہنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ماسوا اس کے فورٹ ولیم کالج کے ماحول نے جو اردو نثر نگاری کا دور اولیں کہا جاسکتا ہے، انہیں نثر نگاری کی طرف راغب کیا اور

آگے چل کر کچھ ایسی شخصیتوں سے انہیں متاثر ہونے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت ایک مورخ کی حیثیت سے پردان چڑھی۔ ہندوستان کے مشہور مورخ "سجاد دانا" سے بھی انہیں ملنے کا موقع ملا۔ دور رہنے پر خط و کتابت کی صورتیں گاہے گاہے رہیں۔ ماسوا دوسرے بقیہ حیات مورخ ڈاکٹر کے دتا، تاریخ کے پروفیسر پرنسپل پٹنہ کالج، سابق دانش چانسلر پٹنہ یونیورسٹی اور گدھ یونیورسٹی سے حد درجہ قربت رہی جس کی نوعیت خالص دوستانہ تھی اس کا اندازہ ڈاکٹر کے دتا کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو انہوں نے بلخی صاحب کی وفات کے بعد انگریزی زبان میں قلمبند کئے اور پروفیسر عسکری جن کی ذات تاریخ دانی کے لئے شروع ہی سے واقف تھی، وہ تو ہر حال میں ان کے گہرے دوستوں میں تھے، یہی وجہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت کو بحیثیت مورخ نگہ کرنے اور پردان چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، ان کی عالمانہ بصیرت، تاریخ دانی، باریک بینی نگاہ کو صحبتوں سے مزید فائدہ پہنچا۔

تحقیق نگاری اور تنقید نگاری کی طرف جو بلخی صاحب مرحوم رجوع ہوئے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عظیم آباد ادبی معرکہ آرائیوں میں ہمیشہ کسی بھی دبستان سے یکجہ نہیں رہا۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی آنکھوں سے شاد اور اپنیج کے جھگڑے دیکھے، شعرا کی ایسی چٹکیں دیکھیں۔

مؤلف مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں شاد اور ان کے مخالفین نیز شاد اور اپنیج کے جھگڑے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :

"اخبار اپنیج کے صفحات اس علمی و ادبی جنگ کے مصاف (میدان جنگ) بنے ہوئے تھے۔ حالت یہ تھی کہ علامہ نے کسی شاعرے میں جو پٹنہ میں برابر ہوتے رہتے تھے کوئی اپنی غزل سنائی، اس ہفتہ کے اپنیج کی اشاعت میں وہ غزل تنقید کے ساتھ چھپ جاتی، شاد کا یہ شعر ہے۔

زمانہ بھر کی ہے ان کھڑکیوں سے آمد و رفت
ادب سے دور ہے آنکھوں میں ان کو جا دینا

اپنیج نے دوسرے میں یہ اصلاح دی ہے
حیا پہ ظلم ہے آنکھوں میں ان کو جا دینا

شاد کا شعر ہے

اسی بہانہ سے دل یار کو دکھا دینا
یہ کیسی چیز پڑی ہے ذری اٹھا دینا

اصلاح اپنیج ہے

یہ کون چیز پڑی ہے ذری اٹھا دینا

خواجہ فخر الدین سخن اور علامہ سید علی محمد شاد کی شاگردی صغیر سے انکار تھا۔ لڑائے سید تھیں
حسین المعروف بہ سلطان عظیم آبادی نے تلامذہ صغیر کا ایک تذکرہ یہاں تک کہ جس عہد سے بلخی
صاحب مرحوم تعلق رکھتے ہیں اس عہد میں شاد اسکول کے پرستاروں اور داغ اسکول کے ہمناموں
میں سخت ادبی معرکے ہوتے رہتے تھے اور شاعری کے معاملہ میں ہر گروہ ایک دوسرے کو اپنی گرفت
میں لینے کی کوشش میں ہوتا اگر کسی سے لغزش ہو گئی تو اعتراض کی بوچھاریں شروع ہو جایا کرتی تھیں۔
خشی محلہ کے ادبی معرکے میں بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت اپنی ذہانت اور علمیت کے سبب نمایاں تھی۔
ایک بار کا ذکر ہے کہ محلہ لودی کٹرہ میں منعقد ہونے والے مشاعرہ میں مرثعہ حمید عظیم آبادی
مرحوم نے ٹی کٹر مبارک عظیم آبادی کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے

ہ گزاری ہی عمریں انہیں ہمدیوں میں

یہ گہرے مراسم میں رنج و محن سے

حمید صاحب مرحوم کا یہ اعتراض تھا کہ اس شعر میں انہیں کی "ہ" تقطیع کرنے میں گرتی ہے،
مبارک صاحب دوڑے ہوئے ان کے (بلخی صاحب) کے پاس آئے اور ماجرا سنایا۔

لہذا فیض شائع کیا تو صغیر کے شاگردوں کے سلسلے میں مختلف شواہد کی روشنی میں سخن اور شاد کا
بھی ذکر کیا۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کو صغیر بلگرامی کی شاگردی سے اعتراف تھا، سلطان عظیم آبادی

نے اپنی تالیف مرقع فیض میں علامہ شاد کے ان چند خطوط کی نقلیں بھی چھاپ دی ہیں جو صفیر کے مسکن آرمہ شاہ آباد کے پتہ پر مختلف وقتوں میں لکھا تھا۔

قطع اول کا اقتباس لے۔ بلبل شاخار حدیقہ یاد و بیانی جناب استاذی

میر فرزند احمد صاحب مدظلہ العالی الی احقر کترین علی محمد عفی عنہ۔

جناب وصی احمد بگڑی نے رسالہ ندیم بہار نمبر ۹۳۵ء میں ایک اہم وقیع مضمون

س۔ ش۔ ص لکھا اور یہ مضمون آج بھی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مضمون

میں جناب وصی احمد نے مختلف شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے۔ خواجہ فخر الدین سخن اور شاد

عظیم آبادی بہر صورت صفیر کے شاگرد تھے۔

بلخی صاحب مرحوم نے قلم برداشتہ ایک تحریر لکھی جس میں حمید صاحب کے عرضی اعتراض

کو مہمل قرار دیا اور اس ضمن میں اساتذہ کے کئی اشعار پیش کئے۔ یہ سارا ملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن

بلخی صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ اس کے نتیجہ میں ان کا کتابچہ "انشاد شاد" وجود پذیر ہوا۔ اس کے

جواب میں حمید صاحب مرحوم نے ایک عرصہ کے بعد "کھلا چیلنج" لکھا جو حقیقتاً "انشاد شاد" کا

جواب نہیں بلکہ اس میں ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کو نقاب پوش اور بلخی صاحب مرحوم کو "گولڑہ کاکیرا"

کہا گیا۔ جو اعتراضات بلخی صاحب مرحوم کے تھے ان کے جوابات کو الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم

کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ معاشرہ چشمک ایک عرصہ دراز تک قائم رہی یعنی جب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

مرحوم کا مجموعہ کلام "جلوہ داغ" ڈاکٹر سید محمود کے توسط سے شائع ہوا تو اس کا مقدمہ بھی بلخی صاحب

مرحوم نے سپرد قلم کیا۔ یہ دہلی ہوئی چنگاری ایک بار پھر آگ کی شکل میں نمودار ہوئی اور عطا کا کوئی

نے "جلوہ داغ" پر اعتراضات کئے اور سخت نکتہ چینی بھی کی۔ دراصل اس فتنہ کے بانی حمید صاحب

مرحوم تھے۔ مبارک صاحب مرحوم عطا کا کوئی کے اعتراضات پر گھبرائے اور دوڑے ہوئے بلخی صاحب

مرحوم کے پاس آئے، بلخی صاحب مرحوم نے فوراً قلم برداشتہ عطا کا کوئی کے جواب میں ایک مقالہ

لے تذکرہ مسلم شہر بہار جلد دوم مصنفہ حکیم سید احمد ندوی

لکھا۔ اس ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کا یہ خیال تھا کہ یہ مقالہ کسی کہنہ مشق شاعر کے نام سے شائع ہو۔
 اس زمانہ میں یاس بہاری مرحوم بہار شریف سے پٹنہ بلخی صاحب مرحوم سے ملنے آئے تھے، چنانچہ
 ”ہم سخن فہم ہیں“ کے عنوان سے ایک مقالہ رسالہ ”اشارہ“ پٹنہ میں شائع ہوا جس میں عطا کا کوئی کے
 اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ یہ مقالہ بلخی صاحب مرحوم کا خود نوشتہ تھا اور مدیر اشارہ جناب قیوم خضر
 کے حوالے اشاعت کے لئے دیا گیا۔ قیوم خضر صاحب اس کے شاہد ہیں کہ یہ مقالہ بلخی صاحب مرحوم
 کا نوشتہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مخطوطہ قیوم خضر صاحب کے پاس محفوظ ہو۔

بلخی صاحب مرحوم اپنی بزم کے روح رواں تھے۔ خصوصی طور پر بخشی محلہ کی ادبی سرگرمیوں
 میں وہ خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ فخر الدین سخن دہلوی کا ایک دیوان ان کے
 گھر سے چوری ہو گیا۔ خواجہ فخر الدین سخن کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ حفیظ الدین کے گھر سے دوستوں میں
 منشی باقر کے حقیقی بھانجے سید حسن سید عظیم آبادی تھے۔ انہوں نے اس دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھایا
 چنانچہ سخن دہلوی کا کلام سید صاحب نے مشاعرے میں پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار بخشی محلہ کی
 محفل مشاعرہ میں سید صاحب نے خواجہ صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار اپنے نام سے پڑھے۔
 بلخی صاحب مرحوم کی ذہانت مشہور تھی۔ انہوں نے اس غزل کے دیگر اشعار برسر مشاعرہ سنائے اس پر
 سید صاحب بہت ہی برہم ہوئے اور اٹھ کر محفل سے چلے گئے لیکن سید صاحب اپنی اس حرکت
 سے باز نہ آئے۔ چنانچہ بلخی صاحب نے اُس دیوان کا ایک مرثیہ گلدستہ کی شکل میں شائع کر کر تقسیم کیا۔
 مرثیہ کا ایک شعر آج بھی پٹنہ کے لوگوں کو یاد ہے۔

دیوان گمشدہ ہے پڑھ لوں گا فاتحہ

آپ اپنی شاعری کا جنازہ اٹھائیے

بلخی صاحب مرحوم نے تحقیق نگاری کی طرف جو رجوع کیا اس کی بھی ایک خاص وجہ معلوم ہوتی
 ہے کہ وہ ادب میں تحقیق و جستجو کو نہایت ہی مقدم تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے شاید وہ خواب امداد
 امام اثر مرحوم اور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے حد درجہ متاثر تھے۔ اثر مرحوم کی کتاب ”کاشف الحائق“ کے
 بڑے مداح تھے۔ اثر مرحوم کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے اپنی وفات

سے چند ماہ پیشتر ایک تقریر بھی اثر کی سوانح حیات اور کارناموں سے متعلق نشر کی۔ ڈاکٹر عبدالحق کو ایک ایماندار مصلح اور ذی علم محقق گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ تاریخ مگدھ کو انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے کا سوال اٹھا تو کتاب کے مسودے کو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے حوالہ انہوں نے کر دیا۔

انشاد شاد اور کھلا جیلنج

مذکورہ بالا طور پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم عظیم آباد کے ہر ادبی معرکہ آرا لڑکوں سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بلخی صاحب مرحوم داغ اسکول کے پرستار بھی تھے اور خود ان کے سنبھلے بھائی مولوی نظام الدین بلخی مرحوم داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ بقول نظام الدین بلخی مرحوم سے

جناب داغ کا یہ فیض کم نہیں بلخی
سخن زباں کے لئے ہر زبان سخن کے لئے

چنانچہ اس دور کے عظیم آباد میں شاد اسکول اور داغ اسکول کے پرستاروں میں ہمیشہ معاصرانہ چشمک رہی۔ کوئی بھی گروپ اس تاک میں لگا رہتا تھا کہ اس کے مخالف گروپ سے کوئی لغزش ہو تو وہ اپنی گرفت میں لے لے، اس کی ایک اہم وجہ تھی کہ داغ کی شاعری کے اثبات کو عظیم آباد سے کافی حد تک قبول کیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، بہر حال ان مذکورہ لوگوں کی سرکہ آسانی ایک عرصہ دراز تک قائم رہی۔ حمید عظیم آبادی نے ابتدا میں اپنے کلام پر مبارک صاحب سے اصلاح لی لیکن بعد میں وہ شاد کے شاگرد ہوئے چنانچہ وہ بہت جلد مبارک صاحب کے مخالفوں میں ہو گئے۔ انہوں نے برسر مشاعرہ مبارک صاحب کے اس شعر پر اعتراض کیا، شعر یہ تھا

گزاری ہیں عمریں انہیں ہمدموں میں

یہ گہرے مراسم ہیں رنج و محن سے

حمید صاحب کا اس شعر کے مصرع اول میں یہ اعتراض تھا کہ شرکی تقطیع کرنے سے لفظ "انہیں"

کی "ہ" گرتی ہے لیکن بلخی صاحب نے حمید صاحب کے اس اعتراض کو مہمل قرار دیا چنانچہ یہ معاملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن ادبی تنازع ایک عرصہ دراز تک قائم رہا۔ آخر کار بلخی صاحب مرحوم نے شاد کے نقائص کلام کو ایک کتابچہ کی شکل میں "انشاد شاد" کے عنوان سے سپرد قلم کیا حمید صاحب نے بھی "انشاد شاد" کے جواب میں ایک رسالہ کھلا چیلنج "کے عنوان سے لکھا۔



باب سوم

سوانح حیات، خاندان، نسب نامہ پیری و
 مادری، پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی
 اولاد، ملازمت، عام مشاغل، احباب،
 اسفار، اوصاف، کمالات، وفات۔

خاندان

فصیح الدین بلخی مرحوم کی سوانح حیات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ خاندان بلخی کا مختصر طور پر جائزہ لیا جائے۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی فرد بھی اپنے خاندانی روایات کو برقرار رکھے لیکن خاندان بلخی کے افراد کو اس ضمن میں یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے خاندانی روایات کو برقرار رکھا، یعنی اس خاندان کے افراد لگ بھگ سات سو برسوں سے صوبہ بہار میں علم و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ لفظ بلخی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی شاہ بلخ کی نسبت سے بلخی کہلاتے ہیں جن کا شمار صوبہ کے اعلیٰ طبقے میں ہوتا ہے۔ صوبہ بہار ملک ہندوستان میں اس خاندان کے پہلے شخص حضرت مولانا شمس الدین بلخی محمد تعلق کے عہد میں دہلی میں وارد ہوئے جو شاہی دربار میں ایک اعلیٰ منصب رکھتے تھے جو بعد اعلیٰ منصب سے الگ ہو کر بہار شریف چلے آئے اور حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے مرید ہوئے۔

بلخی خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کا شمار ایک اعلیٰ پایہ کے صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جن کا ذکر متعدد تذکروں اور تارخوں میں آیا ہے لہذا حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کا مختصر تعارف سطور ذیل میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی غیر مطبوعہ کتاب آثار بلخیہ کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔

صوبہ بہار میں مناقب الاصفیاء مولفہ حضرت مخدوم شعیب کے بعد جن فارسی اور اردو کے تذکروں میں بلخیوں کا ذکر موجود ہے ان کے نام یہ ہیں :

- (۱) وسیلہ شرف مولفہ سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تلمیذ غالب (اردو)
- (۲) آثار شرف مولفہ خان بہادر قاضی نور الحسن شیرگھائی (فارسی)
- (۳) سیرۃ الشرف مولفہ خان بہادر سید ضمیر الدین احمد عظیم آبادی (اردو)
- (۴) کنز الانساب مولفہ مولوی کریم الدین احمد (فارسی)
- (۵) تاریخ سلسلہ فردوسیہ مولفہ پروفیسر معین الدین دروایی (اردو)

حضرت ابراہیم ادم بلخی

آپ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ صوفیوں کے طبقات اولیٰ میں گزرے ہیں آپ کا ذکر تاریخوں اور تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ نفحات الانس مصنف ملا عبدالرحمن جامی اپنی تصنیف میں حضرت ابراہیم بن ادم بلخی کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

”حضرت ابراہیم بن ادم قدس سرہ طبقہ اولین سے ہیں۔ ان کی کنیت ابواسحاق ہے اور ان کا نسب ابراہیم بن ادم بن سلیمان بن المنصور بلخی ہے یہ بادشاہ نادہ تھے اور جوانی ہی میں توبہ کی۔ ایک وقت شکار کرنے کو باہر گئے ہوئے تھے فرشتہ غیب نے اولذوی ابراہیم تو اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے ان کو تنبیہ ہو گئی اور راہ طریقت کو بخوبی اختیار کر لیا۔“

نوٹ: خاندان بلخی کے حالات کے ضمن میں مندرجہ ذیل تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے:

- (۱) ”آغاز سحر“ مجموعہ کلام جناب نادم بلخی
- (۲) وسیلہ شرف و ذریعہ دولت مصنف صوفی منیری تلمیذ غالب دہلوی
- (۳) تاریخ سلسلہ دوسیعہ مصنف میر فیض معین الدین دروایی
- (۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنف مولوی سید احمد اللہ ندوی جلد اول تا ششم
- (۵) آثار بلخیہ مصنف فیض الدین بلخی مرحوم مخطوطہ۔
- (۶) مخدوم احمد لنگر دریا بلخی حیات اور ان کی شاعری تحقیقی مقالہ مصنف ڈاکٹر حسن امام مخدومہ چٹنہ پور نیوٹرٹی لائبریری
- (۷) رسالہ تحفہ بہار بابت فردری ۱۸۹۷ء مدیر حفیظ الدین بلخی
- (۸) اپنی تلاش میں مصنف کلیم الدین احمد
- (۹) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء مصنف ڈاکٹر اختر اورینٹی۔

توکل اور ایثار کی کیفیت

حضرت ابراہیمؑ بلخی کے ہم عصر صوفیوں میں حضرت شفیق بلخی مشہور و معروف اہل معرفت میں سے گذرے ہیں، دونوں بزرگ خراسان میں تھے۔ ایک دن حضرت ابراہیمؑ ابراہیم بلخی نے دریافت کیا کہ رزق کے متعلق تمہارا کیا معمول ہے، انہوں نے جواب دیا اگر کچھ میسر آتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور نہ ملتا ہے تو صبر کرتا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ خراسان کا ہر ایک کتا ہی کرتا ہے۔ حضرت شفیق بلخی نے پوچھا کہ پھر تمہارا کیا معمول ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو خدا کا شکر کرتا ہوں اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو دوسروں پر ایثار کرتا ہوں (نفحات الانس) میں حضرت شفیق بلخی کے تذکرہ میں پایا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ بلخی سے متعلق مختلف روایتیں ہیں انگریزی کتاب *Mystics and saints of Islam* میں آپ کا تذکرہ ہے۔ غالب دہلوی نے بھی اپنی فدی نظم میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

ہر کجا رشتہ شوق تو جرات بارد
جز فراش بہ جگر گوشہ ابراہیم نرسد
فیض تو ہر جا گل و برگ افشانند
جز نسیم بہ پرشش گہ مرہم نرسد
اس کے علاوہ بہترے افسانوں اور مشنوں میں آپ کا ذکر پایا جاتا ہے۔

بلخیوں کا ہندوستان اور صوبہ بہار میں آنا

یہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیمؑ کی اولاد ہندوستان میں کب آئی۔ بلخ کے ذی علم اور ذی اثر لوگ ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان وارد ہوئے۔ مذکوروں میں پایا جاتا ہے کہ سلطان

فیروز تعلق کے عہد میں مولانا شمس الدین بلخی پدر مولانا مظفر بلخی دیوان شاہی میں کوئی عہدہ رکھتے تھے۔

مولانا شمس الدین بلخی بن علی بلخی

حضرت ابراہیم ادم بلخی کے بعد مولانا شمس الدین بلخی تک کئی نسلیں گزری ہیں لیکن ان حضرات کے سوا کوئی حال کسی تذکرہ میں نہیں پایا جاتا، حضرت مخدوم شعیب جو حضرت مخدوم شرف الدین احمد نیری کے خالہ زاد بھائی اور حضرت مخدوم حسین بلخی کے مرید تھے اپنی کتاب مناقب الاصفیاء میں لکھتے ہیں:

”سننے میں آیا ہے کہ حضرت شمس الدین بلخی دہلی میں شاہی عہدہ رکھتے تھے ایک دن دیوان خانہ میں کسی نے دوسرے کو ایک کے اشارے سے کوئی بات کہی۔ شیخ شمس الدین کی اس پر نظر پڑ گئی اور ان کو خیال ہوا کہ یہ منافقت کی علامت ہے اس صحبت میں نہیں بیٹھا چلے۔ عہدے کو ترک کر کے دہلی سے روانہ ہوئے اور جب بہار کے قریب پہنچے تو شیخ احمد چرم پوش نے آپ کے آنے کی اطلاع باکر اپنے دوستوں سے فرمایا کہ دوست آتا ہے اور آپ نے اجازت کو ساتھ لے کر اپنا اشغال کیا۔ ملاقات کے بعد شیخ شمس الدین مرید ہوئے اور شیخ احمد چرم پوش کی خانقاہ میں رہنے لگے اور اپنی حرم کو لکھ کر بھیجا کہ میں نے دنیا کو ترک کیا۔ اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہو تو مال و اسباب کو لڑکوں کے حوالہ کر کے یہاں چلی آؤ۔ آپ کی حرم نے شیخ مظفر اور شیخ معیز الدین ہر دو فرزند کو کہا کہ اسباب اور املاک کو تم لوگ رکھ لو میں تمہارے والد کا ساتھ دوں گی۔ شیخ مظفر اور شیخ معیز الدین نے فرمایا کہ باپ کا ساتھ دینا اول ہم لوگوں پر فرض ہے ہم لوگ بھی اس کی موافقت کریں گے گھر کو دیوان کر کے روانہ ہوئے اور بہار چلے آئے۔“

حضرت مولانا شمس الدین بلخی کے تین بیٹے تھے، مولانا مظفر بلخی، مولانا معیز الدین بلخی اور مولانا قمر الدین بلخی۔ جس وقت مولانا شمس الدین بلخی دہلی سے بہار آئے غائب مولانا قمر الدین بلخی کم سن تھے۔ جیسا کہ حضرت مخدوم شعیب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ حضرت شمس الدین بلخی کا وصال بہار شریف میں ہوا، آپ کا مزار

مبارک حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے پاس ہے۔

حضرت مولانا مظفر بلخی

آپ کا نام مظفر اور کنیت برہان الدین تھی، پدر بزرگوار کا نام شمس الدین بلخی تھا، آپ حضرت مخدوم الملک کے چہیتے مرید اور خلیفہ تھے۔ مخدوم الملک نے آپ ہی کے ہاتھ میں ایک موقع پر "تن شرف الدین جان مظفر، جان شرف الدین تن مظفر، مظفر شرف الدین شرف الدین مظفر" جیسا محبت سے بھرا ہوا جملہ فرمایا تھا۔

جب شمس الدین بلخی شیخ احمد چرم پوش سے مرید ہو کر بہار میں خدمت کرنے لگے اور ان کے تینوں لڑکے اور اہلیہ بھی دہلی سے بہار چلی آئیں تو دودھ لڑکے شیخ معز الدین اور شیخ قمر الدین تو شیخ احمد چرم پوش سے مرید ہوئے۔ لیکن شیخ مظفر کی طبیعت حضرت مخدوم الملک کی طرف مائل تھی چنانچہ اپنے والد ماجد کے اشارہ کرنے پر خاموش رہے۔ لیکن شیخ شمس الدین کو معلوم ہوا کہ مولانا مظفر بلخی کی طبیعت کا میلان حضرت مخدوم الملک کی طرف ہے تو انہوں نے بخوشی اس کی اجازت دی اور فرمایا جہاں تمہاری طبیعت چلے وہیں بیعت کر لو۔ حضرت مولانا مظفر بلخی اپنے والد کی اجازت کے بعد حضرت مخدوم الملک کے مرید ہو گئے۔

ایک دن مولانا مظفر بلخی دہلیز پر ہاتھ اور پنچا کئے ہوئے کھڑے تھے مخدوم الملک کی ان پر نظر پڑی دیکھا کہ صرف ہڈی کا ڈھانچہ کھڑا ہے، پوست استخوان سے چسپیدہ ہے۔ قاضی زاہد سے مسکرا کر فرمایا زاہد دیکھتے ہو یہ لایعلم کا کہنے والا سلوک کی منزل کو کتنی تیزی سے طے کر گیا پھر عنایت فخرہ کے بعد خلیفہ اور مجاز بنا کر خلق اللہ کی خدمت کے لئے عدن روانہ کیا۔ مناقب الاصفیاء میں شیخ الاسلام شیخ حسین معز بلخی سے مروی ہے کہ حضرت مخدوم جہاں کے مریدان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان میں سے چالیس حضرات اہل حق کے درجہ پر تھے اور ان چالیس حضرات میں تین بزرگ یعنی حضرت مولانا مظفر بلخی اور دو اہم تھے۔ حضرت مولانا مظفر بلخی کو عشق کی آگ و دہشت ہوئی تھی اور بقیہ اس کا دواواں۔

حضرت مولانا مظفر بلخی سے کرامات اور خوارق عادات کا بہت کم اظہار ہوتا تھا اس لئے کہ حضرت مخدوم الملک اسے بہت زیادہ پسند کرتے تھے لیکن کبھی کبھی طبیعت سے مجبور ہو کر کرامات کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ حضرت مخدوم الملک کے ساتھ کسی مجلس میں بیٹھے تھے۔ شیخ منہاج الدین جنہوں نے کئی حج ادا کئے تھے اس مجلس میں موجود تھے۔ بات فریضہ حج پر چلی۔ شیخ منہاج الدین نے بطور اعتراض آپ کے سر کی طرف دیکھ کر کہا کہ حج سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ آپ کو شیخ منہاج الدین کی باتیں ناگوار گزریں اپنی آستین شیخ منہاج الدین کو دکھائی اور بولے کتنا حج حج کا ذکر کرو گے، غلامان شیخ شرف الدین کی آستین میں دیکھو۔ شیخ منہاج الدین نے جو نظر کی کجہ مبارک کو آپ کی آستین میں دیکھا متعجب ہوئے لیکن حضرت مخدوم الملک کو بات پسند نہ آئی انہوں نے فرمایا جب تم اپنی کرامات کا اظہار کرو گے اتنا ہی کرامات بخشے والے سے دور ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا اگر میں نہ ہوتا تو تمہارا حشر بھی منور جیسا ہوتا۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کی زندگی اپنے مرشد کی طرح حد درجہ دلشادہ اور فیرانہ تھی سچے کبھی دو وقت کا کھانا نہیں کھلیا، آپ نماز عشاء کے بعد برابر اپنے مریدوں سے فرماتے اگر تمہیں گرسنگی اور تشنگی برداشت ہو تو رہو ورنہ میرے ساتھ رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا مظفر بلخی کے بھائی شیخ معیز الدین کی موت کا حادثہ مگر معطر میں ہوا۔ مرنے کے وقت حضرت مولانا مظفر بلخی سرانے کھڑے تھے اس وقت افسردگی کے ساتھ فرمایا، "معیز الدین مناسب تھا کہ پہلے مجھ کو جانے دیتے اس لئے کہ میں تم سے بڑا تھا" و سوال کو معیز الدین بلخی کا وصال ہوا اور وہیں مقام حضرت خدیجہ اور فضیل ابن عیاض میں مدفون ہوئے۔

آپ عرن میں تھے کہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ اکیس روز کے قریب کچھ نہ کھایا نہ پیا اور نہ کسی سے گفتگو کی۔ حضرت حسین نوشہرہ توحید آپ کی خدمت میں ہوا پر حاضر رہے۔ جس روز آپ کو سفر آخرت پر جانا تھا آپ نے حضرت نوشہرہ توحید کو اپنی اور اپنے پیر کی نعمتیں عطا کیں اور بہار کی مسند سجادگی پر اپنا قائم مقام رکھا اس کے بعد یاد الہی میں مشغول ہوئے اور اسی حالت میں رمضان المبارک ۸۸ھ میں آپ کا وصال ہوا، تاریخ وفات حضرت مولانا توحیدی نے اپنی کتاب "وسلیمہ شریفہ"

وزیرِ دولت میں لکھا ہے

روح مولانا مظفر کرد چوں نعتیں مکیاں
از عدن در عدن تاریخ ششہ مخدوم زباں

قطع

چشمہ فیض ذات اوست کرد رفتہ برسوں جو بہار شرف
سالِ نقلِ مظفر بلخی جستم دیا فتم بہار شرف
۷۷۸ھ

آپ کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد اس قدر تھی کہ پانچ صدیاں گزر جانے کے بعد
بھی اس وقت صوبہ بہار میں آپ کے ماننے والے ہزاروں سے زیادہ ہیں، ممتاز خلعائیں مخدوم حسین
نوشہ توحید بلخی، حضرت خواجہ جمال اولیاء، صوفی خواجگی تاج نجیب الدین بدایونی وغیرہ تھے مولانا
مظفر بلخی کو اپنی اولاد نہ تھی، اپنے بھتیجے مخدوم حسین پسر مولانا معیز الدین بلخی کو اولاد کی طرح تربیت
دی تھی۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کی تصانیف میں اللہ کے مکتوبات بہت اہم ہیں، مولانا کے مکتوبات میں
حضرت مخدوم الملک کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہی قرآن و حدیث کے حوالے فلسفہ، نقوف اور روحانیت پر
دور دیا گیا ہے۔ مولانا مظفر بلخی غیاث الدین اعظم شاہ حاکم بنگالہ کو پسند و نصیحت برابر یاد کرتے تھے۔
حضرت مولانا مظفر بلخی کا دیوان مطبوعہ ہے، پہلی مرتبہ جناب سید حفیظ الدین بلخی نے مرتب
کر کے مطبع حنفیہ بخشی محلہ سے چھپوایا تھا۔ دوئم ان کا دیوان ادارہ تحقیقات عربی و فارسی بہار کے شائع کرایا۔
حضرت مولانا مظفر بلخی کے کلام میں حضرت مخدوم الملک سے عقیدت و محبت کی جھلک نمایاں
ہے۔ ایک غزل میں کھل کر اپنے پیرومرشد کی منقبت لکھی گئی ہے

آن قدر کی کہ نور جمال و جلال داشت در لاکھ تمام بود در الکمال داشت
قطبے ماں کہ بد شرف الحق دین جہاں دآسماں بہ جمع ملائک جمال داشت
آن شہسوار گئے زمیناں صدق برد چو گان ہمتش بہ فرسگاہ حال داشت

از نار عشق سوختہ بد پرد بال او
 از نور صرف و تہ او پرد بال داشت
 او در فنا بہ حد نہایت رسیدہ بود
 ملک بقلبے ایند باقی نوال داشت
 او بود بے عیال ولیک از علوے قدر
 جملہ جہاں از مشرق و مغرب عیال داشت
 بے ذلت و ذلال قدم بہ صراط بود
 عصمت بذات پاک تن لایزال داشت
 مولانا روم اور تقریباً سبھی صوفیاء کے یہاں انسانی زندگی کی بے کیفی اور زبوں حالی کی سب سے
 بڑی وجہ عشق کو عقل و خرد پر ترجیح دینا ہے، مولانا مظفر بلخی برہان بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔
 ہمہ کار ہا حرام است جز کاریار بر ما
 چوں فرض فرض راہ است این کا دوبار بر ما
 عقل را جز کار سازی بیش نیست
 عشق را جز پاک سازی بیش نیست

ہمہ کار ہا حرام است جز کاریار بر ما
 چوں فرض فرض راہ است این کا دوبار بر ما
 دوزوم عقل ہم چوں عصفور صید گشتم
 عشقت چو پنجہ برزند سمرغ وار بر ما
 "عقل" را جز کار سازی بیش نیست
 "عشق" را جز پاک سازی بیش نیست
 ایمان نہ ہونے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ مذبذب اور تشکیک انسان کو قعر مذلت میں گرا
 دیتا ہے۔ ایمان کے لئے سب سے بڑی چیز مذبذب اور تشکیک سے گلو خلاصی ہے۔ حضرت برہان
 بھی انہی خیالات کو اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔

بہاہ عقل می رفتم کہ مارا عشق را خم کرد
 شدم من بے خبر بد ہوش عقلم جیک ماتم کرد
 ہر آن افسوں کہ عقلم خواند اندر گوش من ماندہ
 کہ زہر عشق در سر رفت بی خود مست بر ہم کرد
 عمار تہلے دار العقل شادم بود تا اکنون
 کون سیلاب عشقش زد تہائی ہم دگر خم کرد
 ز دست عقل چوں تن را بچنگ عشق آوردم
 ہزاراں پادہ را در تن کہ اندر پردہ ور ہم کرد
 ہر آن وعظی کہ عقلم کرد عشق آن جملہ را لاند
 صدائے بیہودہ اکنون ز نادیدہ انگاں کم کرد
 عشق کی منزل اور بندہ عشق کے مقام کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے انسان کی
 افضلیت پر زور دیا ہے۔

ماہ بال عشق بالا می رویم از زمیں بر چرخ اعلیٰ می رویم
خانہ و بازار و شہر و کوہ و دشت ہر کجا عشقت آبخا می رویم
با خودی از تیغ لاگردوں رویم بر جمال عشق بالا می رویم
جذب حق است عشق در ہم جذب اد ماہ سوئے حق تعالیٰ می رویم
خود نمی گنجد پو برہاں در رہش در رہش از خویش بکیمی رویم
مولانا مظفر بلخی کے نثری کارناموں میں ان کے مکتوبات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

مکتوبات کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدابخش خاں پٹنہ میں موجود ہے اس کا اشاریہ نمبر ۲۶۱۹ ہے۔ یہ کتاب ۴۱۹ صفحات پر محیط ہے۔ نہایت ہی بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔ یہ مخطوطہ ۲۶۲۲ء کا ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ مخطوطہ خط نستعلیق کا بہتر نمونہ ہے، زبان فارسی ہے۔
مولانا مظفر بلخی کی دوسری نثری تصانیف میں شرح العقیدہ ہے اس کا سائز ۱۲×۱۰ ہے، یہ کتاب ۴۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ اس کا اشاریہ نمبر ۳۹۸۸ ہے۔
ہے لگ بھگ ۱۲ صفحات کرم خوردہ ہیں، اس کتاب میں تصوف کے رموز و نکات پر بحث کی گئی ہے۔
جایجاوہی کے اقوال درج ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ خدابخش خاں لاہوری میں موجود ہے۔

حضرت حسین نوشتہ لوحی بلخی

آپ حضرت معیز الدین بلخی کے صاحبزادے اور مولانا مظفر بلخی کے تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے۔ آپ حضرت مخدوم الملک کے بعد جانشین ہوئے۔ حضرت مولانا مظفر بلخی اپنے بھتیجے سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم الملک نے فرمایا تھا کہ تمہارے بھائی شیخ معیز الدین کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوا ہے وہ تمہارا فرزند کہلائے گا حضرت حسین بلخی ظفر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

تذکروں میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت مخدوم جہاں عامہ اتار کر وضو کر رہے تھے۔ مخدوم حسین کے بچپن کا زمانہ تھا، کھیلے ہوئے ادھر آئے اور مخدوم جہاں کا عامہ سر پر رکھ کر جس طرح

مخدوم کو دیکھا تھا مصلیٰ پر جا کھڑے ہوئے، مولانا مظفر بلخی کی نظر پڑی تو اس طفلانہ گستاخی پر روکنے کی کوشش کی۔ حضرت مخدوم جہاں نے فرمایا یہ بچہ اپنی جگہ کو پیچا نہا ہے۔ حضرت مخدوم للک اس طرح پر فرماتے تھے "میں نے تو گرم کیا، مظفر نے روٹی پکانی اور حسین کھائیں گے۔"

"مولانا القلوب" میں حضرت احمد بن حسن بلخی فرماتے ہیں کہ حضرت حسین نوشہ توحید جیسا جلال و جمال و وقار بہت کم مشائخ اور بزرگوں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ مکہ معظمہ کے قیام کے دہانے میں آپ نے یہ درود "الیف کیا تھا: اللہم صلی علی محمد و علی آل محمد عذ دخلک درضا نفسک و ذمتک عرشک و مدار کلماتک اس شب کو مولانا مظفر بلخی اور ان کے علاوہ تیس چالیس درویشوں نے خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اس درود کو بہت پسند کیا۔

حضرت حسین نہایت ہی خوش رو اور دجیمہ تھے۔ اخلاق ایسا وسیع تھا کہ جو شخص آپ کے پاس آتا آپ بلا قید مذہب و ملت اس کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرتے تھے۔ خانقاہ میں تیس چالیس درویش ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ جب کوئی نیا شخص تعلیم طریقت کے لئے آتا تھا تو آپ اول اس کو قناعت کی تلقین کرتے تھے۔

اگرچہ رشد و ہدایت اور درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ تصنیف تالیف کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی یادگار ہیں:

(۱) حضرات خمس (۲) رسالہ قضا و قدر (۳) رسالہ توحید خاص (۴) رسالہ اخلاص الخواص (۵) رسالہ ذکر وجود عالم ہدایت آن و بیان معرفت عالم و نہایت آن (۶) رسالہ در بیان ہشت چیز ذات، جہت، نفس، صفت، اسماء، افعال، صورت جامعہ، صورت متفرقہ، برسبیل توضیح و تشریح بر اصلاح موحداں (۷) اوراد و فعلی (۸) گنج لایحی (۹) مکتوبات (۱۰) اجادت نامہ بنام مولانا شیخ حسن (۱۱) دیوان فارسی۔

(۱۲) حضرات خمس چند صفحات کا عربی رسالہ ہے اس میں تجلیات باری تعالیٰ کی پانچ صورتیں متعین کر کے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ کتاب عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ علمائے حجاز نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ آپ کے فرزند حضرت حسن بلخی نے اس کی شرح کاشف الاسرار کے نام سے لکھی۔

(۲) رسالہ قضا و قدر چند اوراق کا رسالہ ہے، قضا و قدر کے اسرار و حکم اور خیر و شر کے رموز پانچ مہیڈوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) رسالہ توحید خاص : رسالہ قضا و قدر کی طرح یہ رسالہ بھی کسی مسائل پر جواباً تحریر کیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں مسئلہ وحدت الوجود کو مختلف دلائل سے بتایا گیا ہے۔

(۴) رسالہ توحید خاص الخاص، آٹھ صفحات کا یہ مختصر سائنسی رسالہ ہے۔ یہ کتاب بھی عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

(۵) رسالہ وجود عالم ہدایت و نہایت عالم صوفیوں کے لئے بہت ہی روح پرور اور دلچسپ رسالہ ہے، یہ رسالہ بھی فلمی ہے۔

(۶) رسالہ در بیان ہشت چیز : موحّدوں کی اصلاح کے لئے لکھا گیا ہے، صوفیاء اور علماء کے لئے یہ ایک وسیع رسالہ ہے یہ بھی غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔

(۷) اوسادہ فعلی : اوسادہ وظائف کا مستند اور قابل عمل مجموعہ ہے، یہ رسالہ ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کے کاتب سید ابوالحسن بلخی ہیں اور سن کتابت ۱۲۹۱ھ ہے۔

(۸) گنج لایحی : مخدوم الملک کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کے جامع حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی ہیں، ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے اس کے کاتب محمد یعقوب بلخی ہیں اور سن کتابت ۱۲۲۱ھ ہے۔

(۹) مکتوبات : تصوف و سلوک کے دو مجرمے ہیں۔ بیشتر مکتوبات جوابی ہیں۔ مکتوبات کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے : اول تعلیم و تربیت و پند و نصائح دوم آیات و روایات اخبار و آثار کی تفسیر و تشریح، سوم بزرگان سلف کے ابیات و اشعار پر تنقید اور ان کی توضیح، چہارم مسائل شریعت کے احکام و صلح پنجم سلوک و تصوف کے اسرار و رموز۔

توحید اور نوشہ توحید آپ کے خاص لقب ہیں، آپ کا وصال ۲۴ ذی الحج بروز شنبہ ۱۲۴۴ھ میں ظہر

کے وقت ہوا۔ آپ کی تاریخ وفات درج ذیل ہے۔

شد گل ماب بہار شریف

تاریخ سال وفات سن بلخی حسین

مؤلف سلسلہ فردوسیہ جناب معین الدین دردائی نے اپنی تصنیف میں جناب حسین نوشہ توحید
بلخی کے کلام کا مختلف جائزہ لیا ہے۔ موصوف کی شاعری کا نامکمل دیوان جناب سید قسیم الدین احمد فردوسی
کے پاس موجود ہے۔ اس کے کاتب عبدالعلی مرحوم ہیں یہ نسخہ جناب حضور کے زمانہ میں ان ہی کے
حکم سے یکجا کیا تھا۔ شاعری میں آپ کا تخلص حسین ہے نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔ شوق و سن کا اندازہ
دینا ہے ۵

ماخودی را جلد در توحید ناب افکنده ایم	صورت تلبیس را از رخ نقاب افکنده ایم
گہ بہ سحران می سپارد در وصالش می دید	دل بہ عنہا چوں نمک اندر کباب افکنده ایم
مومن و ترسا و تمنع اندر سمع آورده ایم	ناں نواہا کہ حقیقت در باب افکنده ایم
گہ بہ شہر عشق جاناں ہم چوں عنقائی پریم	گہ چوں بوم عقل سایہ در خراب افکنده ایم
پارسیاں اندرین مدہ بت پرستی می کنند	مادرع در جام تقویٰ از شراب افکنده ایم

از خورشید دشت چو دیوانہ گشتہ ایم	از خورشید دشت آشنا ہمہ بیگانہ گشتہ ایم
یک جرعه چو الالبیش چشیدہ ایم	رند و شراب خوار بہ میخانہ گشتہ ایم
روز ازل چو شمع جمال تو دیدہ ایم	بر آتش جمال تو پروانہ گشتہ ایم
ہم چو حسین از سر جاں در گذر کہ مست	ادجاں گذشتہ ایم کہ جانانہ گشتہ ایم

سلسلہ وحدت الوجود کی وضاحت ملاحظہ ہو ۵

ماستر جمال کبریا نیم	در ملک وجود بادشاہیم
خورشید رود بہ برج خلوت	گر طلعت خود بدو نمایم
ہر قوم بہ قبلہ گرا آید	ما حاصل جملہ قبلہا نیم
در چہرہ دلبران بہ شوخی	از خلق ہمیشہ دل ربانیم
دانی بدو کون کیست پیدا	مانیم از راہ لطف مانیم
آں چیت کہ غیر ما بگفتند	آں را تو بدان کہ جلد مانیم

مولانا روم اور امام غزالی سب ہی نے خرد کو عشق کے سامنے بیچ سمجھا ہے۔ بلکہ اُسے جمال الہی کا حجاب بتایا ہے۔ مولانا مظفر بخنی نے بھی اس خیال کو اپنے دیوان میں اکثر و بیشتر اظہار کیا ہے۔ مخدوم حسین نوشہرہ تو حید کے یہاں بھی عشق و محبت کی شراب دوا آتشہ سہ آتشہ ہو کر عجب رنگ دے جاتی ہے۔

حال اونی توئی دہد از کعبہ در بتخانہ شو	زلف او دعویٰ کند کنز عاشقی دیوانہ شو
بر دل مشتاق آمد این خطاب از عارضش	کعبہ یک سو نہ بیزار از بتخانہ شو
گر عیاں خواہی کہ بینی روئے یار جانفزا	پائے بر خرق خرد نہ عاشق دیوانہ شو
در سلامت عاقلان را عشق نہ نماید جمال	با ملامت ساز و آنگہ زند ہر مینجانہ شو
در سماع کان بسر خود مطربے خود دف بود	بالوائے عشق تن تن تن تن تن تن تن تن تن تن
در خرابات کہستان جام وحدت در کشند	چو حسین از بادہ ہر در در اہ پیانہ شو

مسئلہ توحید کی وضاحت میں جرأت گفتار ملاحظہ ہو۔

جمال پر توئے جان قلندر	ز نور پاک حق گشتہ مصور
نگارا چند بکئی پردہ بانی	کہ تو مائی و ما با تو سراسر
کہ می گوید کہ حق صورت نہ بندد	من اینک دیدہ ام نورش منور
قتیل راہ وصلت را دما دم	ہمیشہ خنجر، بجرست بر سر
زہر قطرہ کہ از خوشش بریزد	بر آید نقش از دانشد اکبر
ولا، بر زن کنوں کو سب بشارت	کہ ملک لایزال شد مقرر
نہ گنجہ ظلمت حرماں درینجا	حسین از وجہ تو چوں شر منور

عبادت و ریاضت صرف کم بولنا، کم کھانا، کم سونا نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور چیز ہے اور وہ ہے اپنے نفس اور دل پر قابو پالینا۔ اس مسئلہ کو اپنے مرشد مخدوم الملک حضرت

شرف الدین یحییٰ منیری کے حوالہ سے ایک قطع میں اس طرح لکھتے ہیں۔

مقتدائے دین پیر منیری ایں سخن با ما بگفت از سروری

کائے برادر گر بخوابی اصل کار
 این سخن یاد در دل خود پاسدار
 این ریاضت نیست کایں رنجے بری
 کم بگوئی، کم بخشی، کم فوری
 بچگان و طفل و ہم، یوہ زمان
 این ریاضت می کنند آفتاب و تان
 ہر چہ آن فصلت دید قربت دید
 در خیال غیر حق فرقت دید
 این ریاضت باشد اے عالی مقام
 گوش کن تفسیر آن را در کلام
 پاسبان دل شو اندر کل حال
 تا نیاید، پہنچ و زو آبخا مجال
 ہر خیال غیر حق را وزد خواں
 این ریاضت سالکان را فرض داں
 از ہوائے حرص دل را قطع کن
 با چنین رہ اتباع شرع کن
 ہر کہ این رہ می رود دل شاد باد
 دین نعم از بہر او آمادہ باد

حضرت مخدوم شیخ حسن دالم جشن بلخی فردوسی

حضرت مخدوم حسن بلخی حضرت نوشہ توحید بلخی کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے، آپ نے تعلیم و تربیت ظاہری و باطنی اپنے والدین سے حاصل کی اور شروع سے آخر تک ان کی ہمار خدمت میں رہے۔ آپ کی ذات میں سخاوت اور فیاضی بہت زیادہ تھی، گھر میں کچھ رکھنا آپ کو پسند نہ تھا، بچپن میں جو کچھ پیسے اپنے والد ماجد سے ملتے تھے اس کو دو چار دن کے اندر خرچ کر دیتے تھے آپ کے صاحبزادے احمد نگر دریا بلخی نے اپنے ملفوظات مولفہ انقلوب میں یوں لکھا ہے "میاں حسن کو اگر گھر بھر دولت مل جائے تو پھر بھی یہ کچھ ہی دنوں میں اس سے فارغ ہو جائیں گے بلکہ اگر نہ پاویں تو ہمیں بھی کسی کو بخش دیں" حضرت احمد نگر دریا بلخی اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ کچھ دنوں تک حضرت والد ماجد نے بیعت لینے اور مقراض مالی کو ترک کر دیا تھا، ایک دن انہوں نے حضرت مخدوم حسین کو خواب میں دیکھا کہ وہ بیعت نہ لینے کا سبب پوچھ رہے ہیں، حضرت مخدوم حسن نے جواب دیا کہ مجھے اپنی آنکھوں کو دیکھ کر دہشت ہو رہی ہے دوسروں کا ہاتھ کس منہ سے پکڑ لوں؟ آنکھ خود گشتہ رہا است گرا رہی بکند یہ

یہ سن کر شیخ حسن نے اپنی آستین سے ایک کاغذ نکالا اور ان کے ہاتھ میں دیا۔
وہ ایک نفیس پیراہن پر فردوس کا شجرہ لکھا ہوا تھا پھر فرمایا دیکھو تمہارا نام جو بیس پیروں کے
نام کے اوپر لکھا ہوا ہے تمہیں اگر اس کا یقین نہ ہو تو مجھے دیکھو پیچھے مڑ کر دیکھو تو حضرت شیخ مولانا مظفر
بلخی کو کھڑا پایا ان کے پیچھے مخدوم الملک کو اور ان کے پیچھے حضرت نجیب الدین فردوسی کو اور اس
طرح سلسلہ تھا۔ شیخ حسین نے پھر اپنے صاحبزادے سے مخاطب ہو کر فرمایا "حسن جن کی پیٹھ پر
اپنے اپنے پیشوا ہوں اُسے کیا پروا۔ صبح اٹھ کر شیخ حسن نے بیعت لینے اور مقراض رانی کا
کام شروع کر دیا۔ حضرت حسن بلخی علوم دین اور علم معرفت و حقائق میں باکمال تھے۔ نقوف کے
باریک مسائل کو نہایت سہل طریقے سے فرماتے تھے۔ آپ کی تصنیفات سے دو کتابیں بہت مشہور
ہیں۔ ایک تو کاشف الاسرار جو شیخ حسین نوشہ توحید بلخی کی عربی کتاب حضرات خمس کی بہت بیعت
شربت ہے اور دوسری لطائف المعانی۔ ان دونوں کتابوں میں توحید، معرفت کے اسرار اور عشق و
محبت کے رموز و نکات بہت بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔

آپ کی تاریخ وفات مصنف وسیلہ شرف ذریعہ دولت نے یوں لکھی ہے ۵
گزیدہ لاغرم خواجہ حسن سرانگشت بگفت طبع کہ بوئے گل بہار شرف

۵۸۵۵ھ

بوئے گل بہار شرف کے اعداد سرانگشت یعنی الف اور لون کے اصناف سے ۵۸۵۵ھ
نکلے ہیں۔ مولانا حسن بلخی کی کتاب کاشف الاسرار کا ایک علمی نسخہ خدابخش خاں لاہوری پٹنہ میں
موجود ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۰۷ھ کا مرقومہ ہے۔ اس کے کاتب محمد حسین اسلام پوری ہیں اس کے اوراق
۴۳ ہیں اور اس کا اشاریہ نمبر ۲۰۴۹ ہے۔

حضرت مخدوم الملک احمد لنگر دریا بلخی

حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی حضرت حسن بلخی کے صاحبزادے تھے لیکن آپ نے
تعلیم شریعت اور فیضانِ طریقت اپنے جدا مجد حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی سے بھی

حاصل کیا تھا۔ آپ کی پیدائش ۲۷ رمضان المبارک ۸۲۶ھ کو ہوئی چنانچہ پیدائش کے موقع پر حضرت حسین نوشہ توحید نے اپنے قلم مبارک سے عربی میں یہ چند سطور بطور یادداشت لکھ دئے تھے جس کو خود حضرت لنگر دریا بلخی نے اپنے ملفوظات مونس القلوب میں نقل کیا ہے۔ ولد الولد اعز المسمی الشیخ احمد بن حسن بن حسین الملقب بہ برہان الدین المکی بوالد النائم ابت اللہ بناتاً حسناً فی لیلۃ سبع وعشرین من شہر المبارک الرمضان فی ستۃ وعشرین وثمان مائۃ اللہم اجعل من الاحیاء وسلمۃ من الاسماء وافعل بنا ینفۃ ما انت لہ اہل ولا تفعل بنا ویۃ ما غن ایلہہ یا مولانا برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مونس القلوب میں یہ تحریر ہے کہ پیدائش کے بعد حضرت لنگر دریا بلخی کی چالیس روز تک آنکھیں بند رہیں اس سے گھر والے گھبرائے لیکن حضرت حسین نوشہ توحید برابر تسفی دیتے رہے اور چالیس روز تک نماز چاشت کے بعد اپنا عاب و ہن ان کی آنکھوں پر تلے رہے۔ آخر چالیس روز کے بعد حضرت احمد لنگر دریا بلخی کی آنکھیں کھلیں۔ آپ نے پہلا جلوہ اپنے دادا جان کا دیکھا جب ہوش آیا تو برابر اپنے دادا جان کی خدمت میں حاضر رہے اور ان ہی سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے، حضرت حسین نے ایک مرتبہ حضرت احمد کو فرمایا "احمد ہم تو کچھ نہ ہوئے لیکن تم اگر محنت سے بڑھو اور معرفت حاصل کرو تو کچھ ہو جاؤ گے تم سے ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا نام رہے گا۔"

سفر مکہ کی راہ میں ایک مرتبہ ان کو جو خطرہ لاحق ہوا تھا اس واقعہ کو حضرت احمد لنگر دریا بلخی نے مونس القلوب میں اس طرح لکھا ہے :

"مکہ کے راستہ میں ایک مرتبہ جہاز ٹوٹنے لگا اور دو روز تک تمام مسافر امید و بیم کے جھولے میں جھولتے رہے ناامیدی نے ہر ایک کو دہشت زدہ بنا دیا۔ میں اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ جہاز پر تھا اور سمجھتا تھا کہ خداوند ا تیرے اس کام سے میں راضی ہوں ضرور اس میں میری کوئی مصلحت مضمر ہوگی۔ اسی اثنا میں میری لڑکی فاطمہ کو غنودگی آگئی تو اس نے حضرت امیر المومنین

علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ تسلی دے رہے ہیں کہ تم لوگ مترو
نہ ہو جہاز محفوظ رہے گا' اس کے بعد ہی جہاز خطرہ سے باہر ہوا۔
مصنف 'وسیلہ شرف و ذریعہ دولت' نے لکھا ہے کہ غالباً اس واقعہ کے بعد آپ کا خطاب
لنگر دریا پر کیا۔

'مولانا انقلاب' میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت احمد لنگر دریائے اپنے صاحبزادے شیخ
ابراہیم کی پیدائش سے پہلے ان کے دل میں یہ خیال ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم دوم کی اولاد سے ہیں
اگر اللہ ان کو ایک بیٹا دے تو وہ اس کا نام ابراہیم ہی رکھیں، کچھ روز کے بعد شیخ ابراہیم پیدا ہوئے
اور مخدوم الملک کے وصال کے بعد ایک مرتبہ وہ ایسا بیمار ہوئے کہ امید زلیست باقی نہ رہی
حضرت احمد لنگر دریا بے چینی کے عالم میں مخدوم الملک کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے اور عرض
حال کیا تو خواب میں دیکھا کہ وہ تکیہ کے سہارے بٹھا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ پریشان نہ
ہو وہ لڑے گا۔

حضرت احمد لنگر دریا کو جو محبت اور عقیدت حضرت مخدوم الملک سے تھی اس کا اندازہ
اس سے ہوگا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو تمام مسلمانوں پر پانچ شکر واجب ہے ایک تو
اللہ تعالیٰ نے وجود میں لایا دوسرے یہ کہ حیوان بنا دیا جاد نہ بنایا تیسرے یہ کہ حیوان مطلق نہ بنایا
بلکہ انسان بنایا چوتھے یہ کہ اسلام کی دولت سے بالامال کیا۔ پانچویں یہ کہ حضرت خاتم الرسل احمد مجتبیٰ
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بنایا لیکن مجھ پر ایک اور شکر واجب ہے وہ یہ کہ حضرت شرف
منیری کے غلام میں شمار کرایا۔

از بندہ چہ آید بجز امتدار غلامی	کال آمدہ فخر من دعا شرف الدین
سائیں بدرش جبہ کز ان داغ بہ محشر	زود آمدہ باشم بہ شمار شرف الدین
بگزر شرف اختر فیروزی بختم	طاع شدہ از برج حصار شرف الدین

آپ کی طبیعت میں عجز و انکساری بے انتہا تھی، غیبت اور عیب جوئی سے قطعاً پرہیز کرتے
تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے۔

ترا یک ذرہ در خود عیب دیدن بہ از صد نوع عیب الغیب دیدن
آپ کی تصانیف سے مونس القلوب، عارفانہ کلام کا ایک دیوان بطور یادگار ہے جس کا یہ شعر
اکثر زبان زد ہے

گرمین از رخ بر کشائیم پردہ ابلیس را در نظر فرق نہ دارم آدم و ابلیس را
آپ کا وصال ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ ہے۔ قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے
چو شیخ احمد بلخی کہ بود منبع فیض بہ خلد رفت شدہ سال رحلتش فیا
ایک اور قطعہ تاریخ ہے:

۱۳۹۱ھ

بہ راغ خلد خراسید احمد بلخی کہ بود بر تنش ناقد تنار شرف
پرید بوز کلام چو سال بر خواندم ہوائے طیب ہوئے گل بہار شرف

جناب ڈاکٹر حسن امام ناظم شعبہ مخطوطات اردو فارسی عربی پٹنہ یونیورسٹی نے احمد لنگر دریا بلخی کی
حیات و شاعری سے تعلق ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جس پر موصوف کو پٹنہ یونیورسٹی نے Ph.D
کی ڈگری عطا کی، حسن صاحب کے بیان کے مطابق احمد لنگر دریا بلخی کے دولہی دیوان خانقاہ بلخیہ
فردوسیہ فتوحہ اور خانقاہ منیر شریف میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مطبع حنفیہ پٹنہ سیٹی سے آپ کا دیوان
شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کو جناب حفیظ الدین بلخی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر
حسن امام نے حضرت احمد لنگر دریا بلخی کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، راقم نے بھی اس تحقیقی
مقالہ سے استفادہ کیا ہے، اس کا جائزہ سطور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا بلخی کے دیوان میں ۹۸ غزلیں، ۴ مثنویاں، ۴ قطعات، ۲ ارباعیا
ہیں جنہیں قطعات کہنا صحیح ہے۔ ۲۸ متفرق اشعار حمد، مناجات، نعت اور دو نظمیں ہیں۔ ان
غزلوں میں ہیں چار رنگ ملتے ہیں سافل صوفیانہ، دوم فلسفیانہ، سوم اخلاقی اور چہارم عام
مضمون، حضرت لنگر دریا کی بیشتر غزلیں اور مثنویاں شیخ عطار، مولانا روم، عراقی، امیر خسرو
دہلوی، شیخ سعدی، خواجہ جامی شیرازی، حضرت مخدوم احمد چیم پوش و حضرت نوشہ توحید اور

اور جاتی کے رنگوں میں ہمیں ملتی ہیں۔

حضرت احمد کانٹری کا زمانہ مولس القلوب، قلمی ہے اس کے جامع قاضی قطب منیری ہیں۔ یہ حضرت احمد لنگر دریا کے مرید تھے۔ مولس القلوب کی اہمیت ملفوظات کی ہے اس میں سو مجلسیں ہیں۔ ان مجلسوں میں صوفیا، علماء، شعراء اور عرب و عجم و ہند ملکوں کے سماجی اور مذہبی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولس القلوب، دوسرے ملفوظات کے مقابلے میں زیادہ فصیح اور افضل ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا کی شاعری کی بنیاد اس طرح رکھی ہے جس طرح امیر خسرو دہلوی، عراقی، حضرت مخدوم احمد چیم پوش حضرت مولانا مظفر بریلوی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی کی شاعری کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ حضرت احمد لنگر دریا بلخی کا مقام فارسی شاعری میں حضرت امیر خسرو، عراقی، حضرت مخدوم احمد چیم پوش، حضرت نوشہ توحید کی طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حضرت احمد لنگر دریا بلخی کا کلام بہت ہی مختصر ہے کیوں کہ شاعری میں آپ کی ذات ثانی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ آپ کی اولین ذات مبارک یاد الہی، ذکر و فکر، تبلیغ و ارشاد اور دیگر خیر و برکت کی مجلسوں میں گزری۔ آپ کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ عرب و عجم کے ملکوں کی سیاحت کرتے رہے۔ مثلاً حجاز، عراق، بغداد اور بلخ کی سیاحت کی اور وہاں کی قابل قدر شخصیتوں سے ملاقات کی چنانچہ فرصت کے اوقات میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے شاعری کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ نمونہ کے طور پر چند

شعر یہ ہیں۔

زاں خطا شب مثال کہ تحریر کردہ اند روز ازل عبث مرا تہمیر کردہ اند

اے شاہ باد میرس ز حال گدائے خویش اندر جہاں حسن تما اسیر کردہ اند

مردان حق شناس بہر تاثیر یک نظر من دھو بہ جملہ اکثر کردہ اند

اصحاب دل ز درد بہ دار و سیدہ اند زان روئے التجاہ در پیر کردہ اند

پروفیسر معینی و دوائی اپنی تصنیف سلسلہ فردوسیہ میں حضرت لنگر دریا بلخی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں :

”آپ کے کلام میں جہاں تصوف اور اخلاق کے موتی بکھرے ہوئے ملتے ہیں
وہاں دل درد مند کا سوز و گداز بھی نمایاں ہے۔ آپ کے بعض اشعار میں
یادہ محبت کی وہ سرستی پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والے پر ایک عالم طاری ہو جاتا
ہے۔“

آتش عشق تو ناگہ بر فروخت	رطب یا لبس ہر چہ مارا بود سوخت
ذره از آتش ہر رخت	در دل ہر خام گاہ افتادہ پخت
چست آمد بر تنم بکنار عشق	گر چہ خیاط ازل بس جامہ رخت
زاہد دیم کہ در بازار عشق	نقد صد سالہ بجائے مئے فروخت
سوخت از احمد ہمہ پندار وے	آتش عشق تو ناگہ بر فروخت

ساقیا چوں از شراب بخودی مستیم ما	جام بشکن بادہ بفلک کز خودی رستیم ما
در حقیقت چوں بزمینی بچکس ہوئی نیست	در دو عالم حروجد ما کہ ہستیم ما
ماز عبرت غیر را اندر جہاں بگناشتیم	نقش غیر خویشی را پاک بر شستیم ما
خند گوئی چند شنوئی نکتہ تو حیدرا	بے ریاضت نیست لذت بارہا گفتیم ما
چونکہ احمد از احمداری نصیبے شاد باش	میم احمد صفر آمد پس احمد استیم ما

تصوف کا ایک نازک مسئلہ کس خوبی سے ان دو شعروں میں حل کر دیا ہے۔
ز آفرینش خویاں مراد داشت خدائے
مرا کہ قبلہ و قہم ہمیشہ روئے بتان ست
حضرت مخدوم الملک سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار ان چند اشعار میں دلہانہ انداز سے
کیا ہے، وہ ایک خاص کیفیت کا حامل ہے۔

اے بیبا قلندر شو	فارغ ز دل ز جابری شو
تا چند بہ ثورہ در بہ مانی	یک لحظہ بکان شکر نی شو

در کلیہ عقل چند نشینی بر قصبہ جنوں منظر می شو
 باز آید خشک چند باشی در مجلس شاہ منیری شو
 رو باہ ہوا چو صید کردی در بیشہ پلنگ بر تری شو
 از دہم ظلوم دیو بگذر در پر توے روئے آں پری شو
 عالم چو جلیسی حسین است احمد ہمہ عضو ناظری شو

حضرت ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی

حضرت ابراہیم بلخی اپنے والد ماجد مخدوم احمد بلخی کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے۔ آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اپنے والد ماجد حضرت مخدوم احمد نگہ دریا بلخی سے کی تھی۔ زیادہ تر اوقات عبادت و ریاضت، درس و تدریس، رشد و ہدایت میں صرف کرتے تھے، سخاوت اور فکر و توکل میں اپنے والد ماجد کے رویہ کو نصب العین جانتے تھے۔ آپ کا وصال بھی اس تاریخ اور اس مہینہ میں ہوا جس میں آپ کے والد ماجد کا ہوا تھا یعنی ۱۹ رمضان المبارک ۹۱۲ھ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے

بہ سال رحلت مخدوم شیخ ابراہیم کہ بود فقر و غنار را انوشعار شرف
 بہ صبح صدق صداخیر شد نسیم نفس کہ موج باد بہ بوئے گل بہار شرف

۹۱۲ھ

ان بلخی خاندان کے فرد سی مشائخ کے قطعہ تاریخ لکھنے میں لکھنے والے نے بڑا وصف پیدا کر دیا ہے کہ ذرا ذرا سی بامعنی اور بر محل اضافت کے بڑھا دینے سے تاریخ رحلت نکال لیا ہے مثلاً حضرت مظفر بلخی کا سن وفات بہار شرف سے نکالا ہے اور حضرت حسین کے سن وفات نکالنے میں گل کا اضافہ کر کے گل بہار شرف کر دیا ہے اور شیخ حسن میں بو کا اضافہ کر کے بوئے گل بہار شرف کر دیا ہے اور شیخ ابراہیم میں موج کا اضافہ کر کے باد بہ بوئے گل بہار شرف کر دیا ہے۔

مخدوم ابراہیم کی پانچ اولاد تھی، مخدوم شاہین، مخدوم حافظ، مخدوم درویش، مخدوم محمود اور مخدوم مجاہد، تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں مخدوم حافظ، مخدوم محمود اور مخدوم شاہین اپنے

والد ماجد سے خلافت و اجازت رکھتے تھے۔ بہار شریف میں مخدوم حافظ مخدوم محمود اور مخدوم شاہین نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھا۔

مخدوم درویش سے منیر میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا، بہار شریف میں مخدوم حافظ، مخدوم شاہین اور مخدوم محمود نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھا اس وقت خانقاہ میں فقیری اور ارشاد کا سلسلہ بدستور جاری تھا لیکن مجاوروں نے جو خود کو مخدوم شرف الدین کے بعض مرید خاص کی اولاد سے بتاتے تھے اپنی ذاتی غرض اور جاہلوں سے پیسہ کمانے کے لئے خود کو ہر قسم کی کارروائی کا مجاز بنانا چاہتے تھے، صاحب سجادہ کو ایک وجہ معطل قرار دینا چاہتے تھے، بالآخر صاحب سجادہ کے مخالف ہو کر خفیہ سازش کرنے لگے یہاں تک کہ مخدوم حافظ، مخدوم شاہین اور مخدوم محمود کے بعد بلخیوں نے کنار کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی، اس وقت مجاوروں نے شاہ بھیک کو جو شیخ ذکی الدین کی لڑکی کی اولاد میں سے تھے، صاحب سجادہ بنایا۔ بلخیوں کو ان سے خلوصانہ ربط رہا۔ یہ واقعہ مخدوم محمود بن ابراہیم بلخی کے بعد کا ہے۔

حضرت مخدوم حافظ بن ابراہیم بلخی

حضرت مخدوم حافظ بلخی حضرت مخدوم ابراہیم بلخی کے سچے صاحبزادہ تھے، مؤلف سلسلہ فردوسیہ جناب معین الدین دروائی نے لکھا ہے، ازراہ محبت اور خلوص حضرت مخدوم الملک کے خاندان کے فرد حضرت مخدوم الملک کی سجادگی پر بجائے اپنے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے خانقاہ فردوسیہ فتوحہ میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ سلسلہ رشد و ہدایت جاری ہے۔ آپ بڑے خدا پرست صوفی اور عالم باعمل گذرے ہیں۔

مخدوم شاہین بلخی

آپ مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی کے بیٹے تھے، بڑے ذی علم اور متوکل تھے۔ صبر و قناعت اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کرتے تھے۔

مخدوم محمود بلخی

آپ نے اپنی حیات تک بہار شریف میں سجادہ نشینی کی۔

مخدوم درویش بلخی

مخدوم درویش بلخی مخدوم ابراہیم بلخی کے صاحبزادہ تھے اور مخدوم محمود بلخی سے بھی اجازت و خلافت رکھتے تھے، آپ سے منیریں سلسلہ جاری رہا، مخدوم درویش بلخی کے بعد مخدوم بڑن بلخی سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ رکن الدین بلخی تھا۔ ان کا نسب نامہ غالباً منیر والوں کے پاس محفوظ ہو، مخدوم بڑن مخدوم دولت منیری کے باموں تھے۔ منیر کے مخدوم نادوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں (شیر شاہ عقیدت مندانہ ان کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہندوستان کا تخت خالی ہے، اس کے جانے کے قبل ہی ہمایوں بادشاہ کا تسلط ہو گیا اور شیر شاہ نے کسی سبب سے ہمایوں کے طرفدار ہونے کا وہم کیا اور مخدوم بڑن بلخی کو مع فرزندوں کے قتل کر دیا۔ مخدوم بڑن کے بیٹے قطب موحّد بلخی جو اتفاق سے اس وقت کہیں گئے ہوئے تھے محفوظ رہے اور والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے بعد میں شیر شاہ نے کچھ تحائف بھیج کر مخدوم قطب موحّد بلخی سے معافی مانگی پھر قطب موحّد بلخی نے یہ کہہ کر قبول کیا کہ مرشد کسی کا تحفہ میں قبول نہ کروں گا۔ اس کے حق میں دعائے خیر کروں گا۔ مخدوم قطب موحّد بلخی کے بعد مخدوم دولت منیری جو ان کے پھوپھیرے بھائی تھے اور تربیت یافتہ شاگرد بھی تھے ان کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے، مخدوم دولت مخدوم جلیل الدین بن مخدوم یحییٰ منیری کی اولاد ہیں۔

حضرت محمد تقی بلخی فردوسی

حضرت مخدوم الملک کے وصال کے بعد بلخی خاندان کے چھ شاخ کیے بعد دیگرے حضرت مخدوم الملک کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہوتے رہے اور یہ سلسلہ رشد و ہدایت کا حضرت

مولانا مظفر بلخی سے لے کر حضرت حافظ بلخی تک جاری رہا لیکن حضرت حافظ نے جب حضرت مخدوم الملک کی خانقاہ کی سجادگی سے کنارہ کشی اختیار کی تو آپ نے فتوہ میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت محمد تقی بلخی حضرت حافظ بلخی کی اولاد سے تھے آپ حضرت محمد ظہور الحق کے ہم عصر تھے۔ حضرت تقی بلخی نے ایک مذہبی رسالہ احکام لکھا اس کا قلمی نسخہ پروفیسر ذکی الحق کے پاس محفوظ تھا، اس نسخہ کی کتابت ۱۲۵۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے کاتب شیخ خیرات علی ہیں۔ کتاب کی تقطیع ۵ x ۹ ہے۔ ۸۹ اوراق زردارولی کاغذ کے ہیں جا بجا کرم خوردہ ہیں۔

جناب رخشاں ابدالی لکھتے ہیں کہ اس کے مصنف سید شاہ محمد تقی بلخی فردوسی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوہ ضلع پٹنہ ہیں۔ یہ ۱۲۸۳ھ میں میٹا برج کلکتہ میں مرزا مہدی حسن کے اہتمام سے طبع ہوئی، ۲۱۶ صفحات پر محیط ہے اور بعد والے صفحہ پر شاہ یحییٰ عظیم آبادی کے دو قطعے تاریخ فارسی میں ہیں۔ مصنف کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عظیم الدین صاحب نے مصنف کی رحلت کے چند برس بعد چھپوایا ہے جس کی حالت اپنے مقدمہ میں انہوں نے کی ہے ۱۲۸۳ھ سال طباعت ہے۔

مولوی محمد واجد ابن قاضی طہارت التوحید بلخی

مولوی محمد واجد بلخی فصیح الدین بلخی کے جدا مجد تھے۔ ذکاوت و ذہانت، خوش بیانی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فن سحراری اور شرم صغ میں اب تک آپ کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا ہے، عرصہ دماز تک منصفی کے عہدے پر مقرر رہے۔ ۱۸۵۶ء کے غدر کے زمانہ میں بقیہ اور سگولی کے اطراف میں کافی ہنگامہ تھا۔ جب باغیوں کی یورش کو دیکھ کر انگریزی حکام نے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کیا انہوں نے کہا میں اپنے علاقہ میں کسی غدر کا فساد نہیں ہونے دوں گا۔ قورڈے سپاہیوں کو ساتھ لے کر پورے علاقہ کی حفاظت اپنے ذمہ لی اور کوئی فساد اور بد امنی نہیں ہونے دی، ملازمت سے دستبردار ہو کر جب خانہ نشین ہوئے تو گورنمنٹ نے دوسروں پر یہاں ہمارے پنشن مقرر کردی جو ان کی حیات تک مقرر رہی، ۲۱ رمضان ۱۲۹۵ھ کو وفات پائی، شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی نے قطعات

تاریخ وفات حسب ذیل کہے سے

مولوی میر محمد واجد	سید نامور نیک امین
فاضل با خبر و دانش مند	صاحب عقل متین با تمکین
در زکاوت علمش بود بلند	خوبی طرز و زبانش شیریں
داشت در فن معمار شہرت	نژاد بود بغایت رنگیں
زین جہاں رفت بہ بلہ رمضان	شد دل و جان بفرقش ٹھگیں
آفتاب فلک فصل و بہر	گشتہ افسوس نہاں زیر زمیں
سال تاریخ ز روئے الہام	گفت دل رفت بہ فردوس بریں

۱۲۹۵ھ

دیگر

فاضلے رفت کہ از حد شمار	ہست اوصاف جمیلش زائد
گفت تاریخ رحلتش دل آہ	جنتی گشت محمد واجد

۱۲۹۵ھ

مولوی حمید الدین بلخی تخلص بہ اوج

مولوی حمید الدین بلخی اوج مولوی محمد واجد بلخی کے حقیقی بھائی تھے، نقوف اور شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے، فارسی میں اہل زبان تسلیم کئے جاتے تھے عرصہ دراز تک منصفی کے عہدے پر فائز رہے ۱۲۸۵ھ میں سہرام کے منصف تھے وہیں انتقال کیا اور حضرت بوڑھن دیوان کے مقبرے کے حلقے میں چوتھے کے متصل پورب جانب مدفون ہوئے۔ پختہ قبرا تک موجود ہے۔ صوفیانہ کلام کا ایک دیوان فارسی بطور یادگار ہے، جناب شاہ یحییٰ ابوالعلائی نے یہ قطع تاریخ وفات کہا تھا۔

تاریخ وفات مولوی حمید الدین بلخی اوج

اوج سنداں چوں ازیں خارزار سوئے گلستان ارم کرد راہ
 شور و فغاں رفت بہ اوج پیر حال احبا شدہ از غم تباہ
 خامہ بتاریخ وفاتش نوشت طوطی شکر شکن فارس آہ

۱۲۹۵ھ

ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے والد بزرگوار نے بھی اپنے والد بزرگوار سے ہی تعلیم پائی تھی اور وہ بھی بڑے ذی علم تھے۔ دو بار حج زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ عربی میں عربوں سے بے تکلف گفتگو کرتے تھے اور فarsi بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ آقا کمال الدین سحر طہرائی جب پٹنہ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے، علم نجوم میں بھی ایسی مہارت تھی کہ بنارس کے برہمن اکثر اگر پتر مرتب کرنے میں مشورہ کرتے تھے۔ ان کی تصنیف سے ایک مبسوط کتاب علم نجوم پر اور دوسری کتاب مصطلحات زمینداری پر یادگار ہے ان کے علاوہ ایک ناول موسوم بہ طرز معاشرت جس میں اصول لفظ صحت کو ناول کے پیرایہ میں بیان کیا گیا تھا شائع ہو کر کچھ عرصہ داخل نصاب تھا اور ایک رسالہ موسوم بہ علاج ہیضہ بھی مطبوعہ ہو کر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے سن ۱۹۱۷ء میں پینتالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حفیظ الدین بلخی

فصیح الدین بلخی کے بھائیوں میں سب سے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین بلخی مرحوم اپنے زمانہ عظیم آباد کے ایک ممتاز ادیب و شاعر تھے، ۱۸۹۷ء میں ایک گلہ ستہ موسوم بہ تحفہ بہار اپنی اور اپنے مخلص دوست حکیم فہیم الدین احمد کی ادارت میں نکالا تھا۔ اس گلہ ستہ میں داغ دہلوی اور بعض مشہور اساتذہ کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ آخر عمر میں انہوں نے خود غزلیں پڑھنا چھوڑ دیا تھا لیکن غزل کہہ کر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر جس سے ان کے طرز شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے

پھر عالم خیال ہے جولاں گہ امید ناکامیوں سے تنگ دل منتشر نہ ہو
 مؤلف تذکرہ مسلم شہزادے بہار جناب احمد اللہ نے بھی آپ کا ذکر حصہ اول میں مقدمہ آغاز سحر مجموعہ
 کلام نادم بلخی کے حوالہ سے کیا ہے۔
 تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی ۱۹۳۶ء میں ملک برما میں انتقال کیا اور وہیں بہادر شاہ ظفر
 کی طرح مدفون ہوئے۔ جناب قمر گبادی نے حفیظ الدین بلخی کی موت سے متاثر ہو کر دو قطعات
 تاریخ وفات لکھے جو اس جگہ درج کئے جاتے ہیں۔ قطعات تاریخ وفات مخدوم محترم مولوی سید
 شاہ حفیظ الدین فردوسی داد بھی سے

صوفی نامی حفیظ الدین نے
 کالے کوسوں تھے وطن سے آپ آہ
 تیسری شعبان کو وقت صبح آہ
 رہ گئی دل میں یہ حسرت اے قمر
 رد کے لکھی ہے یہ تاریخ وصال

ملک برما سے جنان کی راہ لی
 قبر بلخی حیف غربت میں بنی
 چھپ گیا مرقد میں مہر ادھی
 مرتے دم دیکھی نہ صورت آپ کی
 صاف باطن ہائے بلخی جنتی

۱۳۵۴ھ

ایضاً

خبر وطن میں یہ غربت سے آہ آتی ہے
 اریب و ماہر علم معارف و سالک
 مہر بنیر شرف نور حضرت ابراہیم
 جہاں کو اپنے دوزخ کبھ کے چھوڑ دیا
 دیا ہے داغ جدائی حضور نے کبھ کو
 یہ میرزیت کے دس دن غم میں گزریں گے
 ہوئی جو فکر قمر سال مرگ کی کبھ کو

جہاں سے اٹھ گئے افسوس کہاں بلخی
 چراغ انجمن دین عارفانہ بلخی
 گل ریاض وطن فخر خاندان بلخی
 گئے ہیں دار فنا سے سوئے جنان بلخی
 اجل نے لوٹ لیا ہائے قدردان بلخی
 تمام عمر کرے گایہ دل فغاں بلخی
 کہا یہ دل نے کہ فردوس آشیاں بلخی

۱۳۵۴ھ

جناب کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف (خودنوشتہ سوانح حیات) میں جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم کی باکمال تین ابتدائی غزلیں درج کی ہیں، موصوف نے حفیظ الدین بلخی کا ذکر اپنی کتاب میں کافی التزام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیم صاحب کے بڑے چچا کلیم الدین احمد فہیم سے جناب حفیظ الدین بلخی کے بہت ہی مخلصانہ تعلقات تھے، موصوف نے اپنی کتاب "اپنی تلاش میں" یہ لکھا ہے کہ جناب حفیظ الدین بلخی کا کچھ کلام ان کے چھوٹے صاحبزادے رفیع الدین بلخی مرحوم کے پاس تھا، رفیع الدین بلخی مرحوم نے اپنے والد محترم کی کچھ غزلیں جناب کلیم الدین احمد کو دینے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس درمیان جناب رفیع الدین بلخی کا انتقال ہو گیا۔ بہر حال کلیم الدین احمد جناب حفیظ الدین بلخی کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

”تحفہ بہار میں مجھے تین غزلیں حفیظ چچا کی ملی تھیں میں نے کہا ان کی طبیعت مشکل پسند تھی لیکن ان غزلوں میں مشکل پسندی نہیں جو ان کی بعد کی غزلوں میں ہے جن میں اکثر معنی کی تلاش دشوار ہو جاتی ہے۔ اکثر غزلیں مل جاتی ہیں تو فرق نظر آتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا داغ کس طرح ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے یہ تین غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں اس لئے کہ یہ محفوظ ہو جائیں ان غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بلخی تخلص کرتے ہیں۔“

سکر سوال بوسہ کچھ ایسا خفا ہوا	تیر چڑھی ہوئی ہے تو منہ ہے بست ہوا
ورد فراق و ذوق وصال پری رھاں	سرکار عشق سے مجھے کیا کچھ عطا ہوا
الشرے پاس داشت کہ صورت بدل گئی	بزم طرب میں نالہ مرا تہقہ ہوا
حال دل شکستہ پہ رویا جو بیوفا	آنسو کا قطرہ دل کے لیے مویا ہوا
ہاں ہاں پکار کر یوں کہوں گا کہ نا ہوا	جو بت سے بے نیاز ہوا وہ خدا ہوا
جان چشم یار نے لے لی کتاب میں	تیر نگاہ یار بھی تیر خطا ہوا

لہ: ملاحظہ ہو "اپنی تلاش میں" (خودنوشتہ سوانح حیات مصنفہ کلیم الدین احمد)

جائے کا دل کے آنا تو محض ضرور ہے
تو جو ملا رقیب سے اس کا گلہ ہی کیا
جاتا تو میکدہ سے ہے زائد مگر بتا
بلخی بنے ہیں کب سے مرے غمگسار آپ
مدت کا تھا رفیق سو وہ بھی جدا ہوا
پر فن کبھی کسی کا بھی تو آشنا ہوا
حق جناب پیر مغاں بھی ادا ہوا
جو روحنا و ظلم جو مجھ پر سوا ہوا
حفیظ الدین بلخی مرحوم کی یہ غزل گلہ ستہ تحفہ بہار ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

دیگر

جو کیا اچھا کیا پھر ہے پشیاں کیا
دیدنی اپنی بہر نوع تھی تجھے مد نظر
تم بھی گلگشت کو آؤ مجھے دیکھو تو سہی
فرقت وصل و غم ہجر نے کی دل میں جگہ
بیعت عہد وفا کی ہے بدست گیسو
عمر کاٹی تیرے وحشی نے بدشت غربت
موت آتی ہے چو سحراں میں پلٹ جاتی ہے
بوالہوس تجھ پہ جو مرتے ہیں محبت جھوٹی
دھوکا کھانا مرے در دیا سے زائد
سراڑے کا دیا پہلے تو جلاد کو حکم
قتل پر میرے ہوا سرگرمیاں کیا
شعلہ طور کہاں موسیٰ عمراں کیا
دل کے داغوں نے کھلایا چنتاں کیا
خانہ آباد ہوا خانہ ویراں کیا
تیرا وحشی بھی ہوا سلسلہ جنباں کیا
کوچہ زلف سے کیا خانہ ویراں کیا
سخت جاں تو نے بنایا غم جاناں کیا
حسرت وصل کسے ہے تیرا رماں کیا
کافر عشق صنم ہوں میں سلماں کیا
تیغ کھینچ کر اتم نے ہے نالاں کیا

پاس ناموس محبت ہوا درنہ بلخی

دیدہ نرے اٹھا رکھا تھا طوفاں کیا

دیگر

تم دیکھنے آئے تھے تماشہ میرے دل کا
اندر میرے اس شکر خود آرائی کو مت پوچھ
جو آپا، فلک مجھ کو لٹکے کر بگاڑے
ہاں اور ہوا جاتا ہے نقشہ میرے دل کا
اس بت نے بنایا ہے کلیسا میرے دل کا
منے کا نہیں نقش تمنا میرے دل کا

آنکھوں سے مری خون کی سبز ہار رواں ہے اُنڈا ہی چلا آتا ہے دریا میرے دل کا
 تم جانے بھی پوچھو بھی پوچھو بھی پوچھو بھی سونے کا ملمع نہیں سودا میرے دل کا
 میکھے گا شہرِ قبر سے میری پس مردن رنگ لائے گا اک روز یہ سودا میرے دل کا
 نالے نہیں ملتے کبھی وحشت میرے دل کی کھویا نہیں جاتا کبھی سودا میرے دل کا
 جب کہ گذر اس میں بتوں کا ہوا بلخی اجڑا سا نظر آتا ہے کعبہ میرے دل کا

عزیز الدین بلخی

شیخ الدین بلخی مرحوم کے منجھلے بھائی جناب عزیز الدین بلخی تھے انہوں نے اپنی ساری عمر زبان و ادب کی خدمت میں گزاری، ابتدائی تعلیم حکیم احمد حسن صوفی صاحب کے مدرسہ میں پائی اور اس کے بعد انگریزی تعلیم محمدن اینگلو عربک اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں ایک ماہوار ادبی رسالہ "رفتار زمانہ" جاری کیا جس کو نواب حسن الملک مرحوم سکریٹری علی گڑھ کالج کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس پرچہ کے بنیاد پر ایک مبسوط کتاب فن عبارتہ باری اور مولیٰ جہاز دانی پر لکھی جس کا نام "انسان کی پرواز" ہے اور اردو زبان میں اس فن پر پہلی کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب "تاریخ شعرائے بہار" ہے اس میں سن ۱۳۰۰ھ تک کے تمام شعرا کا ذکر ہے اور اس کی دوسری جلد ۱۳۰۱ھ سے لے کر ۱۳۵۰ھ میں تمام شعرائے بہار کے حالات اور مولیٰ کلام درج ہیں لیکن دوسری جلد ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہے کیوں کہ کاتب تعذیر نے آپ کی عمر کا دفتر تمام کر دیا۔ کچھ عرصہ تک اپنے اخبار "اتحاد وطن" کے ادارہ کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی تھی، چنانچہ آپ کے انتقال پر اخبار "اتحاد" نے ۱۹۳۵ء کے پرچہ میں ایک خاص مضمون لکھ کر اظہارِ تاسف بھی ظاہر کیا تھا۔ جناب عزیز الدین بلخی مرحوم نے بتاریخ ۱۹ شوال مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء روز جمعہ انتقال کیا اور مقام کچی درگاہ جھولی مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت کے مزار سے کچھ دور خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ کی موت سے متاثر ہو کر جناب قمر گیا دی مرحوم اور جناب مولوی محمد احسان حسن احسان رئیس رسول پور ضلع مظفر پور نے قطعات تاریخ لکھے۔

قطعات تاریخ وفات مولوی عزیز الدین بلخی راز مرحوم از جناب قمر گیاروی :
 عزیز الدین بلخی اٹھ گئے دینائے فانی سے
 وہ بلخی کون جو تھے صوفیوں میں ادب و بلخی
 قمر خادم ہے تو اولاد ابراہیم ادب کا
 دعائے مغفرت کر حق سے بہر مستقی بلخی
 سرمد فن مدا آتی ہے یہ ڈاکر کے کانوں میں
 پڑھو تم فاتحہ یہ ہے مزار جنتی بلخی

۱۳۵۳ھ

دیگر

دا درینا کہ بزم دنیا کو
 کر گئے تم اداس حیف عزیز
 لکھی رو کر قمر نے یہ تاریخ
 بلخی حق شناس حیف عزیز

۱۳۵۳ھ

قطعه تاریخ وفات مولوی عزیز الدین بلخی راز مرحوم از جناب مولوی محمد
 احسان حسن احسان رئیس موضع رسول پور ضلع مظفر پور
 فرید الدہر عزیز الدین بلخی
 ادیب کامل و مشہور آفاق
 علیم و پارسا و صاحب دل
 فرشتہ صورت و سیرت اخلاق
 در پناہ رفت جنت از دار فانی
 کہ جو ان جناں بودند مشتاق
 بسال نقل از احسان گفتم
 عزیز الدین، ہشتی نور آفاق

۱۳۵۳ھ

حضرت قمر گیاروی کے برادر خرد مولوی محمد تفضل حسین فراق نے بھی مندرجہ ذیل قطعه لکھا ہے

قطعه

عزیز الدین بلخی نے قضا کی
 یہ سکر مضطرب ہے قلب پر غم
 فراق خستہ نے لکھی یہ تاریخ
 ہشتی بحر احسان نور ادب

۱۳۵۳ھ

نمونہ کلام

رازِ بلخی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ابتدا میں فارسی زبان میں شعر زیادہ کہتے تھے چنانچہ ان کا ایک فارسی قصیدہ رفتارِ زمانہ میں بھی شائع ہوا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔
 ز قطرہ ہائے ژالہ چرخ است اشکبار مردانہ گو مرے است کہ بر گل شود نثار
 جناب ضیاءِ عظیم آبادی اکثر ان کا کلام سننے کو اور خود اپنا کلام سناتے کو رازِ بلخی کے گھر پر تشریف لاتے تھے، مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی (دیس یگانہ چنگیزی) بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

نمونہ کلام

آنکھیں لڑا کے دل سے بڑھاتی ہے میل تو کیا ہی نگاہِ یار سے دیدہ دلیل تو
 سایہ کی طرح ناقہ یلی بھی ساتھ ہو اے جذبِ شوق قیس جو کھینچے نکیل تو
 اے قیس راہِ عشق کی تکمیل ہم نے کی جاہ پہ رکھ گیا تھا فقط داغِ بیل تو
 صبحِ شب وصال یہ کہتا گیا وہ شوح گر عیش اٹھائے ہیں تو مصیبت بھی بھیل تو
 اے دل ان آنکھوں کے کبھی چشمِ وفانہ رکھ نادان ان تلواروں میں نہ پائے گی کا تیل تو
 منڈھتا ہے رازِ عشق کو اپنے گلے عبث نادان منڈھے چڑھانہ سکیگا یہ بیل تو

دیگر

آتے آتے مرے گھر تک وہ لٹک جاتے ہیں ملتے ہیں راہ میں غیروں کے محلے پہلے
 مچھو کہ یہ کد ہے دمِ نزع وہ آئیں اس دم ان کو یہ ضد ہے کہ دم اس کا نکلے پہلے
 بادہ نو کا ابھی ذکر ہی کیا ہے ساتی آخری جام بھی تلچھٹ کا تو جتن لے پہلے
 ضبطِ فریاد سے کچھ رازِ محبت نہ چھپا کھل پڑے آنکھوں کے اشکوں کے دھڑلے پہلے

نہ پوچھ مجھ سے کہ فرقت میں کیا گذرتی ہے ستم گذرتا ہے مجھ جفا گذرتی ہے
 یہ نارسائی قسمت کہ مرے پر بھی ہماری خاک سے بچ کر صبا گذرتی ہے

راز بلخی مرحوم کی مندرجہ ذیل غزل رسالہ تحفہ بہار بابت فروری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔

یہ موصوف کا بالکل ابتدائی کلام ہے۔

اپنی آنکھوں میں یہ ہیں شعلہ باراں کیسا
 اپنے دل کے بخارات میں طوفاں کیسا
 رنج ہے ہوتی ہے کیم سے مکاں کی رونق
 دشت بھی قیس کے مرنے سے دیواں کیسا
 اب لہو آتے ہیں آنسو کے عوض آنکھوں میں
 رنگ لائے ہیں مرے دیدہ گریاں کیسا
 وعدہ کرنا تھا تم کو تو سمجھ کر کرتے
 کیسا بھگڑا ہے مری جاں یہ نہیں ہاں کیسا
 آج پہلو میں مرے راز جو آبیٹھے ہیں
 کیسی حسرت ہو مرے دل میں جو ارماں کیسا
 جناب مولوی احمد اللہ ندوی نے اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں آپ کا ذکر

شرد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

نظام الدین بلخی

فصیح الدین بلخی کے سنبھلے بھائیوں میں جناب سید نظام الدین بلخی مرحوم ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ آپ کی پیدائش ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء میں عظیم آباد کے مشہور محدث غنشی میں ہوئی جناب بلخی نے اپنے والد ماجد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم حکیم صوفی صاحب کے مدرسہ سے حاصل کی پھر انگریزی سیکھنے کے لئے سنہ ۱۹۰۰ء پر پرنس کے پاس گئے جو پادری کی جوبلی میں رہتی تھیں۔ جن کی تعلیم انگریزی مادری زبان جیسی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد پٹنہ سیٹی محمدن اینگلو عربک اسکول میں شریک ہو کر سنہ ۱۹۰۷ء میں انٹرنس کے امتحان میں اول آئے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں اول نمبر لانے کے صلہ میں کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو سونے کا تمغہ دیا۔ پھر پٹنہ کالج میں ایف۔ اے میں داخل ہوئے لیکن والد بزرگوار کی ناگہانی موت نے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا اور کالج چھوڑنا پڑا چنانچہ ۱۹۰۷ء میں مولانا شجاعت علی خاں کی وساطت سے پٹنہ سیٹی اسکول میں مدرس ہوئے پھر مختلف مدارس کو طے کرتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں آپ کا تبادلہ پٹنہ ہائی اسکول گردنی باغ میں ہوا جہاں سے آپ ریٹائر ہوئے، جناب مولوی سید احمد اللہ ندوی نے آپ کا ذکر اپنی کتاب مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں شرد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

آپ کی شاعری میں حضرت داغ دہلوی کے باضابطہ شاگرد ہونے، شاگردی کا سلسلہ کافی دنوں تک خط و کتابت سے جاری رہا اور حضرت داغ جب عظیم آباد تشریف لائے تو آپ بھی ان کے دبستان میں شامل ہوئے، داغ کی استاد کی کاغذ اس شعر میں فرماتے ہیں ۵

جناب داغ نکایہ فیض کم نہیں۔ بلنہی سخن زبان کے لئے ہے زبان سخن کے لئے

آپ کی وفات ۱۹۶۶ء میں بھر چور اسی سال ہوئی، شاعری میں آپ اپنا تخلص نظام اور بلنہی دونوں فرماتے۔ آپ کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے آپ کو موصوف کی زبان اور خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکے ۵

فسرہ دل ہے نہ خلوت نہ انجمن کے لئے
یہ بھول بھی تو ہے کانسائبرک چن کے لئے

بہن لیا تھا کسی وقت جامہ ہستی
اجل کھڑی ہے اُسی جائے کہن کے لئے

اجل پلٹ گئی منہ پھیر کے جو یہ دیکھا
کہ ایک تار بھی باقی نہیں کفن کے لئے

مزد صبح پہ کیا حال شمع کا ہوگا
تمام رات جو روئے گی انجمن کے لئے

الہی الاماں راز دل افسانہ ہوتا ہے
قیامت کی قیامت آشنا بیگانہ ہوتا ہے

یہ مصرعہ لکھ دیا پیر مغاں نے میری تربت پر
ہمارے مے گساروں کا بھی بیجانہ ہوتا ہے

ٹرپنا، ٹوٹنا، اکٹنا، سلجھنا، جان سے جانا
پریشانی میں جو ہوتا ہے بے تابانہ ہوتا ہے

تغزل اب کہاں فیض جناب داغ ہے بلنہی
تمہارا شعر جو ہوتا ہے استادانہ ہوتا ہے

سراپا عشق ہے بلنہی سراپا دل نہ بن جائے
بھرا گھر لوٹ میں اجڑی ہوئی منزل نہ بن جائے

اسی کو وہ بھری محفل میں فرمانہ سمجھتے ہیں
جو ہستی کو عدم عالم کو افسانہ سمجھتے ہیں

کچھ ایسی خود نمائی ہے کچھ ایسے آپ بخود ہیں
نہ آبادی سمجھتے ہیں نہ دیرانہ سمجھتے ہیں

سمجھنے والے ہی کچھ جانتے ہیں عاشقی کیا ہے
نظام الدین بلنہی کو جو دیوانہ سمجھتے ہیں

عظیم آباد کے مشاعرہ کی رپورٹ کے باعث تلاش و جستجو کے سلسلہ میں جناب نظام الدین بلخی مرحوم کی تین نایاب غزلیں ملیں وہ بدیہ ناظرین ہیں۔

غزل اول

غزل اول رسالہ تاج گیا مدیر آنجنابی جگیش پر شاو خلس ماہ و ستمبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی
حشر میں داد طلب ہوئی نہ چاہت میری
جلوہ حسن ہوں تصویر ہے صورت میری
میری تقدیر سے اچھی رہی الفت میری
دور چلتے رہے دل کی صفائی دل میں
دے کے مئے پوچھ لیا کرتا ہے ساقی مجھ سے
بیٹھے بیٹھے اٹھ جاتا ہے دل دنیا سے
دست وہ دوست جو مصیبت میں آئے آئے
اٹھتے اٹھتے بھی قیامت کا زمانہ ہوگا
اور نالہ ہو میری آبلہ پائی مجھ سے
پھر خزاں آئی دے پاؤں جلا صحر کو
آپ سے آئے جو وہ آپ ہی آتے بلخی

میں کہیں جلوں کہیں جاہنگی غیرت میری
صورت آئینہ حیرت ہے حقیقت میری
مرگیاں میں تو یہ کہتے ہیں کہ قسمت میری
آخری جام کا ٹھٹھ ہے کدورت میری
کیوں نظر آتی نہیں جام میں صورت میری
رہتے رہتے بھی نکل جاتی ہے حسرت میری
غم وہ غم جو کہے ہجر میں شرکت میری
حشر یہ ہوگا کہ مٹ جائے گی تربت میری
اور کانٹوں میں گھسیٹے مجھے رشت میری
پھر بہار آئی اچھلنے لگی وحشت میری
غیر ہوتی تب فرقت میں نہ حالت میری

غزل دوم

یہ غزل ماہنامہ المصباح پٹنہ مدیر شاقب عظیم آبادی مرحوم اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی راقم
الحروف کو یہ غزل جناب شکیب ایاز کے سعی سے حاصل ہوئی۔

محبت پاؤں پڑی ہے رہا چلتا ہے دل اپنا
تمہیں یہ داغ دے تو یہ تمہاری تیرہ بختی ہے
قدم اس راہ میں کیوں کر بڑھائے پا بہ گل اپنا
ہمارا رنگ روغن کیا ہی چہرہ پہ تل اپنا

کہ جیسے انجن میں سر اٹھائے مضحل اپنا
ہر اک تار گریباں بن گیا پتھر کی سل اپنا
چارغ زلیست بکھبتے پھر ہے مشتعل اپنا
زمانہ چاہتا ہے اک ٹھکانا مستقل اپنا
کہاں جائے یہ سب سامان لیکر مستقل اپنا
سہارا ڈھونڈتا پھر تا ہے ہر یک مشتعل اپنا
تمہارے دل کا کیوں پیوند ہو عہد گسل اپنا
اسی گھر سے کہیں تھا ہم نشین گھر متصل اپنا

نہ سنتا کچھ نہ سنتا یہ تو ہم کو لوگ کہتے ہیں
نظام الدین بلخی کہ رہا ہے حال دل اپنا

غزل سوم

طریق عشق میں سرگرم جستجو نکلے
کہیں جنوں میں جو مجنوں کے منہ سے ہو نکلے
اب اس کو کیا کر دل کوئی جو حیلہ جو نکلے
کہاں سے آئے رگ جان میں جو ہو نکلے
خزاں کے دور میں کیا شوق رنگ ہو نکلے
پیا سے آئے ہیں اچھا سا اک سب ہو نکلے
شکستہ جام تو ٹوٹے ہوئے صبو نکلے
وہی بہشت ہے اپنی جہاں پہ تو نکلے
گناہگار ہوں بس منہ سے تو ہی تو نکلے
نیاز مندوں کی اتنی تو آرزو نکلے

دل ناکام مقتل دیکھ کر یوں بیٹھ جاتا ہے
گلا گھٹاتا ہے سحر یار میں وحشت اچھلتی ہے
امیدیں تیل ٹپکاتی ہیں دل پر چشمِ حشر سے
عدم سے کچھ نہیں چل دیکھ لو منہ پھرتے کیوں ہو
ہجومِ یاس ہے دردِ عالم ہے رنجِ فرقت ہے
کسی کے ظلم نہاں سے ہے اک جگر زمانے کو
بنایا ہے ازل نے اس کو پچا ہا دلفگاروں کا
نکل کر فائدہ دل سے کہوں کیا مجھ پہ کیا گذری

میری بلا سے کوئی دوست یا عدو نکلے
کسی کے منہ سے کبھی آپ تم نہ تو نکلے
زبان لے ہی چکا تھا زبان بھی دیدی
فسراق یار میں پتہ بھی ہو گیا پانی
بہارِ عیش کے دن اب کہاں سے آئیں گے
کھلا ہو پر مغاں کا سبیل جاری ہے
ہمارے بعد نہ پوچھو کہ کیا تھا میخانہ
مکان کی قید نہیں لا مکان کی شرط نہیں
دمِ اخیر ہے الشر تو بہ واستغفار
یہ آرزو ہے کہ اب دل میں آرزو نہ رہے

نکل کے دیکھ چکیں حسرتیں تو حشر اپنا
 اب آرزو کی تمنا ہے آرزو نکلے
 کبھی کسی کو تمہارا سراغ سمجھ نہ ملا
 تمہارے چاہنے والے جو چار سو نکلے
 ہماری خاک کا دنیا میں کیا ٹھکانہ ہے
 صبا تلاش میں ناحق نہ کو بہ کو نکلے
 ہماری فصد نہیں اپنی فصد لے جراح
 تپ درونِ رگ جال سے کب لہو نکلے
 جلا ہے شوق شہسودت آج پھر بلخی
 الہی کو چہر قاتل سے سرخرو نکلے

سید شاہ قمر الدین بلخی

فضیح الدین بلخی مرحوم کے چچا زاد بھائیوں میں جناب قمر الدین بلخی بھی شعرا و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ جناب قمر الدین بلخی مرحوم جناب شرف الدین بلخی مرحوم کے صاحبزادے تھے، آپ کی ایک غزل رسالہ 'تحفہ بہار' بابت فروری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی جو درج کی جاتی ہے۔ آپ شاعری میں اپنا تخلص قمر فرماتے تھے۔ غزل کے اشعار خود ثابت کریں گے کہ آپ کتنا اعلیٰ شعری مزاج رکھتے تھے، غزل

یہ ہے

ایک تیرے نہ ہونے سے ہے دیراں کیسا
 یعنی سونا نظر آتا ہے شبستاں کیسا
 تہر کی عقل پہ بجلی گری آفت ٹوٹی
 دل کے داغوں میں ہوا سوختہ رباں کیسا
 کوچہ یار جو جنت میں کبھی یاد آیا
 مجھ سے جھگڑا کیا در حیلہ روضاں کیسا
 حوصلے دل کے ہوئے پست ہجوم غم سے
 بوجہ سر پہ گرایا شب ہجران کیسا
 خون دل پیتا ہوں میں مئے احمر کی عوض
 یہ انصاف ترا ساقی دوراں کیسا
 دل جگر دونوں ہی چھیک میں نگہ کے پر کیاں
 ناوک انداز ہوا دیدہ جاناں کیسا
 سچ ہے وابستہ کیوں سے ہے مکاں کی رونق
 بن تہے مجبکہ دل ہو گیا دیراں کیسا
 رو برو وہ رخ روشن کے جو ہوتا ہے کبھی
 زرد پڑتا ہے رخ مہر درخشاں کیسا
 عرض حال دل غمگیں جو سنا اس نے قمر
 ٹٹا جانا ہے اس کا رخ تا ماں کیسا

رفیع الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے بھتیجے جو ان کے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے یعنی جناب سید رفیع الدین بلخی کا نام کئی ادبی دنیا میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ موصوف پٹنہ کے ایک مشہور قانون دان تھے۔ اپنے پیشہ قانون میں رہنے کے باوجود علم و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ غالب کی شاعری اور فن سے متعلق موصوف نے ایک کتاب ”تجزیہ کلام غالب“ لکھی، یہ کتاب پاکستان کے ایک ادبی ادارہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آف پاکستان ایجوکیشنل کالونی کراچی سے شائع ہوئی، اس کتاب کو شائع کرنے کا سہرا پاکستان کے ایک مشہور علم دوست جناب سید الطاف بریلوی کے سر ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ جناب سید علی حسنین زبیر آردو لوی نے لکھا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں غالب کی شاعرانہ مقبولیت سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں غالب کی عشقیہ شاعری سے متعلق خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں غالب کے نظریہ زندگی کی نشاندہی کی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں غالب کے مضامین فلسفہ کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یوں تو آج غالب کی شاعری سے متعلق اردو کے نامور ناقدوں اور محققوں نے اپنے اشتہار قلم درٹائے ہیں جن کا تعلق ہند و پاک سے ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر عبدالرحمن بخاری مرحوم، پروفیسر احتشام حسین مرحوم، پروفیسر مجنوں گورکھپوری مرحوم، ڈاکٹر یوسف حسنین خاں مرحوم، جناب فاروقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں اور محققوں میں جناب قاضی عبدالودود مرحوم، جناب امتیاز علی خاں عری مرحوم اور جناب کالی داس گیتارضا کی شخصیتیں قابل احترام ہیں، لیکن یہ کتاب غالب کی شاعری سے متعلق ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب ڈیمائی سائز پر دو سو آٹھ (۲۰۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

رفیع الدین بلخی کے قریبی دوستوں میں جناب محمد ایوب ایڈووکیٹ مرحوم، علامہ جمیل منظہری مرحوم، جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم اور جناب سید جعفر امام مرحوم کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا استاد سبحانی جب بھی پٹنہ تشریف لاتے تھے تو موصوف سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔

افسوس یہ ہے ایسے قیمتی وجود کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور صرف تریپن (۵۳) سال کی عمر میں ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے انتقال پر ملال پر بزم احباب پٹنہ اور دوسرے اداروں نے جلسہ ہائے تعزیت میں اظہار غم و اندوہ کی تجاویز میں منظور کیں اور ان کے شعراء احباب نے قطعات تاریخ وفات لکھے۔ اس موقع پر علامہ جمیل منٹھری مرحوم نے جو دردا نگیز نظم تحریر فرمائی وہ درج ذیل ہے۔

حیف اے ساقیٰ منجائے اخلاص رفیع	بزم احباب ہے اک بزم عزائیرے بعد
شامِ اجڑی ہوئی بیوہ کی طرح سوگ نشیں	جام ابلے ہوئے میناسے خفا تیرے بعد
کس قدر ست ہے آہنگِ فائے ہر ساز	کس قدر گنگ ہے محفل کی فضا تیرے بعد
موت نے ہم سے تجھے لے ہی لیا آخر کار	ہوئی رسوائی ناموس و فائیرے بعد
بجھ گیا دلولہ دوست نوازی لے دوست	کیا جئے حوصلہ مہر و فائیرے بعد
وائے محرومی جذبات خلوص و ایثار	وائے افسردگی صدق و صفائیرے بعد
جمع ہوں آ کے جہاں مختلف الذوق احباب	آج ایسا کوئی مرکز نہ رہا تیرے بعد
یاد آیا ہمیں بے ساختہ غالب کا وہ شعر	جس کے الفاظ کو مفہوم ملا تیرے بعد

تو تھا گلدرست احباب کی بندش کا گیاہ
منستر ہو گئے تیرے رفقا تیرے بعد

یوسف الدین بلخی باطن

جناب یوسف الدین بلخی باطن مرحوم بلخی صاحب مرحوم کی بڑی ہمشیرہ بی بی مریم مرحومہ کے سنبھلے صاحبزادے تھے، آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالحی بلخی تھا، آپ کا وطن موضع سائیں ضلع پٹنہ تھا، انہوں نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے اردو فارسی میں کیا۔ کافی دنوں تک مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ملازمت سے منسلک رہے۔ اس کے بعد آپ کی بھالی گورنمنٹ رانچی کالج رانچی میں بحیثیت لکچر اردو فارسی ہوئی، جہاں سے آپ نے ریٹائر کیا۔ موصوف علم و ادب میں اچھا خاصہ ذوق رکھتے تھے۔ موصوف کے ادبی مضامین صوبہ بہار کے مختلف رسالوں میں گاہے گاہے شائع

ہوتے تھے۔ شاعری کی طرف بھی آپ کی طبیعت کا میلان تھا اور باطن نخلص فرماتے تھے۔ آپ کا وصال
۱۹۷۲ء بمقام جمشید پور ہوا۔ (باقی باطن بلخی ص ۱۰۰ پر)

ڈاکٹر سید محمد اسحاق بلخی واقف

سید محمد اسحاق بلخی مرحوم فصیح الدین بلخی مرحوم کی بڑی ہمیشہ بی بی مریم مرحومہ کے سب سے چھوٹے
صاحبزادے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالحی بلخی تھا۔ موصوف کا وطن موضع سائیں ضلع پٹنہ تھا ڈاکٹری
پیشہ سے منسلک رہنے کے باوجود موصوف شعر و شاعری سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، تقسیم ہند کے بعد آپ
سابق مشرقی پاکستان تشریف لے گئے، ”رزی مرض سرطان میں مبتلا ہوئے چنانچہ علاج کے سلسلہ میں
انگلینڈ بھی تشریف لے گئے۔ لیکن عمر کی لگ بھگ پچاس منزلیں طے کر چکے تھے کہ آپ کا انتقال ۱۹۶۵ء
میں ہو گیا، جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کی طبیعت نظم نگاری کی طرف زیادہ مائل تھی اور اپنی
نظموں کو موصوف مسدس کے پیرایہ میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے چنانچہ ان کی شاعری میں میر انیس
اور حکیمت کا نمایاں رنگ موجود ہے، جناب احمد الشرنودی نے اپنی کتاب تذکرہ سلم شعرائے بہار جلد
ششم میں (یہ جلد جو ضمیمہ کی شکل رکھتی ہے) آپ کا ذکر کیا ہے۔ اسحاق بلخی شاعری میں اپنا نخلص واقف
فرماتے تھے، آپ کی ایک نظم بعنوان (پریم) رسالہ فطرت راجگیر جولائی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی جو
درج ذیل ہے۔

پریم مکم

نہ سمجھا ہے کوئی اب تک نہ سمجھے گا کہ کیا ہے یہ کسی کی کشتی عمر رواں کا نا خدا ہے یہ

کبھی تو عاشقوں کے خانہ دل کی ضیا ہے یہ کبھی راحت کبھی آفت کبھی رنج و بلا ہے یہ

کوئی گرداب کہتا ہے کوئی ساحل کہتا ہے

کوئی دادی، کوئی صحرا، کوئی منزل کہتا ہے

کبھی یہ باعث جور و جفا ہے آسمانی ہے کبھی وجہ سرور و انبساط و شادمانی ہے

سکون قلب پیری ہے بزور نوجوانی ہے کسی کی موت کا باعث کسی کی زندگانی ہے

غم و اندوہ و یاس و ناامیدی کا سبب ہے یہ
 بنائے آفت ظلم و ستم قہر و غضب ہے یہ
 دل مشتاق میں بنتا ہے گھر تیر نظر بن کر
 کبھی تو درد دل بن کر کبھی زخم جگر بن کر
 بھڑکتا ہے کبھی سینہ میں ہر سو یہ شر بن کر
 سوز دل کے کاشلنے کو کرتا ہے قمر بن کر
 زبان شوق پر حرف تمنا بن کے آتا ہے
 کبھی یہ برق بن کر دل کے خرمن کو جلاتا ہے
 کبھی ہوتا ہے ظاہر آنکھ سے سیل رزا بن کر
 چپا رہتا ہے سینہ میں کبھی سوز نہاں بن کر
 کبھی آتشکدے میں دل کے رہتا ہے دھواں بن کر
 کبھی تو ٹوٹ پڑتا ہے یہ سر پر آسماں بن کر
 کسی کو اس سے حاصل گو ہر مقصود ہوتا ہے
 کوئی اس کی بدولت نیست و نابود ہوتا ہے
 اسی نے خون کے آنور لایا یہ کینواں کو
 جلاتا ہے یہ اپنی آگ میں شمع شبستاں کو
 اسی کا فیض پاتا ہوں نگاہ خستہ سماں کو
 جیسے کو چشم کو ابرو کو اور ہر زلف پیچاں کو
 نئے پُر جوش ہے یہ دل کے پیلنے میں رہتا ہے
 حرم میں، دیر میں، کعبہ میں بت خانے میں رہتا ہے
 اسی میں مبتلا پاتا ہوں میں شیخ و برہمن کو
 یہ وہ جذبہ ہے جو رہبر بنا دیتا ہے رہن کو
 سکھاتا ہے نئے طرز ستم یہ چشم پر فن کو
 ادا کو ناز کو انداز کو شوخی کو جستون کو
 یہ وہ طاقت ہے جس نے آگ کو گلشن بنا ڈالا
 دل تاریک کو آئینہ رد کشن بنا ڈالا
 عموماً ابتدا میں یہ سرور انگیز ہوتا ہے
 غضب ہوتا ہے جب یا گ بن کر تیز ہوتا ہے
 یہی تو انتہا میں گرے خون ریز ہوتا ہے
 جنوں افزا ستم پر در قیامت خیز ہوتا ہے

جو اس کا زخم کھاتا ہے ہمیشہ یاد کرتا ہے
 کبھی ناد کبھی گریہ کبھی فریاد کرتا ہے
 کبھی یہ رحم کرتا ہے کبھی بیداد کرتا ہے
 کبھی یہ خانہ آباد کو برباد کرتا ہے
 نئے اس کے مظالم ہیں سرائے جو ہیں اس کے
 مگر رحم و کرم کے بھی طریقے اور ہیں اس کے

ہٹاؤں کیا تمھیں اس کا اثر کس سر زمین تک ہے
 غرض یہ ہے کہ فرش خاک سے عرش بریں تک ہے
 جہاں مرغ تصور جا نہیں سکتا ہیں تک ہے
 جو ڈوبا اس سمندر میں نہیں پھر وہ ابھرتا ہے
 اسی کی ہے بقا لیکن جو اس میں ڈوب مرنے لگتا ہے

اگر اس کی فیصلے دل سراپا نور ہو جائے
 جو اس جذبہ سے دل انسان کا معمور ہو جائے
 تو سینہ میں یقیناً جلوہ صد طور ہو جائے
 مصیبت ہر طرف ہو جائے آفت دور ہو جائے

یہ ہی قیس بیاباں کے دل رنجور میں بھی تھا
 یہ ہی درپردہ پنہاں نعرہ منصور میں بھی تھا
 نہ پوچھو ابلے مرے ہدم اثر اس کا کہاں تک ہے
 عدم سے بحر مستی تک زمین سے آسمان تک ہے
 غرض ناچیز بندے سے خدا کے دو جہاں تک ہے
 خدایا پریم کی تو کاش دنیا ہی بنا دیتا
 کلیسا کا حرم کا دیر کا جھکڑا مٹا دیتا

جناب مولوی احمد اللہ ندوی : اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم میں جناب
 اسحاق بلخی واقف صاحب متعلق یہ لکھتے ہیں ۔

”سید محمد اسحاق بلخی واقف متوطن موضع سائیں ضلع پٹنہ ایک خوش گو شاعر ہیں۔“

لے ملاحظہ ہو تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم مصنفہ مولوی احمد اللہ ندوی

جناب احمد الشندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم میں واقف بلخی کی ایک نظم پیش کی ہے جس کو شاعر موصوف نے لندن کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی یہ نظم شاعر نے اپنی صاحبزادی کی رخصتی کے موقع پر پڑھی تھی۔ اس نظم میں جذبات نگاری کی ایک کامیاب مثال ہمیں ملتی ہے۔

صبح وداع

نسیم صبح چلی ہے کہ باد صحر ہے جن میں مائل پڑ مردگی گل تر ہے
 پہاڑ رنج و الم کا دل حزن میں پر ہے صبا نہ چل کہ یہ وقت وداع دختر ہے
 نہ زندگی میں مسرت نہ لطف جینے میں
 تڑپ رہا ہے دل بے قرار سینے میں
 یہ سبزہ زار یہ ٹھنڈی ہوا ارے توبہ جن، یہ بھول، یہ کالی گھاٹ ارے توبہ
 یہ دلفریب سماں یہ فضا ارے توبہ خدا کے واسطے ان کو ہمارے توبہ
 دم و دارع ہے واقف دم سرور نہیں
 یہ صبح وہ ہے کہ خورشید میں بھی نور نہیں
 ابھی تو طفل تھی آغوش میں یہ پلتی تھی یہ کل کی بات ہے گھٹنوں کے بل یہ چلتی تھی
 ابھی ہنسی، ابھی روئی ابھی مچلتی تھی ابھی تو چند کھلونوں سے یہ بہلتی تھی
 سمند وقت کہاں سے کہاں پہ جا پہنچا
 خدا کی شان کہ وقت و دارع آپہنچا
 گلے سے ماں نے لگایا لگا کے چھوڑ دیا خود اپنے ہاتھ سے شیشے کو اپنے ٹوڑ دیا
 کسی نے جسم کا آنکھوں سے خوں چھوڑ دیا کسی نے ماں کی محبت کو بھی جھنجھوڑ دیا
 مکیں تو رو رہے ہیں مکاں بھی روتا ہے
 نقاب ابر کی ہے آسماں بھی روتا ہے
 یہ جانتا ہوں کہ دختر تو میرے گھر کی نہیں تو چند روز کی مہاں ہے عمر بھر کی نہیں

پدر کے گھر میں پٹی ہے مگر پدر کی نہیں یہ گرچہ نخت جگر ہے مگر جگر کی نہیں

پٹی یہاں تو وہاں جا کے گھر بساتی ہے

کہ آشیاں سے چلی ہے چین کو جاتی ہے

چمن میں سر وہی قمری بھی اور خار بھی ہے خزاں کا دور بھی ہے موسم بہار بھی ہے

نگاہ شوق بھی ہے چشم اشکبار بھی ہے گل شلفہ بھی ہے عنذلیب زار بھی ہے

چمن میں دانہ بھی صیاد بھی ہے دام بھی ہے

کھلی فضا بھی اسیری کا انتظام بھی ہے

قدم قدم پہ نشیب و فراز ہستی کا نفس نفس پہ ہے سوز و گداز ہستی کا

کلی کلی میں ہے پوشیدہ راز ہستی کا سنبھل سنبھل کہ سفر ہے دراز ہستی کا

سفر نیا ہے نئی منزلیں نئی راہیں

ہے رہنما بھی نیا اور نئی گذرگاہیں

الہی اس کی مسرت کو چادواں کر دے یہ جس زمیں پہ رہے رشک آسمان کر دے

میں چوراہ میں کانٹے تو گلستاں کر دے زمیں کے ساتھ فلک کو بھی مہرباں کر دے

قمری زمان میں شام و سحر رہے یارب

نگاہ سلف و کرم عمر بھر رہے یارب

بقول عم محترم سید غلام بدر الدین مقیم کراچی پاکستان نے راقم کو ملاقات کے دوران اس امر کی اطلاع دی کہ واقف مرحوم اپنے کلام کی اصلاح اپنے سنبھلے ماموں جناب ناز بلخی سے لیتے تھے چنانچہ چنان بین کے نتیجے میں راقم کو جناب واقف بلخی مرحوم کا ایک خط بنام ناز بلخی مرحوم دستیاب ہوا، موصوف نے یہ کلام بذریعہ خط اپنے سنبھلے ماموں کی خدمت میں ارسال کیا تھا چنانچہ اس خط کے ذریعے واقف بلخی مرحوم کی غزلوں کے چند اشعار دستیاب ہوئے جو بدیہ ناظرین ہیں۔

سید غلام بدر الدین اسحاق بلخی کے اپنے خاں زاد بھائی ہیں۔

بانگی پور

۲۷ اپریل بروز دوشنبہ ۱۳۳۷ھ

جناب امول صاحب

بعد ادا کے آداب و تسلیمات کے عرض خدمت ہے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق ہم اپنی غزلوں کے چند منتخب اشعار آپ کی خدمت میں بھیجتے ہیں ان میں جنکو جنکو آپ مناسب سمجھیں اپنی کتاب میں تحریر فرمائیں۔

جواب خط تو یوں لیکر کبھی میرا نہ آتا ہے
چڑھائے آستیں ہیں برجیں خنجر کب برعم
جو پیتا ہوں تو مشکل ہے نہ پیتا ہوں تو مشکل ہے
رہی تو بہ بھی قائم یہ مجھ سے کب توقع ہے
کہیں کا بھی نہ رکھا اس دل بیتا بنے بھگو
بیان جس شخص سے کرتا ہوں رو دیتا ہے وہ سکر
نکلواؤ نہ مجھ کو بزم سے کیونکہ یہ فطرت ہے

مگر کیا ہے جو قاصد آج بیتا بانہ آتا ہے
ہمارے قتل کو یوں قاتل مٹا نہ آتا ہے
ملا کر مئے میں کچھ ساقی نے پیمانہ آتا ہے
کہ رہ رہ کر خیال بادہ و پیمانہ آتا ہے
جہاں جاتا ہوں سب کہتے ہیں وہ پیمانہ آتا ہے
مجھے اے بخشش بس ایک ہی افسانہ آتا ہے
جہاں پر جمع ہوتی ہے وہیں پردانہ آتا ہے

کون شاید ہے یہاں دادر محشر اپنا
ذیر خنجر مجھے قاتل نے ترپنے نہ دیا
ماہ الفت میں جہاں وادی پر خار بھی ہے
کوچہ یار میں ہر نقش قدم کے آگے

نہ تو پہلو میں ہے دل اپنا نہ دلبر اپنا
یہی احسان جاتا رہا مجھ پر اپنا
آبلہ پاؤں کا بن جاتا ہے بستر اپنا
برسوں سجدے میں جھکائے ہے ہم سر اپنا

حالات کے پیش نظر نظم برق کے دو بند نہیں پیش کئے گئے۔

داستان غیر کی چھڑی تھی کہ وہ سن لیں گے
حال دل اس میں بیاں کر دیا اکثر اپنا

چڑھاؤ آتیں اپنی سمیٹا پنے دامن کو
نہ نکلی ایک بھی حسرت کہوں کیا چشم پر فن کو
سیر زلفیں نہیں اس سمیٹن کے عارفین گل پر
یہ آتی ہیں صدائیں عشق کی پر خار وادی سے
خوشی سے قتل واقف کو کرو لیکن قسم کھا لو
یہ کہہ کر رکھ دیا ہم نے تہ تیغ اپنی گردن کو
جلایا برق بنکر اس لئے یہ سارے خرمن کو
ہنگمیاں حسن کی دولت کا سمجھو کالی ناگن کو
قدم اس راہ میں رکھنا چپا کر اپنے دامن کو
دکھاؤ گے نہ اپنی شکل پھر تم میرے دشمن کو

مذکورہ بالا سطور میں خاندان بلخیہ کے بزرگان دین، عالموں اور ادیبوں کی ادبی خدمات
کا جائزہ لیا گیا جن کی ذات سے ہماری علمی و ادبی دنیا مرہون منت ہے۔

بقیہ باطن بلخی

جناب یوسف الدین بلخی کی ایک کتاب ”بہار لغت“ کے عنوان سے کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں
شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو کتب خانہ کے موجودہ ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مرتب کر کے
شائع کیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں یوسف بلخی کے چند تاثرات کتاب کے متعلق ملتے ہیں۔

پوری کتاب ڈیمائی سائز میں لگ بھگ ایک سو اٹھ صفحات پر محیط ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے
پہلے حصہ میں بہاری الفاظ مع معانی پیش کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں بہاری غاویات اور ضرب المثل کو مع
معنی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ لگ بھگ انسی صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ لگ بھگ
اٹھائیس صفحات پر محیط ہے۔ بحیثیت مجموعی یوسف بلخی مرحوم کا یہ ایک نہایت ہی لسانی تخلیقی کارنامہ ہے
اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

نسب نامہ پدری و مادری

بلخی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پروفیسر آدم بلخی کا ایک خط ماہنامہ "صنم" پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ رسالہ کے مدیر بلخی صاحب کی سوانح عمری سے متعلق کچھ باتیں صاحب مکتوب سے دریافت کی تھیں، انہیں کا جواب مطبوعہ اس خط میں ہے اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بلخی صاحب کا سلسلہ نسب نسل در نسل حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا کر ملتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنا تیار کیا ہوا نسب نامہ بطور یادگار چھوڑا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس وقت بلخیوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی، تعلق خاندان کی حکومت اس ملک میں تھی، مرحوم کا ترتیب کردہ نسب نامہ جو موجود ہے اس میں مولانا منظر بلخی سے اوپر صرف ایک نام درج ہے، لہذا ان میں سے جی کی ایک سے زیادہ اولادیں ہوں گی ان کے ہارے میں کچھ کہنا سہو دست مشکل ہے۔ یہاں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نسب نامہ نسل در نسل چلا آرہا ہے اور اس کے درست ہونے کے لئے بلخی صاحب نے چھان بین کی تھی اور مندرجہ ذیل کتابوں سے تشفی کر لی تھی۔

۱۔ فوائد المریدین و ملفوظات مطلوب المبارک ملفوظ مولانا شیخ آیری

۲۔ رسالہ مؤلفہ حضرت شاہ عبداللہ

۳۔ کتاب واقعات و حکومت دہلی مؤلفہ مولوی بشیر الدین دہلوی

۴۔ تاریخ فیروز شاہی مؤلفہ ضیاء الدین برنی

۵۔ طبقات نامری مؤلفہ قاضی مہناج الدین سراج

۱ کتاب الغانی از ابو الفرج علی بن الحسن

۲ تاریخ کبیر

۳ طریق حقائق از ابو معصوم علی شاہ شیرازی

۴ ربیع الامرا از محشری

۵ تاریخ کامل از امین اللہ الاشیر

۶ ملخص الآثار

۷ مجالس المؤمنین از سید نور اللہ

۸ تاریخ گزیدہ

۹ انقحات الانس از ملا عبد الرحمن جامی

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں سے بھی بلخیوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے اس نسب نامہ کی ترتیب میں ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۱۰ آثار شرف مؤلفہ خان بہادر نور الحسن شیر گھاٹی۔

۱۱ سیرت الشرف مؤلفہ خاں بہادر سید ضمیر الدین عظیم آبادی۔

۱۲ کنز الانساب مؤلفہ مولوی کریم الدین

خاندان بلخیہ کا مختصر ذکر کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ نسب نامہ درج کیا جائے۔ ذیل میں سلسلہ نسب کو نسل در نسل درج کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے پدری نسب نامہ درج کیا جاتا ہے ۱ کے بعد مادری سلسلہ نسب جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ مرحوم کی والدہ بی بی ہاجرہ مرحومہ سے جاتے ہوئے یہ سلسلہ ملا عبد الشکور ابن رکن الدین سے ملتا ہے جو حضرت تاج فقیہ فاتح منیر کی اولاد میں تھے اور جن کا ذکر بلخی صاحب نے تاریخ مگدھ میں درج کیا ہے۔

نسب نامہ پدری

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

سیدنا امام مظلوم حسین رضی

سیدنا امام زین العابدین رضی

سیدنا امام علی اصغر رضی

سیدنا امام قاسم رضی

امیر سید محمد

امیر سید زید

امیر سید اسحاق

امیر سید احمد

امیر سید احد

امیر سید یعقوب

امیر سید محمد

سیدنا ناصر الدین

امیر سلیمان

سیدنا ابراہیم ادبیم بلخی

سیدنا سلطان محمود بلخی

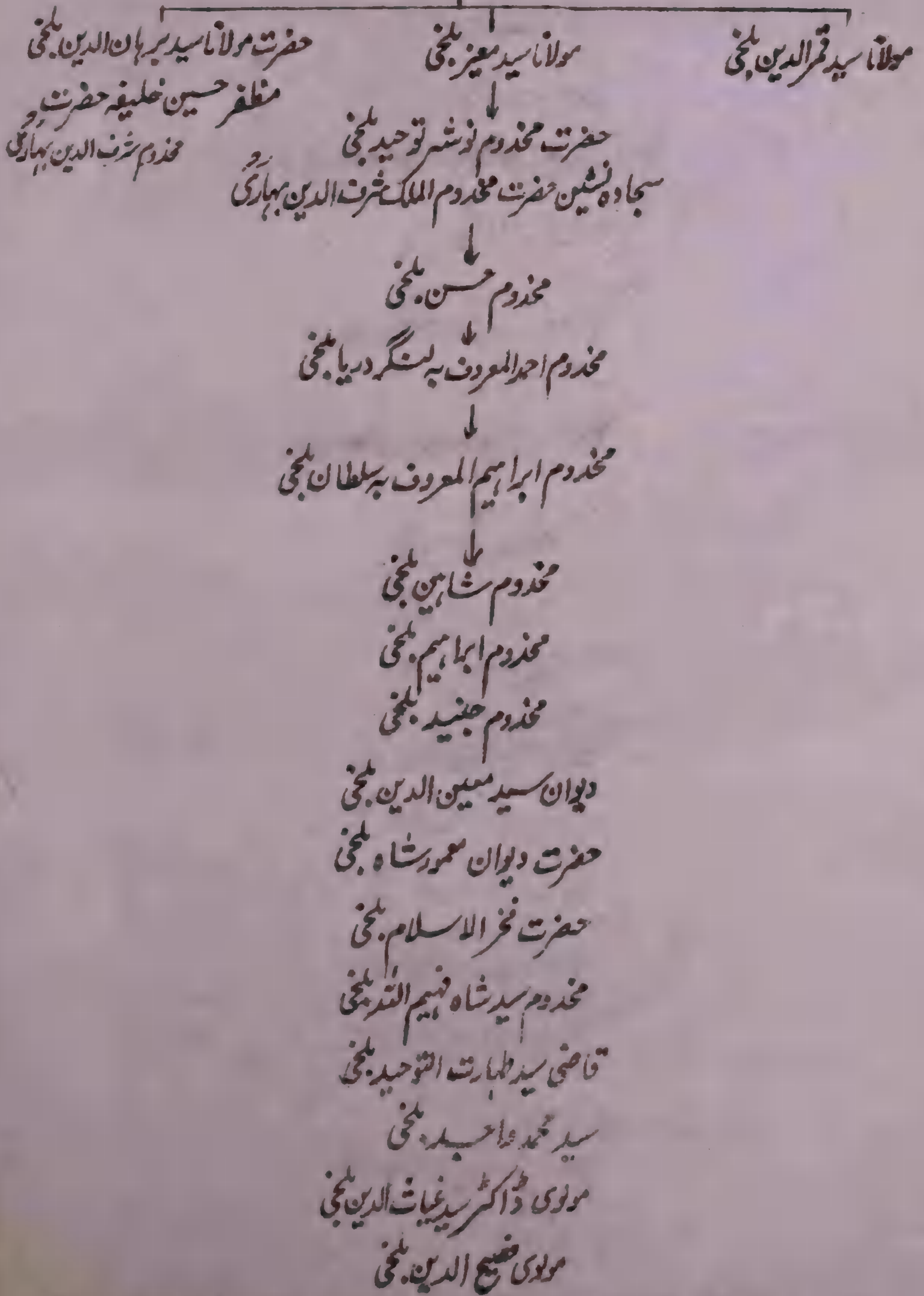
سیدنا سلطان سراج الدین

سیدنا حمید بلخی

سیدنا علی بلخی

جناب سیدنا شمس الدین بلخی قدس سرہ

در زمان سلطان محمد تغلق عہدہ در دیوان شاہی داشتند



پدری سلسلہ نسب جو درج ہے اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس لئے کہ میں نے خاندان کے مکمل نسب نامہ سے نقل کرنے کے بعد مرحوم کی نوٹ بک میں درج ذیل سلسلہ پدری سے ملایا ہے۔

ملحی صاحب مرحوم نے اپنے بڑے بھائی حفیظ الدین ملحی کے لون مزار کے لئے جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ بھی ان کے نوٹ بک میں درج ہے اور اس نوٹ بک میں ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ سلسلہ نسب بھی پایا جاتا ہے۔ لہذا اس کے درست ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔
مادری سلسلہ نسب کا جہاں تک تعلق ہے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سلسلہ حضرت تاج نقیبہ تک پہنچتا ہے اس کی تصدیق پروفیسر نادم ملحی نے مولانا سید عبدالرؤف ندوی مرحوم سے موصوف کی زندگی میں کر لی تھی۔

مادری نسب نامہ فصیح الدین ملحی مرحوم

ملا رکن الدین منیریؒ

از اولاد حضرت تاج نقیبہ درقصبہ منیر شریف

۱۔ ملا عبدالشکور	۶۔ قاضی امین الحق
۲۔ ملا عبدالخلیم	۷۔ قاضی داعظ الحق
۳۔ ملا عبدالرقیب	۸۔ مولوی سید عبدالحق
۴۔ ملا غلام اشرف	۹۔ بی بی مدینہ
۵۔ ملا غلام یحییٰ	۱۰۔ بی بی ہاجرہ الہیہ ڈاکٹر غیاث الدین ملحی
۶۔ قاضی کمال الحق	۱۱۔ حضرت فصیح الدین ملحی

پیدائش

فصیح الدین ملحی مرحوم کی پیدائش ۱۸۸۵ء کی ہے۔ اس کے درست ہونے کے سر دست تین ثبوت ہیں۔ مرحوم کے انتقال کے قبل جبکہ نادم ملحی کا مجموعہ کلام آغاز سحر کا مقدمہ ہجور شمسی مرحوم پیر قلم فرما رہے تھے تو انہوں نے خود مرحوم سے سن پیدائش کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق حضرت ہجور نے ۱۸۸۵ء درج کیا تھا۔ دوسرا ثبوت نادم ملحی کے بیان پر مبنی ہے۔ انہوں نے نظام الدین ملحی مرحوم سے جب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "میری پیدائش ۱۸۸۲ء کی

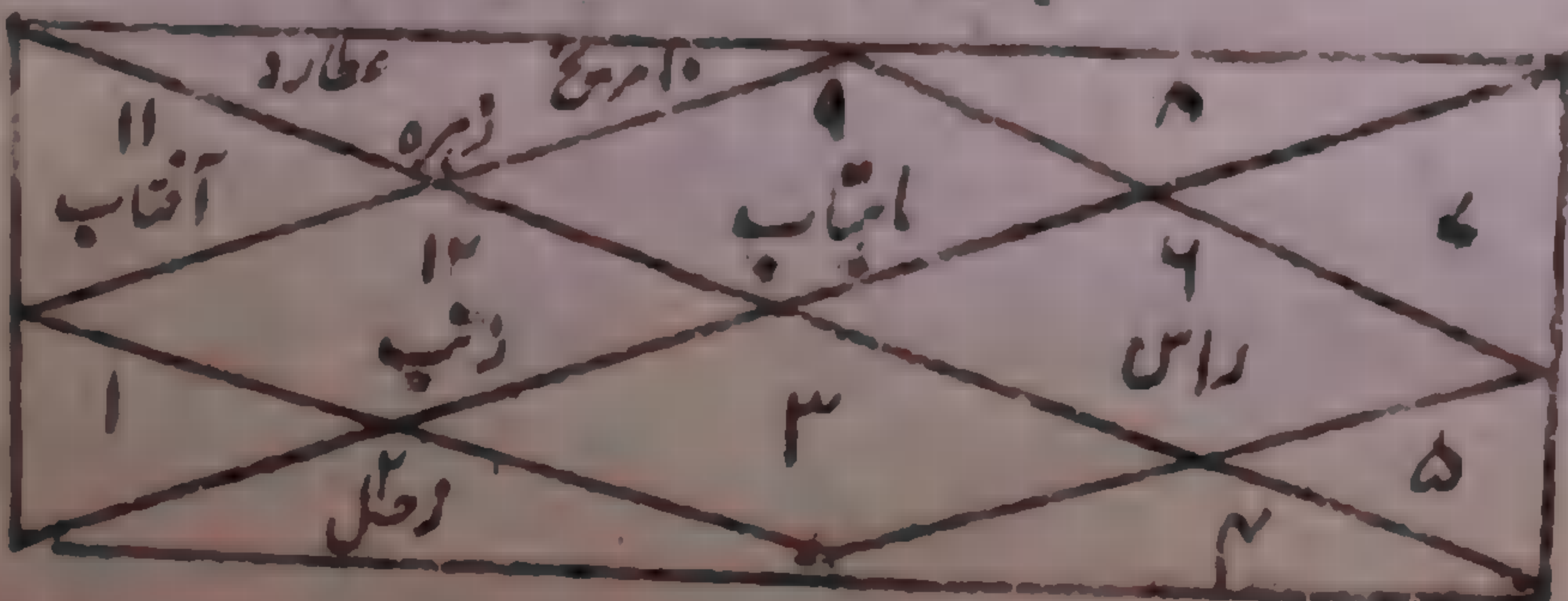
اور مجھ سے فصیح مرحوم تین برس چھوٹے تھے۔

اس کی ایک دستاویزی سند بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چھوڑی ہوئی جاگیر میں جو کتابیں اور کاغذات ہیں ان میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک بھی ہے جس میں انہوں نے اپنے علاوہ اپنے خاندان کے چھ افراد اپنے دوستوں اور عزیزوں کی جنم کنڈلی بنا کر رکھ چھوڑی ہے یہ بھی بلخی صاحب مرحوم کی خود نوشتہ ہے۔ مرحوم کے بنائے ہوئے زائچہ کے مطابق ۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق چھاگن ۱۹۱۰ شمست مطابق ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز شنبہ بوقت ۳ بجے شب وہ پیدا ہوئے۔ اس زائچہ پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ دراز کا بنایا ہوا ہے۔ جیسا کہ سیاہی کی رنگت بتاتی ہے اس کے بعد اس میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ملتی ہے جس کا رنگ تازہ معلوم ہوتا ہے اور جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً انتقال سے کچھ سال قبل کی تحریر ہے۔ زائچہ پیدائش دلچسپ ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے۔

زائچہ پیدائش فصیح الدین بلخی

۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق چھاگن بدی ۱۹۱۰ شمست مطابق ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز شنبہ دن گزر جانے کے بعد بوقت ۲ بجے شب پیدا ہوئے۔ پچھتر سول ڈنڈا ۱۵ پلا دیہ تھا اور اشت کال ۵۰ ڈنڈا ۲۸ پلا جنم کے پہلے بیت چکا تھا اور زنب ۵۱ جن میں ۲۱ دور زنب میں سے چھ برس ۱۰ مہینہ ۳۶ دن ۳۵ ڈنڈا ۳۲ پلا گزر چکا تھا۔ صرف ایک مہینہ ۳۰ دن ۲۴ ڈنڈا ۲ پلا باقی تھا مگر (۴۵۴) کا سورج ۱۲۹ نش بیت گیا۔

زائچہ پیدائش فصیح الدین بلخی مرحوم



تعلیم و تربیت

فصیح الدین بلخی مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی جو بذات خود عربی و فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ حکیم صوفی صاحب کی تعلیمی اندوز مشہور زمانہ تھی آج شہر عظیم آباد کی دفتر کئی ہوئی چھاتی پر جس عمارت کو بادشاہ محل کے نام سے پکارتے ہیں۔ مرحوم کے عہد طفلی میں حکیم صوفی صاحب کا مدرسہ اور اس سے متصل ان کا دولت خانہ تھا، حکیم صوفی صاحب کے طریقہ تعلیم کا صرف شہری میں نہیں بلکہ شہر کے باہر اور بیرون صوبہ میں بھی شہرہ تھا۔ ان کی لکھی ہوئی ابتدائی درسی کتابیں دور دور تک چلی ہوئی تھیں، خصوصی طور پر ان کی تصنیف کردہ اردو کی ابتدائی کتاب حیدر آباد تک چلتی تھیں، بچوں کے نصاب اور ان کی دشواریوں کو مد نظر رکھ کر یہ کتاب خاص ڈھنگ پر لکھی گئی تھی۔ ان کی مدرسے بچے اردو، قرآن شریف پڑھنا جلد ہی سیکھ لیتے تھے مرحوم کے سب سے پہلے معلم مرحوم کے والد محترم ہوئے ان کی نگرانی میں تعلیم یافتہ ہو کر صوفی صاحب کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اردو عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ سے حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کا داخلہ محمدن ایڈگلو عربک اسکول میں ہوا۔ اس اسکول کی زندگی میں مرحوم کو کھیل کود سے بہت کم رغبت تھی، بالائی، بد فعلیت، بد اطوار اور کھلاڑی لڑکوں سے مرحوم کو کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن اپنی ذہانت اور علمیت کے سبب مرحوم اپنے تمام ساتھیوں میں مقبول اور عزیز تھے۔ گھر سے بیل کے نیچے کتاب لے کر اسکول آنا، اسکول میں فرصت کے اوقات کتب بینی میں مشغول رہنا، پڑھائی کے وقت ٹیچروں کی باتوں پر دھیان دینا ان کی طالب علمی کی زندگی کی باتیں تھیں جو علی طور پر اسکول کے تمام طلباء میں نہیں پائی جاتیں۔

مرحوم کی اسکول کی زندگی کے قریب بہت سے دوست و آباء اسماعیل عرف جتتی تھے جو بعدہ خان بہادر کے خطاب سے بھی سرفراز کئے گئے۔ یہ مرحوم کے کلاس فیلو تھے اور پڑھنے لکھنے کے معاملے میں ان سے کمپیشن رہتا تھا۔ یہ دونوں طالب علموں کی خصوصیت تھی کہ سارے سبکٹ میں طاق تھے جتن صاحب کا ذکر مرحوم اپنی زندگی کے آخری وقتوں تک کرتے رہے تھے۔ ان کی ذہانت کی تعریف اکثر میں نے مرحوم کی زبان سے سنی ہے۔ ان کی تقریر کا مادہ شروع سے تھا جس کی بنا پر وہ آگے

آج کل کراچی سیاسی زندگی میں ایک مشہور مقرر مانے گئے، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کو تقریر کرنے کا مادہ تھا۔

فیض الدین بخاری مرحوم نے اپنی کتاب "تذکرہ نسواں ہند" میں صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۱۳ گوہر کے پٹنہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے جس رئیس کی شادی کا حال لکھا ہے وہ نواب حق مرحوم تھے۔ یادداشت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مرحوم حق صاحب سے چھوٹے تھے جن کی شادی بہت ہی کم عمری میں ہوئی اور اس موقع پر گوہر نے جو غزل گائی تھی وہ مرحوم کے ذہن میں محفوظ رہ گئی جس کا مطلع "نسوان ہند" سے درج کیا جاتا ہے۔

شاید کہ یاد بھولنے والے نے پھر کیا

تجلی اسی سبب سے ہے گوہر لگی ہوئی

یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے جبکہ مرحوم کی عمر لگ بھگ ۷۰ سال کی تھی، مرحوم کے والد بزرگوار کا انتقال جس وقت ہوا اس وقت مرحوم کی عمر بہ مشکل پندرہ سال کی تھی۔ انتقال کے بعد چاروں بھائیوں کے منجھلے چچا جو بقید حیات تھے۔ مرحوم کی چھوٹی ہوئی جائداد اور چھ عدد اولادیں (چار لڑکے دو لڑکیاں) کے سرپرست ہوئے لیکن خاندان کے سرپرست اٹھ جانے کے سبب پہلی جیسی حالت نہ رہی۔ منجھلے اور منجھلے بھائیوں نے ملازمت کر لی، منجھلے بھائی نے جنہیں ملازمت ناپسند تھی اپنی جائداد پر اکتفا کر لی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا چھوٹے بھائی کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ستانے لگا چنانچہ اپنی قابلیت اور حاصل کئے ہوئے علم کی بنیاد پر کوئی اچھی سی سند حاصل کرنے کا دل میں خیال پیدا ہوا۔ مرحوم نے محمدن اسکول کس سال میں چھوڑا اس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۰۵ء یا اس سے قبل چھوڑے ہوئے کاغذات کی چھان بین کرتے وقت محمدن اسکول کے ہڈ ماسٹر اعظم علی خاں کا دیا ہوا ایک سرٹیفکیٹ ملا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرحوم نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا بقول نظام الدین بخاری یہ سرٹیفکیٹ نہایت بوسیدہ حالت میں ہے۔ زبان انگریزی ہے۔ کہیں کہیں کے حصے کیرٹ کے کھائے ہوئے طے ہیں۔ نقل درج کی جاتی ہے۔

I know Mr. Fasihuddin Balkhi from his very infancy. He is young gentleman of good parts and respectably counted. He has intrane of the Calcutta University and has fair knowledge of English, Persian, Urdu and Hindi. He is intelligent enough to do all works. So far as I know him he is physically fit for active service and bears a good moral character. I should be glad enough of his getting suitable post. I wish him every success in life.

Date
Gulzar Bagh
31st October
1905

Azam Ali Khan
Head Master
M.A.A School
Patna City

نظام الدین بلخی فرماتے تھے کہ طالب علمی کے دور ہی سے فصیح الدین بلخی مرحوم کو مشاعروں کے لئے غزلیں کہنے کا شوق ہوا اور کئی کئی غزلیں کہہ کہہ کے اپنے دوستوں کو بانٹ دیتے تھے "تحفہ بہار" کا اجرا جس وقت ہوا 'مرحوم کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سخن نہیں اور سخن سنجی کا شعور مرحوم میں بچپن ہی سے ہو چکا تھا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ والد بزرگوار کی وفات کے بعد خاندان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مرحوم بھی سن شعور کو پہنچ چکے تھے چنانچہ فکر معاش دامن گیر ہوئی، مرحوم میں سیاحت کا

جذبہ بھی بیدار ہو چکا تھا۔ کیونکہ بچپن ہی سے ورنڈش اور کشتی لڑنے کے شوق کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق تھا۔ لہذا مرحوم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ایسی لاکری ملے جس میں سیاحی کا بھی موقع نصیب ہو اور پڑھنے پڑھانے کا بھی سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت فوجی رجمنٹل منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینا ہی مرحوم نے ضروری سمجھا۔ رجمنٹل فاضل منشی کا امتحان لفٹننٹ کرنل سکریٹری بورڈ آف انڈیا مینٹرنٹ ولیم کالج کلکتہ کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ اس کے مراکز ہندوستان کے ان شہروں میں ہوتے جہاں فوجی جھاڑیاں تھیں، اپنی لیاقت، قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر امتحان دہندہ کو سب سے پہلے سکریٹری صاحب موصوف سے اجازت لینا پڑتی تھی، اجازت مل جانے پر فیس داخل کرنی پڑتی تھی۔ دانا پور کی فوجی جھاڑی بھی امتحان کا ایک سنٹر تھی۔ ۳ جنوری ۱۹۱۱ء کو صبح ۱۰ بجے سے امتحان شروع ہوئے والا تھا، بلوخی صاحب مرحوم کے کچھ ملاقاتی بھی اس امتحان میں شریک ہوئے والے تھے۔ امتحان ہونے سے دو دن قبل مرحوم کے کچھ دوست ان کے پاس آئے اور کہا کہ صرف تھوڑے روپیوں کی ضرورت ہے امتحان کے سوالات بہ آسانی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے آپس میں چندہ جمع کر لیا ہے، تم بھی چندہ دے کر ہم لوگوں کی منڈلی میں شریک ہو جاؤ۔ مرحوم نے فرمایا مجھے آپ لوگوں کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں آپ لوگوں کی جو طبیعت چاہے وہ کیجئے ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس طرح پاس کر کے سند حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان امتحان نہ دے۔ مرحوم کے بھی احباب اس بات پر ناخوش ہوئے آخر سب کے سب گھر لوٹ گئے۔

۳ جنوری سے امتحان شروع ہوا۔ مرحوم روزانہ امتحان دے کر خوش خوش گھر واپس لائے۔ مرحوم کے ملاقاتیوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے امتحان کے پرچے کیسے گئے ہیں۔ ہاں چہرے سے یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنے پرچوں سے مطمئن نہیں ہیں، امتحان ختم ہوا، کچھ دنوں کے بعد امتحان کا نتیجہ برآمد ہوا۔ مرحوم نے یہی نہیں کہ اول درجے سے امتحان پاس کیا بلکہ حیرت کی بات ان کے ملاقاتیوں کے لئے تھی کہ سارے امتحان دینے والوں میں مرحوم نے سب سے زیادہ نمبر لایا پہلا پرچہ نمبر کا تھا جس میں سوال کی نوعیت کے مطابق انگریزی کی دو شمارتین عبارت کا سلسلہ

اُردو میں ترجمہ کرنا تھا اس میں مرحوم نے اٹھائیں نمبر لایا، دوسرے پرچہ میں علم بیانیہ کی تحریری عبارت کو علم بول چال کی زبان میں تبدیل کرنا تھا اس میں مرحوم نے بہتر نمبر لایا اور اس طرح دوسرے پرچوں میں بھی فرسٹ کلاس سے بہت زیادہ نمبر لایا، اس امتحان میں نمایاں کامیابی کو مرحوم کی ایک دلچسپ سیرو سیاحت کی حامل زندگی کا ایک حسین باب کہنا چاہئے۔

ادھر اپیشل اسٹاف انیسر لفٹننٹ حسین (G. C. Rek) نے ایک خط ۲۲ جون ۱۹۱۰ء کو دانا پور کینٹ سے لکھا لیکن اس درمیان مرحوم نے نارتھ بہار ٹلنٹ میں قانون گو کی ملازمت اختیار کر لی جیسا کہ اے۔ آر۔ ٹاپلس (A. R. Tapples) والی سی۔ ایس۔ اے، اس جی کی دی ہوئی 3-7-1910 کی سند سے ظاہر ہوتا ہے، مرحوم اپنی اس مختصر سی ملازمت میں ہر دل عزیز ثابت ہوئے۔ جفاکشی، محنت و مشقت، ایمانداری اور کمال کو بحسن و خوبی انجام دینے کے نتیجے میں ٹاپلس صاحب مرحوم کو بہت مانتے تھے یہ کام مزاج کے مطابق نہیں تھا لہذا مرحوم بہت جلد مستعفی ہو گئے۔

شادی و اولاد

فیض الدین مرحوم کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی شادی جناب سید منظر حسین مرحوم ساکن محلہ لودی کٹرہ کی صاحبزادی بی بی نور فاطمہ مرحومہ سے ہوئی۔ لیکن ان کی پہلی اہلیہ جلد ہی انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کی دوسری شادی جنگ عظیم سے لوٹنے کے کئی برس بعد ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ دوسری شادی اپنے ہی خاندان میں ہوئی یعنی محلہ دندی باناس کے ڈاکٹر سید محمد وارث بلخی مرحوم کی سبھی صاحبزادی بی بی رسولین مرحومہ سے ہوئی۔ دندی باناس کا یہ گھرانہ جہاں بلخی صاحب مرحوم کی دوسری شادی ہوئی ایک اوسط زمیندار گھرانہ تھا، ساتھ ساتھ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بہار کے صوفیائے کرام کا گھرانہ تھا۔ بلخی صاحب مرحوم کے خسر محترم ڈاکٹر وارث بلخی فتوحہ کے خاندان بلخیہ سے تعلق رکھتے تھے جن کی شادی بہار کے ایک متقی پرنسز گار اور صوفی منش حضرت مولانا سید امین اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، دندی باناس کی خانقاہ پورے صوبہ بہار میں دینی تعلیم کے مرکز کی حیثیت رکھتی تھی اور اس خاندان میں حضرت مولانا امیر الحسن، حضرت امین اللہ، حضرت مولانا حامد جیسے صاحب علم بزرگان دین گذرے ہیں۔

بہار کے مشہور شاعر جناب فضل حق آزاد مرحوم نے اسی مدرسہ دینی سے علم حاصل کیا تھا۔ بزرگان دین جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے آج بھی ابدی نیند اس محلے میں سو رہے ہیں، ان سبھوں کے مزارات اب تک درست حالت میں داتا شاہ یتیم کی درگاہ میں بہ مقام دندی بازار پٹنہ سیٹی میں موجود ہیں۔

اولاد: پہلی شادی سے بلخی صاحب مرحوم کو اولاد نہ ہوئی، دوسری سے تین اولادیں ہوئیں جن میں دو بچے بعد دیگرے جلد ہی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان حادثات کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا اور آخر میں ۱۹۲۸ء میں ایک اولاد ہوئی جس کا نام سید محمد ابراہیم بلخی ہے۔ مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے اولاد کے سبب میں یہی ایک نشانی چھوڑی جس کو وہ تادم خراپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

ملازمت

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ملازمت کی ابتدا نار تھ بہار سٹلمنٹ میں قانون گو کی حیثیت سے کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن چونکہ طبیعت کے موافق یہ ملازمت نہیں تھی لہذا مرحوم بہت مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی ملازمت کی جس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

قانون گو کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے مٹری اسکول کرکی میں معلمی کے لئے درخواست دی۔ موصوف کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ مرحوم تشریف لے گئے اور منتخب کئے گئے۔ یہ ملازمت بہت عرصے تک نہیں رہی محکمہ کے انسراعلمی اف۔ جی۔ ایگن (F. G. Eggen) نے جو ۳۰ جون ۱۹۱۲ء کو انہیں ایک سرٹیفکیٹ دی اس میں درج الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم جون ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک معلم کی حیثیت سے اس اسکول میں رہے۔ مرحوم اس اسکول میں انگریز فوجیوں کو فارسی اور اردو کی تعلیم دیتے رہے۔ اپنے انگریز طالب علموں کے قصے بلخی صاحب مرحوم گھروالوں کو سناتے تھے۔ خصوصی طور پر ان لوگوں کی فارسی دانی اور اردو دانی کے قصے خود بھی لطف لے کر سناتے تھے۔ اپنے ذہین گورے چمڑے والے چند انگریز طالب علموں کے بھی قصے سناتے تھے۔ ایک بار اپنے لڑکے (ابراہیم بلخی) کو ان کے بچپن کے زمانے میں مرحوم انگریزی کی درسی کتاب کا سبق دے رہے تھے۔ انگریزی کا ایک جملہ لڑکے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ لڑکا اپنی ذہانت سے کام لے کر اس جملے کا مفہوم سمجھ لے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ مرحوم اس جملے کا مطلب اسے سمجھا دیں۔ مرحوم نے کہا کہ انسان کو چاہیے کہ وہ ذہانت سے کام

لے اور فرمایا کہ میں نے پونا میٹری اسکول میں اپنے انگریز طالب علموں کو انگریزی عبارت اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے دی۔ ایک انگریز یہ نہیں جانتا تھا کہ "Bull" کو اردو میں کیلہ کہتے ہیں۔ بہر حال اس بے چارے نے اپنی ذہانت سے کام لیا اس کا ترجمہ "گائے کا شوہر" کر دیا۔ کاپی دیکھ کر تو مجھے بہت ہنسی آئی لیکن اس کی ذہانت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس سے بہت خوش ہوا۔ انگریز مرحوم نے ایک سال تک اس اسکول میں ملازمت کی۔ بلخی صاحب مرحوم کی کتاب زندگی کا ہر باب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے اور خدمتِ خلق کے واسطے بہتر سے بہتر ذریعہ نکالنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ بالغ العمری کے ابتدائی حصے میں وہ جم کر بھی نہیں رہے۔ ملازمت کے اس پہلو سے اپنے ضمیر کا بھی سمجھوتہ نہ کرتے جس کے نتیجے میں انسان غلام بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف انہوں نے اپنے ایک شعر میں اشارہ بھی کیا ہے

خواہاں جو خیر کا ہے وہ دنیا میں یوں رہے

آتا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

پونا میٹری اسکول سے سبکدوش ہو کر وہ اپنے وطن واپس آئے اور چند ہی دنوں کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے کلکتہ تشریف لانے کے فوراً بعد انہیں فورٹ ولیم کالج میں معلم کی جگہ مل گئی جیسا کہ لفٹننٹ ہے۔ اس کو کس (J. S. Coles) کی سند سے ظاہر ہوتا ہے یہاں بھی وہ ہر دلعزیز رہے۔ وہ فرماتے تھے کہ کلکتہ آنے کے بعد یہاں کی علمی و ادبی ماحول سے براہ راست ان کا واسطہ ہوا جس کے خصوصی طور پر مولانا ابوالکلام آزاد علمبردار تھے۔ مولانا آزاد مرحوم سے ان کا گہرا رابطہ ہو گیا تھا اور قربت کا سبب خالص علمی و ادبی تھا، اکثر شام گمان کے یہاں جاتے رہتے تھے اور علمی و ادبی نکات پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ کوکس (Coles) صاحب بلخی صاحب مرحوم کو بہت مانتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس ملازمت سے سبکدوش ہوں لیکن بلخی صاحب مرحوم کو سیر و سیاحت کا چسکا لگ گیا تھا۔ ماسوا اس کے اچھی ملازمت کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ کوکس صاحب نے فورٹ ولیم سے ان کی سبکدوشی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے خواہش مند رہے کہ اگر پھر بلخی صاحب دستیاب ہو جائیں تو فورٹ ولیم کالج کے ماحول سے ان کا رابطہ قائم کیا جائے 'دل' کوکس صاحب بلخی صاحب مرحوم سے کس درجہ متاثر تھے اور کس قدر مانتے تھے اس کا اندازہ ان کی دی ہوئی سند سے ظاہر ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی

درگاہ میں معلمی کرنے والے کو منشی کہا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۱ء سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ ہم تاریخ ادب اردو کے حوالے سے جانتے ہیں، یہیں سے گویا اردو نثر نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریزوں نے جتنے بھی یہاں معلم بحال کئے ان کی یہی کوشش رہی کہ ہندوستانی ہندوستان کے گوشے گوشے سے تعلق رکھنے والے اچھے ذی علم اشخاص کا انتخاب ہو، میرامن دہلوی، لولال جی وغیرہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم اس اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کے معلموں کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج میں بلخی صاحب مرحوم بہت دنوں تک نہیں رہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں اس سے نہایت بہتر ملازمت مل گئی یعنی جزیرہ فی جی کے سپریم کورٹ میں ترجمان کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم کی بحالی ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے افسران بلخی صاحب مرحوم کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے کہ ان کی علمیت اور ذہانت و ایمانداری سے بہت متاثر تھے اس کے لئے سکریٹری بورڈ آف اکرمانرس نے اپنے جانتے ایک طرح کی رشوت دی تھی یعنی بلخی صاحب مرحوم کو خوش کرنے کے لئے فورٹ ولیم کے علاوہ انہیں باہر بھی ایک اچھی جگہ دلائی۔ ایشیاٹک سپرولیم کمپنی ۹ کلاؤ اسٹریٹ کے افسر اعلیٰ کو پرہانے کے لئے ایک بہت اچھی ٹیوشن انہیں دلائی تھی۔ اس افسر کا نام الڈرنگسٹن (Elder Kingston) تھا۔ اس افسر نے مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء کو ایک خط مرحوم کے نام لکھا اس سے اس کی تفصیل ظاہر ہوتی ہے۔

فی جی عدالت عالیہ میں ترجمان کی حیثیت سے ان کی ملازمت خراب صحت کے سبب بہت زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی اس کی تفصیل اس باب میں کی جائے گی جس کا تعلق بلخی صاحب مرحوم کے اسفار سے ہے۔ بلخی صاحب مرحوم غالباً ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان جزیرہ فی جی سے لوٹے اور کچھ دنوں تک فکر معاش کے سبب مسکریسے لیکن جلد ہی انہیں بہار کو اپریٹو سوسائٹی (نوادہ) میں نگران کا عہدہ مل گیا اور اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک نئی سند حاصل کرنے کے لئے کو اپریٹو کورس کا امتحان پاس کر لیا۔

اس عہدہ پر بلخی صاحب مرحوم بگ بگ دو برس تک برقرار رہے، مرحوم کی ایمانداری

اور کارگزاروں کو حکومت بہار و اڑیسہ نے بہت سراہا جیسا کہ رپورٹ ستمبر ۱۹۱۴ء تا ستمبر ۱۹۱۵ء سے ظاہر ہوتا ہے۔ الغرض اس محکمہ نے ان کی کارگزاروں کو سب سے زیادہ لائق تسلیم کیا۔ اس عرصے کے بعد اس ملازمت سے بھی ان کی سبکدوشی ہوئی۔ مرحوم کے چھوٹے پوتے کاغذات یہ بتاتے ہیں کہ وہ سیوان میں پھر قانون گو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔

پہلی جنگ عظیم اور فصیح الدین بلخی

پونامیٹری اسکول اور فورٹ ولیم کے شہرت یافتہ معلم فصیح الدین بلخی مرحوم کو ایک بار پھر فوجیوں کی معالیٰ پر بلایا گیا۔ بلخی صاحب کو سر دست مصر (Egypt) بھیجا جا رہا تھا لیکن فوجی ملازمت ہونے کے سبب معاہدہ کے پیش نظر انہیں دیگر بیرونی ممالک میں ہرجا جانے کے لئے آمادہ کیا گیا اور اس ملازمت سے بلخی صاحب مرحوم کب تک وابستہ رہے اور اس سے متعلق کون کون سی دلچسپ معلوماتی باتیں ہیں ان کا ذکر اسفار سے متعلق باب میں کیا جائے گا، فوجی ملازمت سے ۱۹۱۹ء کے اواخر میں بلخی صاحب مرحوم سبکدوش ہوئے اور بیرونی ممالک کی سیروسیاحت کے بعد جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو ان کی اچھی کارگزاروں کے سلسلے میں حکومت ہند نے قلعہ رہتاس کے قریب ان کو کافی زمین عطا۔ بقول نظام الدین بلخی جیسا کہ انہوں نے اپنے بھتیجے نادم بلخی سے کہا تھا لیکن مرحوم چونکہ قناعت پسند اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے تھے۔ انہوں نے ان زمینوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا، بلخی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد معیز الدین خادم بلخی کا ایک مضمون ”بہار کی خیریں“ میں شائع ہوا تھا اس سے بھی اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ ہندوستان تشریف لائے کے بعد بلخی صاحب مرحوم کو انگریز حکام نے سب ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر جو پور میں انہیں فائز کیا۔ لیکن بعد میں ان کی تقرری سرکل آفیسر کی حیثیت سے ہوئی۔ چنانچہ ۵ دسمبر ۱۹۲۲ء کے پروانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مونگیر میں سرکل آفیسر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر ذی ہوش اور ہندوستانی مسلمان علیٰ براء ان کی تحریک خلافت سے متاثر تھا۔ گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک اور تحریک خلافت کا ملک کے چپے چپے میں زور تھا۔ مرحوم کے سب سے بڑے بھائی حفیظ الدین بلخی مرحوم

تازنگی نیشنلسٹ (Nationalist) رہے اور بنی صاحب مرحوم پران کی برادرانہ شفقت پدری شفقت کی طرح معلوم ہوئی تھی اس لئے کہ برادر کلاں خورد سے عمر میں لگ بھگ دس سال بڑے تھے۔ بنی صاحب مرحوم بھی Nationalism کے جذبہ سے کافی متاثر ہوئے چنانچہ انہوں نے انگریزوں کی دی ہوئی نوکری کو ٹھکرا دیا اور جو زمین رہتاس قلعہ کے پاس ملی تھی اسے بھی واپس کر دیا۔ مرحوم کی شریک حیات جن کا انتقال ۱۹۶۸ء میں ڈالٹن گنج میں ہوا فرماتی تھیں کہ مرحوم اسقدر نیشنلسٹ (Nationalist) تحریک سے متاثر ہوئے کہ گھر میں سبھوں کو کھدر پہننے کا حکم دیا۔ جتنے انگریزی لباس تھے انہیں جلا دیا گیا نوکری کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا چنانچہ کچھ دنوں تک گھر کی پونجی کھائی گئی۔ آخر میں بڑے بھائی کے مشورے سے سبھی بھائیوں نے جائیداد فروخت کر دی اور ہارہ بنکی میں بس سردس شروع کی گئی لیکن دیش بھتی میں انگریزوں کے مظالم کے آگے یہ بزنس (Business) پنپ نہیں سکا وجہ یہ تھی کہ اس کے لئے ملازم Nationalist تحریک کے سرگرم رکن تھے اور تحریک کی سرگرمی دکھانے میں حکومت برطانیہ نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس کا دوبارہ کے ختم ہو جانے کے بعد مرحوم اپنے وطن تشریف لائے، معاشی بحران میں سارا خاندان متاثر ہوا۔ ان کی شریک حیات کتنی تھیں کہ یہ زمانہ مرحوم اور ان کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ آخر کار ۱۹۲۶ء میں مرحوم نے ریاست سرائے کیلا میں ملازمت کی۔ ملازمت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم مجسٹریٹ، روڈیو انیسر اور ادیشنل انیسر کے عہدے پر فائز رہے۔

مرحوم ۱۹۳۷ء تک سرائے کیلا میں برسلہ ملازمت رہے۔ اس عرصے میں انیسر کی حیثیت سے ان کی کارگزاریاں اس قدر مشہور بنیں کہ بیچ بیچ میں دوسرے محکموں نے اسٹیٹ سے گزارش کر کے عارضی طور پر اپنے یہاں رکھا۔ مثال کے طور پر اریسہ کا ڈھیکانال اسٹیٹ جس کے مہاراجہ بھی رولنگ چیف تھے۔ انہوں نے ایک بار انیسر کی حیثیت سے سرائے کیلا رولنگ چیف اوت پرتاب سنگھ سے گزارش کر کے انہیں بلایا، خراب نظم و نسق کو سنبھالنے کی ان سے گزارش کی چنانچہ مرحوم لگ بھگ ایک سال تک سرائے کیلا اسٹیٹ سے لی ان (Leon)

پڑھیکانال اسٹیٹ میں رہے۔ اس درمیان حکومت بہار ضلع سنگھ بھوم میں زمین کی پیمائش کا کام کر رہی تھی۔ سنگھ بھوم کے ڈپٹی کمشنر ایک انگریز نے بلخی صاحب مرحوم کی کارگزار نیل کو اسٹیٹ میں رکھا تھا یہی وجہ ہوئی کہ حکومت بہار نے ایک عرصے تک *Land Revenue* *Section Officer* کی حیثیت سے انہیں سنگھ بھوم کے صدر مقام چائباہر میں رکھا۔ مرحوم نے اپنی ملازمت کے دوران گویا بادشاہت کا دور گزارا، ان کی خواہش نہ ڈھیکانال جانے کی تھی بلکہ وہ حکومت بہار کی درخواست منظور کرنے کی۔ لیکن سرانے کیلا کے رولنگ چیف سے ان کے تعلقات اس قدر گہرے اور مخلصانہ ہو گئے تھے کہ مرحوم ان کی باتوں کو ٹھکرانہ کے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک ایک لمبے عرصے میں بلخی صاحب مرحوم اپنے وطن سے دور رہے لیکن یہ مطلب نہیں کہ وطن سے ان کا واسطہ بھی ختم ہو گیا تھا، بیچ بیچ میں چھٹیوں اور تعطیلوں کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم پٹنہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سہری کاری کاموں کے سلسلے میں ہوتی تھی جس کے نتیجے میں اپنے دوستوں سے بھی ملنے کے مواقع فراہم ہوتے رہتے تھے۔ صاحب علم ہونے کے سبب خصوصی طور پر ایک مورخ اور محقق ہونے کے نتیجے میں ان کا رشتہ پٹنہ کی مشہور لائبریریوں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، خدا بخش اور سنہا لائبریری سے تھا۔ ۱۹۲۷ء میں کوشش کر کے بلخی صاحب مجسٹریٹ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور پنشن حاصل کی۔ یہ پنشن انہیں تادم مرگ ملتی رہی اور ۱۹۴۷ء کے بعد وہ عظیم آباد تشریف لائے پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ مخطوطات کے انچارج کی حیثیت سے اس عہدے پر سفر آخرت سے دو سال قبل تک یعنی ۱۹۶۰ء تک رہے۔

یہ ایک دلچسپ داستان جوان کی ملازمت سے تعلق رکھتی ہے اس سے متعلق بہت ساری باتیں دائرہ تحریر میں آنے سے رہ گئی ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر آئندہ کے ابواب میں ضروری سمجھا گیا۔

عام مشاغل

فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی مشاغل سے آج کے عظیم آباد کا ادب نواز اور علم نواز

طبقہ بہر حال واقف ہی ہے۔ ان کے عام مشاغل کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے کی بہت ساری دلچسپ باتیں لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے کہ بلخی صاحب مرحوم جنہیں لوگ علم کا بحر بیکراں کہتے ہیں، انہوں نے اپنے علوم کا بنیاد خود کوئی دھندلہ دیا نہیں پایا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بلخی صاحب مرحوم ایک ماہر علم نجوم بھی تھے۔ علمی اور ادبی مشاغل کے علاوہ اور بہت سارے مشاغل ان کی زندگی سے وابستہ تھے۔

سائیکل : بلخی صاحب مرحوم کے عہد طفلی کے زمانہ میں سائیکل چڑھنا بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بقول نظام الدین بلخی مرحوم یہ واقعہ ۱۸۹۲ء کے لگ بھگ کا ہے۔ اس وقت مرحوم لگ بھگ دس سال کے ہوں گے۔ مرحوم سائیکل سیکھنے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ سائیکل کا انتظام ہو گیا۔ مرحوم نے پیڈل پر پاؤں رکھ کر مشق شروع کی اور بہت جلد سائیکل چڑھنا سیکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے محلے کے لڑکوں کو سائیکل چڑھنا سکھایا۔

ورزش : مرحوم کو بچپن ہی سے ورزش کا شوق تھا چنانچہ یہ شوق زمانہ شباب تک قائم رہا لیکن کشتی یا دنگل کے میدان میں کبھی بھی نہیں اترتے۔ پہلوان کے بیچ لور داؤں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس فن میں شہر کے مشہور پہلوان کچھو استاد سے مرحوم نے پختہ لڑنے کا فن بھی سیکھا۔ کچھو استاد کی اس وقت شہر میں کافی دھاک تھی۔ شہر کے بلکریوں کہتے کہ صوبہ بہار کے نامی گرامی پہلوان کیگل جو گیان کے نام سے مشہور تھا کچھو استاد کا شاگرد تھا، مرحوم کے زمانہ شباب کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ورزش سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ کچھو استاد مرحوم کو اور ان کے دوستوں کو ورزش سکھانے کے لئے بخشی محلہ آتے تھے بعد میں حکیم فہیم الدین مرحوم کے یہاں اکھڑہ بنایا گیا اور مرحوم کچھو استاد سے ورزش سیکھنے کے لئے جلتے تھے۔

تیراکی : مرحوم شناری میں بلاشبہ ماہر تھے، نادم بلخی کا کہنا ہے کہ اس فن میں ان کے سارے کرتبوں کو دیکھنے کا موقع انہیں ملا، کئی بار دریائے گوگامیں مرحوم کے ساتھ غسل کے لئے انہیں جلتے کا اتفاق ہوا، عہد پیری میں بھی نوجوانوں کی طرح تیرتے ہوئے دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ مرحوم پانی کی سطح پر نہایت ہی فراغت کے ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

سطح آب پر ایک لاش تیر رہی ہے، مرحوم اس فن میں ایک بہت بڑے استاد کے شاگرد تھے جن کا نام خان بہادر خاں رامپوری تھا۔ وہ بندیل کھنڈ کے ایک پٹھان تھے ان کی فن شناسی کے بہت سارے قہے سننے میں آئے ہیں۔ مرحوم کے سنبھلے بھائی نظام الدین بٹخی مرحوم خان بہادر خاں کے ساتھ نہانے جلتے تھے۔ ایک روز خان بہادر خاں نے لڑکوں سے کہا تم میں بہتوں کا حال بڑھے طوطے کا ہے لاکھ کوشش کی جائے تم اس فن کے ماہر نہیں ہو سکتے۔ دیکھو ہمارے فصو بالو تم سمجھو اسے بہت چھوٹے ہیں لیکن تم سمجھو اسے عقل میں بہت بڑے ہیں کس قدر جلدی ملائی ہیں ماہر ہو گئے۔ مرحوم کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار انہوں نے سیلاب کے دامن میں گنگاندی کو پار کیا تھا۔

بیت بازی : بقول نظام الدین بٹخی فصیح الدین بٹخی مرحوم کو بچپن میں بیت بازی کا بہت شوق تھا اور شوق کے نتیجے میں وہ برابر شعرا کے دواوین پڑھتے تھے لہذا کچھ ذہن میں اشعار محفوظ رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار بھی سننے پر انہیں غزلیں یاد ہو جاتی تھیں۔ بیت بازی کے مسئلے میں ان کے آگے کوئی بھی نہیں اُترتا تھا۔

معتمد اور پہیلی : معتمد اور پہیلی کو حل کرنے میں انہیں دیر نہیں لگتی تھی یہاں تک کہ اگر کسی بھی بچے سے کوئی پہیلی یا معتمد حل نہیں ہوتا تو فوراً دوڑا ہوا مرحوم کے پاس آتا تھا اس یقین کے ساتھ کہ وہاں ضرور حل ہو جائے گا چنانچہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا تھا۔

شکار : شکار کا شوق بھی انہیں بچپن ہی سے تھا اور اس شوق نے جوانی میں شدت اختیار کر لی جو بڑھاپے تک یعنی جب تک ان کی صحت قائم رہی شوق بھی غالب رہا۔ شکار کے بہت سارے قہے سناتے تھے۔ جنگلی جانوروں کا شکار کرنے وہ اکثر جاتے تھے۔ وہ کئی کئی دنوں کا سامان مہیا کر کے جاتے تھے اور شکار کے بعد واپس آتے تھے۔ مرحوم کو چڑیوں کے شکار کا بھی شوق تھا چنانچہ دور دور کے دوست بھی آتے تھے اور تین چار دنوں کا راشن لیکر یہ لوگ گنگا میں معروف رہتے تھے۔ چڑیوں کے شکار کے لئے ہلدی، چھوہ، مہنار، سنہا گھاٹ اور پورب کی طرف مونگیر کی طرف یہ لوگ جلتے تھے۔ سڑک کیلا ملازمت کے دوران اپنے لڑکے کو بھی شکار میں ساتھ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سہیل رام کے ان کے پرانے شکاری دوست مولوی ابراہیم صاحب ان کے یہاں

خاص طور پر سرے کیلا شکار کی غرض سے آیا کرتے تھے۔

عام مشاغل میں جواہر تھے ان کا اوپر ذکر کیا گیا ہوان کے علاوہ ان کے خاص مشاغل تھے وہ بھی خاص علمی ادبی اور مذہبی تھے جن کا ذکر آئندہ کے ابواب میں کیا جائے گا۔

احباب

فصیح الدین بلخی مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جن میں وطن سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے، اپنے محلے کے لوگ بھی، اپنے شہر کے لوگ بھی، اپنے صوبے کے لوگ بھی اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے بیرونی صوبے کے لوگ بھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے دائرہ احباب میں مختلف قسم کا ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ یعنی ایسی بات نہیں تھی کہ صرف ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں ہی سے ان کا گہرا رابطہ تھا۔ مثال کے طور پر کلاسیکی گالوں کے ماہر لوگوں سے بھی تعلق اور ربط تھا۔ شہر کے اس عہد کے مشہور گانے والے شری الفت رائے بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ الفت رائے ان کے کلاس کے ساتھی تھے۔ اس دوستی کو انہوں نے مرتے دم تک نبھایا۔ الفت رائے کے انتقال سے مرحوم حد درجہ متاثر تھے۔ الفت رائے کو حکومت کی طرف سے جو وظیفہ ملا تھا اس سلسلے میں مرحوم نے نہایت فراخ دلی سے کوشش کی تھی۔ خواجہ فخر الدین گھنسان کی گہری دوستی تھی۔ ماسوا اس کے خواجہ فخر الدین سخن کے بھی لڑکے ان کے نہایت ہی قریبی دوستوں میں سے تھے۔ یہ تو ہوئے بخشی محلہ کے لوگ یعنی بخشی محلہ سے تعلق رکھنے والے ان کے گہرے دوستوں کے احوال، ماسوا اس کے حکیم نہیم الدین مرحوم ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم اور ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی ان کے نہایت ہی گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مبارک حسین کا یہ حال تھا کہ اپنی کوئی بھی فنی تخلیق بغیر بلخی صاحب مرحوم کو دکھانے کہیں بھی نہیں سکتے تھے۔ بلخی صاحب مرحوم کے حلقہ علم و ادب میں کہنہ مشق حضرات بھی تھے اور مبتدی بھی۔ اور ان بھوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

بلخی صاحب مرحوم جب تک بخشی محلہ میں رہے زیادہ تر احباب ان سے ملنے ان کے گھر پر آتے تھے وہ ان کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ وہ اپنے رشتہ کے بھائی بغیر الدین شریف صاحب بیرسٹر

اللہ عبد الجلیل جو سرٹ وغیرہ کے یہاں ہانکی پورا کٹر لے جاتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے، ہانکی پور میں خان بہادر پروفیسر سید حسن عسکری سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے۔ تحقیق و جستجو کے سلسلے میں بلخی صاحب مرحوم کا لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، نیپال کا جو سفر ہوا اس میں پروفیسر عسکری صاحب بھی شامل تھے۔ عسکری صاحب نے آخر آخر وقت تک اپنی دوستی کو نبھایا۔ عظیم آباد کے باہر رہنے والے لوگوں میں انجم مانپوری سے ان کی گہری دوستی تھی، گیا کے اہل قلم میں بسمل سنہاروی سے بھی ان کی گہری یاری تھی۔ بسمل سنہاروی کے علاوہ سر سرب کاہری مرحوم سے بھی ان کی گہری دوستی تھی۔ بلخی صاحب مرحوم سے گہری دوستی نواب فتحی جان قمر گیاروی مرحوم سے بھی تھی۔ قمر صاحب مرحوم کی شخصیت بھی ذی علم تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں انہی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔

شہر کے لوگوں میں سید محمد یوسف وکیل بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بیرونی صوبے کے ان کے احباب کا جہاں تک تعلق ہے اس کی فہرست مرتب کرنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ بلخی صاحب مرحوم سے خط و کتابت ہر علم کا متوالا کرتا رہا تھا لیکن چند ایسی شخصیتیں ہیں جن سے بلخی صاحب مرحوم حد درجہ متاثر تھے۔ مثال کے لئے بمبئی کے سفر میں خواجہ غفر الدین سخن کے نواسے فلم ڈائریکٹر شرف الدین خلیل اور لکھنؤ کے آرڈو لکھنوی سے ان کا گہرا تعلق ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ بمبئی گئے ادبی اشخاص کے علاوہ ہر فنکار سے ملنے کی کوشش رہتی تھی۔ حالانکہ وہ میسر نہیں دیکھتے تھے لیکن فنکار کی دل سے قدر کرتے تھے، نامہ نگار اور سرسید رگور کا جو ذکر انہوں نے "سوانح ہند" میں کیا ہے اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے حیدر آباد کے عبدالرحیم صاحب سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔ بلخی صاحب مرحوم جب لکھنؤ تشریف لے جاتے تو پروفیسر مسعود حسین رضوی سے ایک گہرا تاثر لے کر آتے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم کے احباب کا جہاں تک تعلق ہے ایک وہ طبقہ ہے جو یونیورسٹی اور عظیم آباد کے مشہور کتب خانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یونیورسٹی کے لائبریرین آنجنائی اندر دیو نرائن سنہا تھے جو آنجنائی سمجھتا مند کے بھتیجے تھے ان سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔ بلخی صاحب مرحوم جتنا وقت شعبہ خطوط میں گزارا کرتے تھے ان کے ارد گرد ریسرچ اسکالروں کے علاوہ پروفیسر حضرات بھی رہتے تھے بلخی صاحب مرحوم

سے ڈاکٹر اختر اور نیوی، پروفیسر جمیل منہری، ڈاکٹر صدیق الدین فضا شمس، پروفیسر ذکی الحق وغیرہ کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اختر لکھنؤی صاحب نے ”بہار میں اردو ادب کا ارتقا“ کی مطبوعہ کاپیاں بلخی صاحب مرحوم کو بیحد فلوں دلی دی تو اس پر اپنے ہاتھ سے یہ لکھا ”اعتراف معاونت کے طور پر حضرت فصیح الدین بلخی کی خدمت میں“ اختر اور نیوی، کلکتہ سے تعلق رکھنے والوں میں پروفیسر شاہ مقبول احمد خصوصی طور پر ان کے دوستوں میں سے تھے۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کا حلقہ اجاب بہت وسیع تھا۔

اسفار

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پونا میٹری اسکول سے سکندرش ہونے کے بعد فصیح الدین بلخی مرحوم اپنے وطن واپس آئے اور چند دنوں رہ کر کلکتہ تشریف لے گئے، کلکتہ میں جب تک بلخی صاحب مرحوم قیام پذیر رہے گورنمنٹ انگریشن رجسٹر فی جی (Emigration Agent Figi) سے بھی ایک عرضتک خط و کتابت ہوتی رہی چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء کو مرحوم نے جو خط رجسٹر کے نام لکھا تھا اس کا جواب بحوالہ نمبر ۱۰۰۶ - ۱۱۷۶ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو بلخی صاحب مرحوم کو ملا۔ رجسٹر کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم کلکتہ چھوڑ کر پٹنہ تشریف لائے۔ اس خط میں رجسٹر نے یہ لکھا تھا کہ ان کا انتخاب ہونے کے بعد انہیں ہندوستان چھوڑ دینا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ جزیرہ فی جی کے سیرم کوڑ میں ترجمان (Interpreter) کی بہت اچھی جگہ بلخی صاحب مرحوم کو مل گئی، ایجنٹ نے ان کو خط لکھا تھا اس میں انہیں بورڈ آف اگزامینرس کے دفتر کاوشل ہاؤس اسٹریٹ کلکتہ میں بلایا گیا تھا۔ چونکہ مرحوم ان دنوں کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے تھے اس لئے اس کی تصدیق دو عدد ٹیلی گرام سے ہوتی تھی جو ایجنٹ نے یکے بعد دیگرے ۲۰ اور ۲۱ کو بھیجا۔

الغرض ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو مرحوم نے کلکتہ میں دو پہر کو ایجنٹ کے معاہدہ پر دستخط کر دیا،

معاہدہ کئی دفعات پر مشتمل تھا جو بہت طویل ہے۔

الغرض مرحوم فی جی کے لئے روانہ ہو گئے۔ بڑے بھائی حفیظ الدین بلخی مرحوم اور چھوٹے بھائی

مرحوم کو کلکتہ اور کلکتہ سے مدراس تک پہنچانے کے لئے گئے۔ مرحوم اپنے وطن سے یہ امید لے کر گئے تھے کہ کم از کم وہاں چار برسوں تک کی سیر کرنی ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا، وہاں پہنچتے ہی مرحوم نے اپنا عہدہ تو سنبھال لیا، سیر و سیاحت کی عادت سی ہو گئی تھی۔ مرحوم اپنی محنت اور کاموں کے سبب بہت مقبول ہوئے لیکن وہاں کی آب و ہوا ان کے مزاج کو اس نہ آئی۔ لگ بھگ چھ ماہ کے بعد مرحوم سخت علیل ہوئے۔ علالت سے کہنے کو تو وقتی طور پر نجات ملی لیکن ان کی تندرستی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ شکایت رہی لہذا مرحوم اپنی ملازمت سے بیکار ہو گئے اور اپنے بڑے بھائی کو اپنی آمد کی خبر بھیجی۔ بڑے بھائی مرحوم کے استقبال کے لئے مدراس روانہ ہو گئے اور چند دنوں کے بعد ان کو لیکر عظیم آباد آئے۔

پہلی جنگ عظیم اور بلخی صاحب مرحوم

نوادہ کو آپریٹو بینک کی ملازمت بھی بہت دنوں تک نہیں رہی۔ پرانے کاغذات یہ بتاتے ہیں کہ پھر وہ سیوان میں قانون گو کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ چکی تھی اور جاری تھی۔ پونا میٹری اسکول کے شہرت یافتہ معلم منشی فصیح الدین بلخی کو ایک بار پھر اسی عہدے پر بلا یا جا رہا تھا، بلخی صاحب کو سر دست مصر (Egypt) بھیجا جا رہا تھا۔ مصر کا اندھنہ : فوجی ملازمت ہونے کے سبب معاہدہ کے پیش نظر انہیں دیگر ممالک میں ہر جگہ جانے کے لئے آمادہ کیا تھا، ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو معاہدہ کا مسودہ مرحوم کے سامنے پیش تھا، معاہدہ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان اور مرحوم کے درمیان ہوا تھا۔

الغرض مرحوم سفر کے لئے روانہ ہو گئے، چونکہ ایک نوکر بھی ساتھ لے جانے کی اجازت تھی لہذا گھر کے پرانے پتھر میاں ساتھ گئے، یہ مرحوم کا دوسرا بحری سفر تھا، مرحوم کی یہ ملازمت خالص فوجی نوعیت کی تھی۔ فوجیوں کو اردو، فارسی اور عربی پڑھا، مرحوم کا کام تھا۔ اس سفر پر مرحوم نے مصر، اسکندریہ، دمشق، سیریا، فلسطین، بیروت، بیت المقدس نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کی۔ پتھر میاں مرحوم کے وفادار نوکر تھے۔ مصر، اسکندریہ اور دوسرے بڑے شہروں کے عالیشان ہوٹلوں

میں پتھر میاں نے عظیم آباد کے بہت سارے اچھے ہوٹلوں سے بھی بہتر زندگی گزاری، محاذ جنگ پر بھی انہوں نے گویا آقا کا ساتھ دیا۔ مرحوم اور پتھر میاں کے لئے دو کمرے پہلے سے ہی ٹھیک تھے پتھر میاں کا کمرہ مرحوم کے بنگلہ میں تھا، پتھر میاں اپنے کمرے میں آئے کہنے لگے بابو ایسا کمرہ ملا جس میں کی ساری چیزیں ہم کیا ہمارے لکڑ دار کو پسینے میں بھی نہیں ملی ہوں گی۔

مختلف کاغذوں کی چھان بین کر کے مرحوم کی فوجی زندگی کے اسفار کا پتہ چلتا ہے۔ مرحوم فوج میں بھی اعلیٰ اور پڑھانے کے کام پر مامور تھے۔ فوجی رجمنٹ کے ۵۳ ڈویژن سے مرحوم کا تعلق تھا اور عشاریہ نمبر ۴ تھا، مرحوم جس فوجی دستہ سے وابستہ تھے اس کا نام رزسٹنس ایکسی ڈیشنری فورس (Resistance Expeditionary Force) تھا۔ مرحوم Enthofield بیروت، اسکندریہ، ریاض، حائفہ، کنارا، اسٹرا بیت المقدس، مصر وغیرہ جگہوں میں فوجی کمانڈر کے حکم سے تشریف لے گئے۔ فوجی دیپ پاس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بار چھٹی لے کر ریاض (Reyart) سے ہاتھاک بھی تشریف لے گئے ۱۹۱۸-۱۹ء کے مومنت آڈر سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم اپنی دونوں لڑکیوں سے سکندرشہ ہو کر پتھر میاں کے ساتھ اپنے وطن کے لئے روانہ ہوئے۔

مرحوم مصر اور اسکندریہ میں جہاں کپڑا سلواتے تھے اس کمپنی کا نام امام الدین محمد جان ٹیلرنگ کمپنی تھا، اس کی شاخیں مصر میں سلیمان پاشا اور کامل اسٹریٹ ۹۱ ہیں اور اسکندریہ بادو پولیس محذ علی میں تھیں۔

پانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۹ء کے اواخر میں مالک بیرونی کی سیر کرنے کے بعد وطن تشریف لائے۔ مرحوم نے فوجی ملازمت بحسن و خوبی اور نہایت دیانتداری کے ساتھ انجام دی اس کا اندازہ ذیل کے اعلیٰ افسروں کی دی ہوئی سندوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

مرحوم اپنی فوجی زندگی کے بہت سارے قصے سناتے تھے سمجھوں کہ قلم بند کرنا مشکل ہے۔

مرحوم کہتے تھے کہ میں اندول تین بار موت کے منہ سے نکلا۔ آج مرحوم کا ایک شعر یاد کرتا ہوں جو حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی غزلی کہ ایک شعر میں مرحوم فرماتے ہیں

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی اسکی تیغ تیز

پابند وہ بھی حلقہ جو ہر پس رہ گئی

ایک بار کا ذکر ہے مرحوم چند ساتھیوں کے ساتھ مجمع سے باہر رات کے وقت نکلے، رات تاریک تھی۔ یہ لوگ اگرچہ نہایت ہی آہستہ آہستہ قدم زمین پر دھر رہے تھے لیکن تھوڑی تھوڑی سی کھڑکھڑاہٹ پر دور سے گولی چلنا شروع ہو گئی، دوسرا تھی مارے گئے، مرحوم کو ایسا معلوم ہوا کہ گولی ان کے قریب سے گزری لیکن وہ بال بال بچ گئے۔

اس طرح مرحوم ایک بار قاتلانہ حملہ سے بچ گئے اس لئے کہ قدرت کو ایسا منظور تھا ان سے "تاریخ نگدہ لکھونا تھا، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کو ان کے علمی خدمات کا رہن بننا تھا۔ کتنے ادب نوازوں، ادب دوستوں، ریسرچ اسکالروں کو ان سے فیضیاب کرنا تھا۔

اوصاف و کمالات

بلخی صاحب مرحوم کے اوصاف و کمالات کو قلم بند کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بلخی صاحب مرحوم کے متعلق جو چند اہل قلم حضرات ہیں ان کے تاثرات کو قلم بند کروں۔ ڈاکٹر اختر ادوی فرماتے ہیں "میں نے جب حضرت فصیح الدین بلخی کو قریب ہو کر دیکھا ہے مجھے ان کے جسمانی وجود سے زیادہ ان کے روحانی وجود کا احساس ہوا اور جب وہ وفات پا گئے تو مجھے اچانک سادھ کا نہیں لگا، ان کے جسم کے فنا ہو جانے کا المناک اثر اس لئے گہرا نہ پڑا کہ اس کی توانا مسحرک کار فرما ساز روح آج بھی میرے لئے زندہ حقیقت ہے۔"

"ڈاکٹر کالی کنکروت، پروفیسر حسن عسکری اور حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کی اردو ادب تحقیق میں شامل ہیں، بدر و حنین ابدی ہیں دارالعلوم کی ان مقدس اردو ادب کے فیض سے ہماری مادر علمی زندہ ہے۔"

"حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ ایفیسر تھے انہوں نے مخطوطات کا انبار لگادیا اس خرمین کے خوشہ چیں کم ہیں مگر بلخی نے دولت ہے بایں جمع کر دی ہے۔ میپال، دکن، بہار اور

اتر پردیش کے گوشے گوشے سے یورپ میں بھر بھر کر قلمی نسخے بیٹھے ہیں۔ کتب خانہ خدا بخش خاں

اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ادبی خزانے کی وجہ سے عظیم آباد آج مدینۃ العلم ہے۔
 ”حضرت بلخی مرحوم مورخ، محقق اور جامع الخلق تھے۔ وہ صرف پیر تحقیق نہیں تھے بلکہ شیخ
 و سنگر بھی تھے۔ نجلے کتنوں نے ان سے فیض پایا۔ بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کے
 سلسلہ میں حضرت بلخی مرحوم سے مجھے بھی ارادت رہی ہے۔ حضرت بلخی مرحوم کی کتاب ”تاریخ مگدھ“ کے
 علاوہ ان سے براہ راست استفادہ کیا، حضرت آیت اللہ جوہری پھلوار دی کی مثنوی ”گوہر جوہری“ کا
 نادر قلمی نسخہ پروفیسر عسکری کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے جو جوہری کی نقویہ حضرت بلخی مرحوم کے انکشاف کی
 دلیل ہے، مرحوم نے کئی ریسرچ کر کے دولہے اسکالروں کی مدد فرمائی اور اس طرح کہ امداد سے وہ خود
 احسان مند ہوئے جارہے ہیں۔ نام و نمود کی غمازش، بے جا فخر و مباہات اور کبر و پنداری، بیخ کنی دیکھنی
 ہو تو کوئی بلخی مرحوم کو دیکھتا۔ ناہم بلخی سلمہ شیعہ اردو میں میرے شاگرد تھے۔ حضرت بلخی اور میرے درمیان
 مراسم قائم ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے لڑکے کے کبھی کسی قسم کی سفارش نہیں کی، وہ ان باتوں سے
 بلند تھے۔“

”ایک بار میں ان کے گھر گیا۔ دہا شریف نہیں رکھتے تھے، دور ریسرچ اسکالر میرے ساتھ تھے،
 حضرت بلخی سے انہیں تحقیقی مواد دلوانے گیا تھا، انہیں جب معلوم ہوا تو بہت متاسف ہوئے اور مجھ سے مل کر
 مدد کا وعدہ فرمایا۔ نہایت سادگی اور قناعت سے رہتے تھے۔ بڑی صاف ستھری رہائش اور مہذب
 طرز زندگی، شریفوں کا انداز اور رکھ رکھاؤ تھا۔“

”وہ بیمار تو بہت دنوں سے چلے آتے تھے لیکن دم خرم اتنا تھا کہ وہ مرض کو کب خاطر میں لاتے
 تھے۔ بڑے حوصلہ اور بہت سے تحقیق کے کاموں میں مشغول رہے۔“

”ایک روز کلیم الدین حاجت سلمہ، اور کوئی اور صاحب مجھ سے ملنے آئے اور یہ ٹیٹلٹاک خبر سنائی
 کہ حضرت بلخی خطرناک طور پر علیل ہیں۔ مجھے ملنے اور دیکھ کر ان کا دل خوش کرنے جانا چاہیے۔ آخر گیا۔
 ناہم بلخی سلمہ ان کی تیمارداری میں جی جان سے لگے ہوئے تھے۔ حضرت بلخی مجھے دیکھ کر متبسم ہوئے
 چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ بولی میں بڑی نفاہت تھی، میں نے پوچھا کیا حال ہے فرمایا آپ لوگوں
 سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے اور یہ میری غذا ہے ویسے بھوک نہیں لگتی۔ پروفیسر سید علی حیدر نیر

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ بلوچی صاحب مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں :

”ایک بار کا موقع ہے کہ میر سوز پر اپنے تحقیقی مطالعہ کی ترتیب کے سلسلے میں پٹنہ بلوچی صاحب کے شعبہ محظوظات میں گیا وہاں پہلی بار بلوچی صاحب سے ہماری ملاقات تھی۔ آپ بے حد شفقت اور رغبت سے پیش آئے۔ میر سوز کے کلام کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ جو اس شعبہ کی ملکیت ہے اس سے استفادہ کا موقع دیا علاوہ بریں ایک قدیم انتخاب کلام شوائے اردو سے بھی مطلع فرمایا جس میں میر سوز کے کلام کا انتخاب تھا اور مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔ میں چند لمحوں کی ملاقات سے بلوچی صاحب سے اس قدر متاثر ہوا جو بیان سے باہر ہے۔“

مولانا عبدالرؤف ندوی نے بلوچی صاحب سے متعلق اپنے تاثرات ”حضرت فیض الدین بلوچی کی عظیم شخصیت“ میں تفصیل سے ان کے کردار اور اوصاف و کمالات پر روشنی ڈالی ہے جس میں ان کی تحقیقی ناقدانہ، شاعرانہ صلاحیت اور ان کی تاریخ نویسی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے عقائد اعمال سے متعلق اسی مضمون میں فرماتے ہیں۔ مرحوم کے عقائد اسلامی بہت صاف اور صحیح تھے انکاد کو بڑا وظیفہ خیال کرتے تھے آپ کو آیات قرآنی کے ترجمہ اور مطالب پر عبور تھا، گاہے گاہے سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔ آپ کو بدعات اور لائینی رسوم سے نفرت اور پرہیز تھا، بدعات پر اعتراض آپ کو وراثت میں ملی تھی۔“

سید بدرالدین احمد بدر عظیم آبادی اپنے مضمون ”مولوی فیض الدین بلوچی“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں صرف تاریخ سے ان کو دل چسپی نہ تھی۔ ہر پرانی چیز سے ان کو لگاؤ تھا۔ اس زمانے کی شادیات کے جشن، ہتواروں اور میلوں کے تذکرے، پٹنہ کی گندی ہوئی محفلوں کی داستانیں۔ بلوچی مرحوم کو شعر و ادب سے ذوق نہیں تھا بلکہ وہ سخن نہم، سخن شناس اور شعر و ادب کے نکات کو جاننے والے اور اچھے ناقد تھے۔ اساتذہ کے اشعار خوب یاد تھے۔ پٹنہ کے نامی اور معرکہ کے شاعروں کے قصے یاد تھے، شاعروں کی بیٹھکیں یاد تھیں اور حضرت شاد اور الہیچ کے جھگڑے یاد تھے، ان سب کی مولائی داستانیں شکر مزا آجاتا، شعر و ادب کے ساتھ ان کی وابستگی اور ملاقات فارسی اور اردو کے منتخب اشعار کا ان کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا اس بات کی دلیل تھی کہ بلوچی صاحب مرحوم سخن نہم ہونے

کے ساتھ سخن سنج بھی تھے۔ میں نے ان کی زبانی ان کے اشعار کبھی نہیں سنے۔ جب شعرو شاعری کی باتیں نکلتیں تو وہ دوسروں کے اشعار سناتے ہوئے تنقید کرتے اور شاعرانہ نکات پر روشنی ڈالتے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بلخی صاحب اگرچہ اچھے اچھے شعر کہتے تھے مگر دوسرے شعرا کی طرح اپنے شعر کہنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے، فن عروض میں انہوں نے کتابیں لکھیں۔ نسوان ہند کے نام سے شاعرہ عورتوں کا تذکرہ لکھا مگر اپنی شاعری کا کبھی ڈھول نہیں پیٹا۔“

ڈاکٹر افضل امام ام۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی سابق ناظم شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی موجودہ پروفیسر شعبہ فارسی بی۔ این۔ کالج اپنے مضمون 'پٹنہ یونیورسٹی اور بلخی صاحب' میں رقم طراز ہیں:-

”عظیم آباد کے جن لوگوں نے ہندوستان اور بالخصوص صوبہ بہار کی تاریخ اور ادب پر گہری نظر رکھی ہے، ان میں پروفیسر عسکری، ڈاکٹر کے کے قنا (سابق وائس چانسلر مگرہ یونیورسٹی و پٹنہ یونیورسٹی) اور فصیح الدین بلخی مرحوم قابل ذکر ہیں اول الذکر حضرات کا سروکار پٹنہ یونیورسٹی سے تھا مگر بلخی صاحب سرانے کیلا اسٹیٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ عمر کا تقاضہ تھا کہ اب آرام کیا جائے مگر جنوں شوق تمنائے نامراد نگر

امید ختم شود انتظار با باقی است

انہوں نے (بلخی صاحب نے) پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک ہونے کی راہ نکالی، یہ زمانہ ۱۹۲۵-۲۶ء کا تھا جبکہ ملک سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔۔۔ لوگ ایک نئے ملک کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور پٹنہ کے پچند اہل علم ایک علمی مرکز کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے جو آج شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دو سکشن ہوئے۔ ایک فarsi، عربی، اردو اور دوسرا ہندی، سنسکرت اور مغربی مگر بلخی صاحب اگرچہ انچارج عربی و فارسی کے تھے مگر شعبہ کی تمام ذمہ داریاں انہیں کے سر تھیں، وہ ناظم شعبہ مخطوطات سمجھے جاتے تھے۔

مرحوم کو شعبہ مخطوطات سے کیا شغف تھا صرف وہی حضرات بیان کر سکتے تھے۔ کرسی بغرض روشنی کھڑکی کے قریب کر لی گئی خود کو اس پر اس طرح چکور بیٹھے ہیں کہ ٹخنہ ٹھوڑی سے ملا ہوا ہے ہاتھ میں ایک بٹا شیشہ ہے۔ آنکھ شیشہ سے لگی ہوئی ہے اور شیشہ کتاب سے۔ اس عالم انہماک میں

اگر کوئی صاحب ذوق تشریف لے آئے تو خیر علمی گفتگو شروع ہوئی ورنہ صرف ایک سگریٹ دے کر انہیں واپس کر دیا۔ دفتر کی حاضری ان کا مذہب تھا۔ بارہ برس میں ایک روز بھی غیر حاضری اخذت پر نہیں رہے۔ اس طرح سلسلہ سے ۱۹۵۹ء تک وقت گزرتا رہا سلسلہ میں نقاہت کے آثار نمایاں ہوئے پھر بھی یارا ان میکدہ اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ بلخی صاحب کو آرام میسر ہو۔ اگست ۱۹۶۹ء سے آخری مہینوں کی دور دھوپ کے بعد انہیں اجازت ملی کہ وہ اپنا سلسلہ یونیورسٹی سے ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں۔

ان کی دفتری ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ ریسرچ اسکالرشپ پر مکمل معاونت، مخطوطات کی فراہمی ان کی فہرست کا کیٹلگ تیار کرنا۔ نادر نسخہ کی طباعت، برٹش میوزیم انڈیا سے کسی نسخہ کی حاصل کردگی وغیرہ۔ سکشن کے قیام کے بعد تقریباً جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو فارسی یا تاریخ میں ریسرچ ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلا استثنا بلخی صاحب کی مرہون منت ہیں، خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کر لیا جو بچ گئے وہ اب تک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم سے متعلق پروفیسر عبدالغنی کا مضمون ”سودہ بھی خوش ہے“ کہ چند اقتباسات دئے جاتے ہیں جن سے مرحوم کی شخصیت اور ساتھ ساتھ اوصاف و کمالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

”عظیم آباد میں مجھے قلندروں کی جوڑی نظر آئی، ایک بلخی دوسرا عسکری۔ ان صاحبوں کے متعلق لفظ قلندر پر یقین نہ آئے تو مرحوم موجود کی صورت و سیرت کے متعلق آپ ان کے کسی واقف حال سے پوچھ لیجئے۔“

قلندری کے اوصاف اس نقشے میں اتنے نمایاں ہیں کہ صرف ان کا بیان سن کر آپ انہیں پورے شہر میں ڈھونڈ نکال سکتے ہیں۔

بلخی صاحب نہایت متانت کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں اس طرح بلخی صاحب کو گفتگو میں شبنم کی طرح پھوار اور عسکری صاحب کی گفتگو میں بارش کا میلان۔

انوکھی وضع کے یہ عاشق تحقیق بڑی استواری کے ساتھ اپنے مخصوص قماش کے نامزد دار رہے۔

بلخی صاحب کی ذات بہار میں خصوصاً عظیم آباد میں ہونے والے ہر علمی کام کا مرجع امید تھی مجھے

معلوم ہے کہ بلخی صاحب ایک زمانے میں شاد کی علمی مخالفت کے سربراہوں میں رو چکے ہیں چنانچہ فن شاعری میں شاد کے نقائص کو ایک رسالے "انشاد شاد" میں بیان کر چکے ہیں۔ اس پس منظر میں میرا گمان تھا کہ شاید وہ مجھ سے تعاون نہ کریں لیکن اس دور کے عظیم آبادی میں شاد کے معاملات کی واقفیت بلخی صاحب سے زیادہ کسی کو حاصل نہ تھی لہذا ۱۹۵۹ء میں شاد کی رہگذر کا سراغ لگانے کے لئے بلخی صاحب کے در پر نذر بار جانا پڑا۔ میرے سلام کرنے کے بعد کرسی کی طرف بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ خیریت کے بعد مدعا پوچھا اس کے بعد بغیر کسی تامل اور تکلف کے گھنٹہ بھر اس دلوے سے باتیں کرتے رہے..... جیسے یوم شاد کا انعقاد انہیں کی تجویز پر ہو رہا ہے.....

آپ سمجھتے ہوں کہ شاد کے متعلق ان کے خیالات بدل گئے ہوں لیکن آپ کو سن کے حیرت ہوئی چاہئے
کہ یوم شاد کے متعلق مذکورہ تمام کرم فرمائیشوں کے ساتھ ہی یعنی صاحب نے اہتمام کے ساتھ مجھے اپنا
کتابچہ ”انشاد شاد“ اس مہیہ کے ساتھ دیا کہ شاد کی شاعرانہ عظمت مسلم لیکن ان کے نقائص کو بھی ہمیش
کمزور چاہئے تاکہ ان کی پوری شخصیت دیا رفتاری کے ساتھ سامنے آئے ورنہ علم و تحقیق کے ساتھ انصاف
نہیں ہوگا۔

بلخی صاحب کی یہ انسانیت وسیع المشربتی تک پہنچ گئی تھی۔ عمر کے درمیانی حصے میں وہ اجڑا ایمان کی جستجو میں لگ گئے تھے یہاں تک کہ جو یائے حق اپنی ہکری اسلامیت کے باوصف اشتراکیت تک کو گوارا کرنے لگا تھا۔ بہر حال عقیدے کی یہ پیکداری کسی مصالحت کے طور پر نہیں تھی غرض مندی اور مفاد پرستی سے مرحوم بالاتر تھے۔ یہ وسیع المشربتی دراصل اس صوفیت کی ایک شکل تھی جو بلخی خاندان کے امتیازی ورثہ میں رہا ہے۔ ایک بار بلخی صاحب میرے گھر پر یا اپنے گھر میں والد صاحب اور ہم لوگوں سے معروف گفتگو تھی موضوع اسلام کی تبلیغ کا تھا۔ بلخی صاحب پہلے تو اس کی ضرورت اور اہمیت پر بات کرتے رہے اس کے بعد تبلیغ کی علمی تدبیر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک چونکا دینے والی بات کہی۔

”کہتے ہیں کسی کو مسلمان بنانے کے لئے پہلے کلہ پڑھانے کی ضرورت نہیں اس کی بجائے اسے سب سے پہلے ان صالح اعمال کی تلقین کی جائے جنہیں وہ علم انسانی نیکی سمجھ کر قبول کر لے۔“

سہیل عظیم آبادی کے مضمون ”بلخی صاحب“ سے بھی کافی حد تک مرحوم کے لواحق و کمالات پر

معمولی طور طریقے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات، کچھ مقبرے کے کتبے کی نقلیں اور کچھ فراہم کی نقلیں جو انہوں نے بڑی کاوش سے حاصل کی تھیں، سچی بات یہ ہے کہ مجھے مل کر بہت مایوسی ہوئی۔ بڑے آدمیوں کے خیال کے ساتھ جتنی باتیں ذہن میں عام طور پر آتی ہیں ان میں سے کوئی بات ان میں نہیں تھی۔ اگر تعارف نہ ہوتا تو شاید ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، لیکن تعارف ختم ہو چکا تھا۔ پھر جو انہوں نے ان کتبوں اور فراہم کے بارے میں باتیں شروع کیں تو جیسے علم کے سمندر میں طوفان اُگیا۔ بات ختم ہوتی ہی نہ تھی۔ جب ۱۹۴۹ء میں رانچی سے پٹنہ واپس آگیا تو بمبئی صاحب مرحوم ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً پٹنہ آ گئے تھے اور ملازمت بھی چھوٹی سی ریاست کی یعنی ان کے پاس کوئی بڑا اندر وختہ نہیں تھا مگر انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ واقف یہ ہے کہ وہ کبھی اس سلسلے میں بات کرتے ہی نہیں تھے۔ جس حال میں تھے خوش تھے۔ جب بھی باتیں ہوتیں تو وہ اپنی نئی تحقیق کی باتیں سناتے، اندازوں میں نے ایک روز انہ اخبار جاری کیا تھا، مالک بھی تھا اور ایڈیٹر بھی۔ بڑی مصیبت میں مبتلا تھا لیکن ان کے عزم و استقلال اور لگن کو دیکھ کر بڑی ہمت بندھ گئی۔ وہ بزرگ تھے اور میں ان سے بہت چھوٹا۔ میں بڑی نیاز مندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ بالکل دوستانہ برتاؤ کرتے ایک دن میں نے پٹنہ کے جواں مرگ شاعر ضیاء عظیم آبادی کا ذکر کیا تو ان کی ساری داستان سنا گئے۔ پھر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سنہال نے انہیں پٹنہ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر مقرر کیا۔

”انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ان کے پاس ایک بڑی لائبریری تھی اور وہ ان کتابوں سے کام لے سکتے تھے۔ اتنی عمر میں ناشتہ کرنے کے بعد لائبریری آ جلتے تھے اور شام تک وہاں پڑھتے رہتے۔ انہوں نے اس شعبہ کو بڑی ترقی دی اور بہت سے علمی نسخے اس لائبریری کے لئے جمع کئے۔ پٹنہ یونیورسٹی کا شعبہ ان کی انتھک محنت کی دین ہے۔“

”میں نے جب ”ماہانہ تہذیب“ جاری کیا تو ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتا ان کی عادت تھی جب کوئی کام شروع کر دیتے تو درمیان میں اسے کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ جب میں نے ان سے مضمون کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً وعدہ فرمایا۔ پہلے ضیاء عظیم آبادی مرحوم پر ایک مفصل مضمون لکھا پھر ایک بے حد قیمتی مضمون ماہ و سال کی تعریف پر اور ایک مضمون عروض و موسیقی کے تعلق پر۔ یہ سارے

مضامین نہایت ہی عالمانہ تھے۔ افسوس یہ ہے کہ آخری مضمون کی اشاعت کی نوبت نہ آئی اور ”تہذیب“ بند ہو گیا۔ اور یہ مضمون کسی دوسرے رسالے کی زیر نیت بنا۔“

”فصیح الدین بلخی مرحوم علم کے کمندر تھے، انہیں صرف ادب یا تاریخ ہی سے دلچسپی نہیں تھی انہیں فنون لطیفہ کے ہر شعبے سے گہری دلچسپی تھی اور اس کے بارے میں ان کی معلومات بہت اچھی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار علم نجوم کی بات چلی تو وہ علم نجوم کی بہت سی بات بتا گئے۔ پٹنہ اور بہار کے بہت سے نامی نجومیوں کی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن یہ کبھی فرمایا کہ یہ فن بہت مشکل ہے اور مسلسل ریاضت چاہتا ہے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھے۔ کثرت مطالعہ اور شب بیداری نے ان کی صحت کو اور بھی ہلکا کر رکھا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی.....

اور وہ بھی اس لئے کہ طالب علم اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی.....

میں نے کئی بار ان سے کہا کہ ریڈیو کے لئے کچھ وقت نکالیں لیکن انہوں نے معذوری ظاہر کی.... پھر بھی میرے اصرار پر نواب امداد امام اثر پر ایک تقریر نشر کی۔ ان کی موت سے بہار ایک مایہ ناز محقق اور عالم سے محروم ہو گیا جس کی جگہ بہت دنوں تک خالی رہے گی۔“

قیوم خضر ایڈیٹر ”اشارہ“ بلخی صاحب سے متعلق اپنے ”ناشراتی خاکہ میں لکھتے ہیں :

”دسمبر ۱۹۵۷ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں نے دوبارہ ”اشارہ“ نکالنے کا مشورہ طلب

کیا تو خاموش سوچنے لگے۔ غور ہی دیکر کہا ہنوں نے کہا خضر صاحب میں کسی کو بھی بہار میں رسالہ

نکالنے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں اگر آپ کہتے ہیں تو ضرور نکالیں۔ بیسوں سے تو نہیں مگر مضامین سے

ضرور مدد کروں گا۔“ بلخی صاحب نے اپنا یہ وعدہ مرتے دم تک نبھایا۔ مجھے غور ہے کہ بلخی صاحب کے

جتنے مضامین ”اشارہ“ میں چھپے، بہار کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں چھپے۔ وہ ہر لمحہ میری ترقی و

کامیابی کی دعا کرتے رہے اور علیٰ طور پر بھی جو ممکن ہوتا گریز نہیں کرتے۔“

”وہ تو کافی کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے مگر جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ دن اور جیتے، ان کے

مرنے کے بعد میں جانتا ہوں کہ کتنے نوجوانان کے دانش علم و تحقیق کے بے ثمری پر مہر لگ چکی ہے، سال

تک انہوں نے زندگی کے چراغ کو اس طرح روشن کیا کہ اس کی روشنی میں زندگی کی راہوں کو روشنی کر سکتے ہیں۔“

”بلخی صاحب مرحوم اگرچہ اپنی وضع داری کے اعتبار سے درویش نظر نہیں آتے تھے لیکن روشنی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ فقیروں، درویشوں اور صوفیائے کرام سے ان کا دلہانہ تعلق تھا، ان کے اوصاف و کمالات کے پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے سید شاہ تھیں بلخی سجادہ نشین خاندانہ فردوسیہ فزویہ کے مصنف ”عقیدت فصیح الدین بلخی بمخدوم شرف الدین“ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

”آہ کس دل و جگر سے محترم سید فصیح الدین بلخی مرحوم و مغفور کے متعلق اظہار خیال کیا جائے! وہ پیکرِ خلاص و خلوص تھا، وہ جو صاحب فضل و جود تھا جس کا ہر بول علمی میدان کے اصناف و فنون میں سند (Authority) تھا جس کی ساری زندگی و مصروفیت کو سہارا دینے کے لئے وقف تھی۔ جس کی حیات کا ہر لمحہ مقالے، تھیسس لکھنے والوں کو تاریخ و تذکرہ کے تاریک گوشہ اور پہلو کا جاگرتا ہونے کے لئے مشعلِ راہ تھی۔“

خیال آیا کہ موصوف مرحوم کی اس عقیدت پر روشنی ڈالی جائے جو مذہب و روحانیت کے ساتھ عموماً اور حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بلخی مینرگی کے ساتھ خصوصاً اس مادی دور میں وہ رکھتے تھے کیونکہ یہ مشکل ہی سے احساس کیا جاسکتا ہے کہ ایک مغربی لباس میں اپنے خف و ناتواں جسم کبھی ایسا حساس و سقراطی دل بھی رکھ سکتا ہے جو ایک ملکی سی فیس پر ٹرپ اُٹھے۔

میں نے بار بار حضرت مخدوم الملک کے ذکر پر ان کی اشکار آنکھیں دیکھی تھیں، میں نے اکثر ان کی زبان سے حضرت مخدوم کا تذکرہ جس عقیدت و دلہانہ انداز پر سنا ہے اس کا کیف اس کی لذت اب تک فراموش نہیں کر سکا ہوں۔“

بستر مرگ سے لے کر لحد تک فصیح الدین بلخی مرحوم سے متعلق جو پہلو قابل ذکر ہے اس کا اندازہ علیم الدین بلخی ندوی لکچرر طبیہ کالج پٹنہ کے مصنف ”ایک روشن دماغ تھا نہ رہا“ سے ہوتا ہے۔

میں مرحوم کو جب بھی ہسپتال میں دیکھنے گیا انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں بھی بہ ہوش و حواس پایا۔ اکثر بہت متحرک نظر آتے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تسبیح و تحلیل میں مشغول ہیں۔ درجہ نماز ظہر

کے بعد مرحوم کی صلوٰۃ جنازہ ہوئی اور تین بجے انہیں پٹنہ سیٹی کے محلہ دوندی بازار میں مولانا سید امین اللہ جو پٹنہ سیٹی کے ایک ممتاز جید عالم دین تھے اور مرحوم کے نن کسر تھے کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم کا چہرہ اس خالداں میں کھلے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا نظر آ رہا تھا جیسا کہ زندگی میں ہمیشہ نظر آیا کرتا تھا، چہرہ پر اس وقت بھی وقار، تمکنت پوری طرح نمایاں تھی، لبوں پر وہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو ایک مرد مومن کے لبوں پر ایسے وقت کھیلا کرتی ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم

ہوں مرگ آیتہ سم برب اوست

سطور بالا میں جو اقتباسات چند مشہور اہل قلم ادیبوں اور علمائے دین کے پیش کئے گئے ہیں ان سے حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم کے اوصاف و کمالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے پیش کئے جانے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ مرحوم راقم کے دادا تھے اور رشتے کی قرابت کے سبب اگر انہیں نظر انداز کر کے مرحوم کے اوصاف و کمالات کو قلمبند کیا جاتا تو مدحت سرائی کے الزامات راقم پر عائد ہونے کے اندیشے تھے۔ ماسوا اس کے مرحوم کے اوصاف و کمالات سے متعلق رہنمائی بھی اس مقالے کی ترتیب میں ان مضامین سے راقم کو ہوئی ہے جس کا اظہار بھی ضروری ہے۔

یوں تو مرحوم کی تمام عمر عہد طفلی سے لیکر سفر آخرت تک اوصاف و کمالات کی حامل رہی، مرحوم کے انتقال کے بعد رسالہ کوئی "ڈائلنگ گنج" کے ادارے نے نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ فصیح الدین بلخی نمبر نکالا جائے۔ بہت سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔ کافی حد تک مضامین کی فراہمی ہو چکی تھی۔ تقریباً ان سب ہی اہل قلم نے معاونت کی پوری پوری توقع دلائی تھی، جن کے مضامین حاصل نہ ہو سکے تھے اور بہت ساروں نے وقت کی پہلی فرحت میں مضامین قلم بند کر کے ارسال فرمائے لیکن رسالہ مذکور معاشی بحران کا شکار ہو گیا اور منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جتنے مضامین دستیاب ہوئے تھے ہنوز محفوظ ہیں اور ان سے اس مقالے کی ترتیب میں حد درجہ مدد لی گئی ہے، مختصر یہ کہ سطور بالا میں درج اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ مرحوم ازل سے اوصاف و کمالات کے کراس دنیا کے فانی ہیں لیکن دنیا کے بے شمار علوم سے ان کی گہری واقفیت نے ہمیشہ ان کے اوصاف و کمالات کی جلا کی اور قدرت نے جو ذہانت اور بیداری شعور

انہیں عطا کی تھی ان سے تا دم مرگ ان کے علوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر کسی پر نمایاں نہیں ہوتا تھا کہ ان کی ہستی علم کا مندر ہے لیکن ان کے باطن سے جن کی وابستگی ہو جاتی تھی ان کی شخصیت ان کو حیرت میں ڈال دیتی تھی، ہر نوعیت کے علم کو پڑھ لینا دوسری بات ہے لیکن اپنے ذہن کے گوشوں میں محفوظ کر لینا ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ جس میں ایسے اوصاف و کمالات ہوں گے اس کو دنیاوی و دینی علوم کا چلتا پھرتا اور بولتا ہوا (Encyclopedia) کہا جائے گا۔ مگردالوں کو اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی علم سے اپنی پیاس بجھانے والے نے اگر کتبوں، مخطوطات یا کتابوں میں چھپے ہوئے رموز و نکات کی عقدہ کشائی کے لئے ان سے درخواست کی تو فوراً انہوں نے قلم اٹھانے سے انہوں میں لینے کے لئے ایسا کہا اور اس طرح تقریر شروع کر دی جیسے کہ اپنے سوالات کو حل کرنے کے لئے کوئی طالب علم اسباق کو یاد کر لیتا ہے اور بوقت امتحان اس کے قلم اگلنے لگتے ہیں۔

مرحوم کے زیادہ تر اوقات کرب بنی اور انشا پر دازی میں گزرتے تھے۔ مجموعی طور پر ہر صاحب علم اپنے مذاق کے مطابق کوئی نہ کوئی خاص راہ نکال لیتا ہے اور اس کا Taste ذہن تک محدود رہتا ہے لیکن مرحوم کی علمی شخصیت اس مقابلے میں خصوصی انفرادیت رکھتی تھی کہ علوم کے معاملے میں وہ کسی خاص Taste تک اپنے کو محدود نہیں رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فنون لطیفہ کا جہاں تک تعلق ہے موسیقی، خطاطی، مصوری، رقص، ادب وغیرہ تمام صنفوں کا نہایت ہی گہرا مطالعہ ان کا تھا، ان کے ذہن میں علوم کا جہاں تک تعلق ہے تصوف کے تمام رموز و نکات کی انہوں نے چھان بین کی تھی ان سبوں کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباسات سے ہوگا۔

مختصر یہ کہ فیض الدین لمبھی مرحوم کے اوصاف و کمالات کو بیان کرنے کے سلسلے میں صرف یہی کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے محقق و ناقد تھے۔ ایک اچھے شاعر تھے یا ایک نامور مورخ۔ جس قدر علوم ان کے سینے میں محفوظ تھے اس کا بہ مشکل ایک تہائی حصہ انہوں نے چھوٹا جس کے کچھ حصے مطبوعہ ہیں اور کچھ ہنوز مخدوم طباعت رہے۔ ان کے علوم کا اکثر سرمایہ ان کے سینے میں محفوظ رہا، آرزو انہیں ضرور تھی کہ انہیں بھی بطور یادگار چھوڑ جائیں لیکن وقت اور علیم الفرستی نے انہیں موقع نہیں دیا اس لئے انہوں نے ایسا شعر کہا ہوگا کہ

یوں دل کی آرزو دل مضطرب رہ گئی

تاندھی سی اٹھکے گنبد بے در میں رہ گئی

مذکورہ بالا سطور میں جو انتہا سادات فصیح الدین بلخی مرحوم کے اوصاف و کمالات کو بیان کرنے کے سلسلے میں پیش کئے گئے ہیں وہ زمرہ دارانِ اہلِ قلم حضرات کے ہیں۔ یہ اہل قلم حضرات ان کی عالمانہ شخصیت سے متاثر تھے اور متاثر میں چنانچہ ان کی علمیت کو مد نظر رکھ کر ان کی خوبیوں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کا اس اعتبار سے ان کے ساتھ گہرا تعلق نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ان کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جیسا کہ ان کے گھر والوں کا ان کے ساتھ تھا جنہوں نے بہت قریب رہ کر ان کی حالت کو دیکھا۔ ان سے انتہائی قربت کا جہاں تک تعلق ہے ان کی شریک حیات ان کے لڑکے کے سوا کسی دوسرے کو نہیں پیش کیا جاسکتا۔

ان کی ازدواجی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اول تا آخر خوشگوار رہی۔ ان کی شریک حیات تادم آخر دائم المرض تھیں۔ مرحوم نے اپنی شریک حیات کا تازہ زندگی ہر ممکن علاج کیا لیکن اس کا بھی کچھ حوصلہ افزا نسخہ برآمد نہ ہوا اسی غم سے وہ زندگی بھر متاثر رہے لیکن صبر و تسکین اور تحمل و قناعت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ ان کی شریک حیات کہتی تھیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرحوم جب فکر معاش میں حدودِ جبر پریشان تھے اور گھر کی ساری پونجی ختم ہو گئی تھی تو فاقہ سے بُرا حال تھا۔ اہل ہاں نے اس کا اظہار اپنے شوہر کی اجازت سے اپنے میکہ والوں سے کرنا چاہا، مرحومہ ایک چھوٹے موٹے دال روٹی میں خوش زمیندار کی بیٹی تھیں جس کا ذریعہ معاش اس کے علاوہ پیشہ طبابت بھی تھا۔ اگر ادھر خبر ہوئی تو فوراً یہ دشواری حل ہو جاسکتی تھی۔ مرحوم نے قرآنِ کریم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: خدا جس کو پیدا کرتا ہے اس کے رزق کا سامان ہیا کرتا ہے یہ کہتے ہوئے اُسے گھر کے اندر خانہ تلاشی میں مشغول ہو گئے۔ ایک ٹوکڑ میں کچھ پانی شیشیاں دواؤں کی جمع تھیں، شریک حیات کو کہا گیا کہ ان شیشیوں کو دھویا جائے۔ جب شیشیاں دھوی گئیں تو انہیں قھیلا میں رکھا گیا اور مرحوم ہاتھ میں قھیلا لے کر باہر چلے گئے بازار سے کچھ چیزیں آئیں اور کھانا پکا اور ناقوں کی آگ بجھائی گئی۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ غیر متوقع طور پر سرائے کیلا سے ریویو نواز فسر کا پردانہ ملازمت

آیا۔ ایک عرصہ ہوا تھا کہ مرحوم نے درخواست بھیج دی تھی مگر انتظار اس کا تھا کہ انٹرویو میں بلایا جائے گا۔ لیکن یہاں تو سیدھے پروانہ ملازمت آگیا۔ پاس میں صرف دو تین کھدر کے کرتے اور پا جاے تھے۔ آپس میں مشورہ ہوا کہ زیور رہی رکھ کر کچھ کپڑے جلد از جلد بنوائے جائیں اور ریل کے کرائے کی صورت نکالی جائے تاکہ دوسرے روز مرحوم روانہ ہو جائیں۔ اس بیچ میں بڑے بھائی صاحب حفیظ الدین بلخی مرحوم ایک بیک تشریف لے آئے اور فوراً حکم دیا کہ تم آج ہی رات کو روانہ ہو جاؤ۔ مرحوم نے معذوری ظاہر کی اور دوسرے دن روانہ ہونے کے ارادے سے انہیں آگاہ کیا، بڑے بھائی فوراً تارکے کچھ بولے نہیں پہلے گھر واپس گئے وہاں سے چتی میاں کو بھیجا کہ وہ فوراً مرحوم کو اپنے ساتھ لے آئیں۔

مختصر یہ کہ رات ہوتے ہوتے کپڑوں کا انتظام بھی ہو گیا اور مرحوم اس روز نوکری پر روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ سے ان کے ضبط و تحمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے صاحبزادے نادم بلخی کا کہنا ہے کہ اگر مرحوم کو اپنے لڑکے کی حرکت ناگوار معلوم ہوتی تو بجائے غصہ کرنے کے وہ سمجھاتے تھے اور حق و صداقت کو انہوں نے کبھی بھی اپنے ہاتھ سے جلنے نہیں دیا۔ اس سلسلے میں دو مثالیں نہایت دلچسپ ہیں۔ مرحوم چند دنوں ریاست سرانے کیلا میں مجسٹریٹ تھے۔ ایک بھنیاں مرحوم کے بنگلے پر دو نانہ تین وقت صبح، دوپہر اور شام کنویں سے پانی بھر کر پہنچاتا تھا، پانچ برسوں تک دگٹا رپانی بھرنے کی ملازمت ان کے یہاں وہ کر چکا تھا، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چوری کے مقدمہ میں وہ ماخوذ ہو گیا۔ الزام اس پر ایک شخص کے بیل چرانے کا نہیں تھا بلکہ رنگے ہاتھ کپڑے جانے کا بھی تھا۔ مقدمہ بھی مرحوم کے اجلاس میں تھا۔ اس واقعہ نے گھر کے اندر کھلبلی مچادی تھی۔ مقدمہ کے سلسلے میں کسی کو سفارش کی ہمت نہیں تھی پھر بھی مرحوم سے اس پر نگاہ کرم کے امیدوار ضرور تھے۔ سمجھوں کہ اس رویہ سے ظاہر تھا کہ جب مرحوم نے فیصلہ سنایا تو پولیس نے فوراً ہتھکڑی ڈال دی۔ بے چارہ چارہ ماہ تک قیدداشت کے بعد دن گزار کر گھر لوٹا تو وہ سب سے پہلے بنگلے پر آیا اور تاروں پر گر کر معافی مانگنے لگا اور گھر والوں سے بھی سفارش کی التجا کی کہ اس کی ملازمت برقرار رہے۔

چار ماہ تک جب وہ جیل خانہ میں رہا، پانی کی گھر کے اندر سخت دشواری رہی اس لئے کہ بنگلے سے کنواں دور تھا۔ گھر کا نوکر حبیب حد درجہ مشغول تھا غرض کہ مشکل سے پانی کا انتظام ہوتا تھا

لیکن جب وہ واپس آیا تو اسے ملازمت پر بحال کر لیا گیا اور وہ ۱۹۲۶ء تک کام کرتا رہا اور اس وقت چھوڑا جبکہ مرحوم اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ حقیقت کے جاننے کے لئے بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی مقدمہ کے سلسلے میں مرحوم جائے وقوع کا معائنہ کرنے کے لئے نکل جاتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شریف بنگالی جس کا نام "گورا بابو" تھا کچھ دشمنوں نے انہیں ایک مقدمہ میں پھنسا دیا اور صورت یہ پیدا کی گئی کہ ایک بدچلن عورت کو ایک تاریک گلی میں جدھر سے بنگالی بابو اپنے گھر جاتے تھے کھڑا کر دیا۔ کہنے کے لئے اس مقدمہ میں چشم دید گواہ بھی تھے لیکن مرحوم کا کہنا ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد کا معاملہ کھل کر سامنے آیا۔ چنانچہ کئی گواہوں نے بیان میں اندھیری رات کا ذکر کیا حالانکہ چاند کی بارہویں تاریخ تھی اس وقت چاند کی روشنی کو شاہ پر ہونا چاہئے تھا چنانچہ جائے وقوع کا معائنہ کرنے کے بعد مقدمہ جھوٹا ثابت ہوا، چنانچہ بے قصور بنگالی کو رہا کر دیا گیا۔

مقدمہ کے فیصلے کرے والے ایک حاکم کی حیثیت سے ان کی ذات کو فخر حاصل تھا کہ ان کے فیصلے اپیل میں ان کی مجسٹریٹ کی لگ بھگ بیس یا بائیس برسوں کی زندگی میں دو چار ہی ٹوٹے ہوں گے۔ یہ گھروالے جانتے ہیں کہ مرحوم نے عمر بھر سیاہ جوتا اور سیاہ موزہ کبھی نہیں پہنا۔ ان کے صاحبزادے نے ایک بار اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے صرف یہی کہا کہ میرا جی نہیں چاہتا اور طبیعت گوارہ نہیں کرتی اس لئے کہ خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرحوم سنگھ بھوم کے جنگل میں ہرن کے شکار میں پایادہ جا رہے تھے۔ لڑکے کی عمر بارہ سال کی ہوگی۔ سربراہ ایک میدان کے کھلے حصے میں جنگلی کبوتروں کا ایک بڑا قبضہ تھا ساتھ ہی مرحوم کا حد درجہ شوخ و عزیز Orderly سمٹے سام نامی ایک کول تھا دونوں نے کبوتر کے شکار پر زور دیا۔ مرحوم خاموش آگے بڑھتے رہے۔ چنانچہ دونوں کو اس کا بہت افسوس ہوا اتفاق سے ہرن کے شکار میں بھی ناکامی ہوئی گھر آنے پر لڑکے نے پھر ان جنگلی کبوتروں کا ذکر کیا اس پر مرحوم نے فرمایا کہ کبوتر کے شکار کے لئے میرے ہاتھ کبھی نہیں اٹھتے۔ اگرچہ کبوتر حلال پرندہ ہے۔ خیال فوراً دماغ میں آتا ہے کہ کبوتروں کا مسکن خانہ کعبہ بھی ہے۔

ان کی زندگی کے تعلق رکھنے والے یہ نہایت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں ان پر غور کیجئے تو ان کے مذہبی جذبوں، ان کے اوصاف و کمالات کے باریک پہلوؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے واقعات

عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ اوصاف و کمالات کہاں تک بیان کئے جائیں اس کے لئے ایک دفتر چاہئے۔
چند باتوں پر اکتفا کیجئے۔

وفات

فیض الدین بلخی مرحوم پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے آخری دنوں میں گرمی کے مرض میں مبتلا ہوئے
چنانچہ اس مرض نے بھیانک شکل اختیار کر لی اور جان لیوا بھی ثابت ہوا حالانکہ یونیورسٹی کے اعلیٰ حکام
اس بات کے خواہش مند نہیں تھے بلخی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوں۔

ایک روز بلخی صاحب مرحوم جب یونیورسٹی سے شام کے وقت اپنے گھر لوٹے، دوسرے دن
علی الصباح انہیں قارورہ میں خون آنے لگا۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے مرض کا معائنہ پٹنہ کے مشہور
ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر اسے کے سین سے کرایا لیکن جہوں نے مرض سے اچھے ہونے کی ناامیدی ظاہر کی۔
بلخی صاحب مرحوم کو گردے کا یہ مرض ۱۹۶۱ء کے آخری مہینہ میں شروع ہوا اس درمیان ان کا علاج
ہوتا رہا لیکن خاطر خواہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر کار جنوری ۱۹۶۲ء کے آخری ایام میں اس مرض نے سخت
پیشہ کی اختیار کر لی۔ بلخی صاحب مرحوم اپنی ذلیت سے ناامید ہو گئے۔ بلخی صاحب مرحوم کا داخلہ ڈاکٹر
ہاشم اور ڈاکٹر اردلی۔ پی۔ سنہانے پٹنہ ہسپتال کے راجندر سر جیل بلاک میں کرایا جہاں ان کا علاج
ہوتا رہا انہیں کسی بار خون چڑھانا بھی پڑا، ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے پروفیسر نادر بلخی نے بھی اپنا
خون دیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی عیادت کے لئے کافی حضرات دوران علاج ہسپتال آتے رہے ان میں

ڈاکٹر انوار الدین مرحوم، ڈاکٹر صدر الدین فصاح مرحوم، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر قیام الدین احمد،
ڈاکٹر منیر اقبال اور پروفیسر عبدالمغنی کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ یونیورسٹی کے ارکان
بھی ان کا مزاج پرسی کے لئے آتے رہے، ماسوا اس کے بلخی صاحب مرحوم کے بہت سارے ملاقاتی
اور شہر کے نرے حضرات ہمارے ہسپتال میں آتے رہے۔

بلخی صاحب مرحوم کی علالت کے دوران ان کے رشتہ داروں میں ان کے ہم زلف سید

عبدالرحیم احمد مرحوم، ان کے بھتیجے شفیع الدین مرحوم، ان کے نسبتی برادر زادہ سید امین امین بلخی اور

ان کے رشتہ کے بھانجے سید نہال حسین ان کی تیمارداری میں برابر پیش پیش رہے۔

آخر وہ گھڑی آگئی جس کا انتظار بلخی صاحب مرحوم کو خود تھا یعنی ۱۳ مارچ کی شب کو گذار گئے۔
یعنی ۱۴ مارچ کی رات کے ایک بج کر بیس منٹ پر بلخی صاحب مرحوم کی روح عنقریب پرواز کر گئی۔
بلخی صاحب مرحوم کے وصال کے وقت ان کے صاحبزادے نادم بلخی، ان کے ہم زلف محمد علی سید رحیم الدین احمد ان کے بھتیجے سید شفیع الدین بلخی مرحوم اور ان کے بھانجے سید محمد علی الدین احمد موجود تھے۔

صبح کے وقت ان کی میت گھر پر لائی گئی اور ان کی تجہیز و تکفین کا سامان شروع ہوا، حالانکہ بلخی صاحب مرحوم نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی کہ کہاں ان کو دفن کیا جائے۔ بلخی صاحب مرحوم کے صاحبزادے نادم بلخی نے یہ کوشش کی کہ انہیں اپنے آبائی قبرستان موضع جمٹھی میں دفن کیا جائے جہاں ان کے والد ڈاکٹر غیاث الدین بلخی مرحوم اور ان کی والدہ بی بی ہاجرہ مرحومہ آرام فرما ہیں لیکن اس میں ناکامی ہوئی، آخر کار بلخی صاحب مرحوم کے برادر نسبتی سید محمد بشیر بلخی کے صاحبزادے جناب امین اشرف بلخی نے انہیں محلہ دوندی بازار میں ان کی آخری آرام گاہ بننے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کو ان کے نز سسر جناب سید شاہ امین اللہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد صوبہ بہار کے مختلف ادبی رسالوں نے اپنے ادارہ میں اظہار تاسف کیا، ان میں رسالہ صبح نو پٹنہ، رسالہ اشارہ پٹنہ، رسالہ سہیل گیا اور رسالہ کوئل ڈالٹون گنج کے مدیروں نے اپنا الگ الگ اظہار تاسف کیا۔

رسالہ 'صبح نو' کے مدیر جناب وقار ملک پوری اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں بلخی صاحب کی موت کا ناثر "ایک شمع تحقیق بجھ گئی" کے عنوان سے لکھتے ہیں :

لے "گذشتہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو چند دنوں کی علالت میں اردو کے مشہور اہل قلم جناب سید فصیح الدین بلخی مرحوم نے انتقال فرمایا، مرحوم اردو کے ایک کہنہ مشق لکھنے والوں میں تھے بالخصوص تحقیق و تنقید میں ان کا اہم مقام تھا، تمام عمر لکھنے لکھانے میں گذاری اور آخری وقت تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے اور یہ تمام علمی اور قلمی خدمتیں سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں کی پابندی میں رہ کر انجام

مرحوم نیک اور پاک باطن بزرگ تھے اپنے خردوں سے بھی بڑی محبت و شفقت اور
فروتنی سے ملتے تھے، نئے لکھے والوں کی ہمت افزائی کرتے بلاشبہ ان کی
موت اردو کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے جناب مرحوم کے وابستگان میں ان کے
لائق فرزند پروفیسر ناظم بلخی سے ولی ہمدردی ہے، خدا ان کو صبر اور مرحوم کو جوار رحمت عطا
فرمائے۔

رسالہ اشارہ کے مدیر جناب قیوم خضر نے بلخی صاحب مرحوم کے وصال سے متاثر ہو کر اپنے رسالہ "اشارہ" پٹنہ
کے اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارے میں "ہماری ادبی عمارت کا ایک ستون گر گیا" کے عنوان سے لکھا۔ نیز انہوں نے بلخی
صاحب مرحوم کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

قیوم خضر اپنے رسالہ کے ادارہ میں یوں لکھتے ہیں :

"۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو ملک کے مشہور و معروف مستند ادیب، نقاد، مورخ حضرت
فیض الدین بلخی مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انا لشدوانا الیہ راجعون۔ افسوس کہ بہار کے
ادبی و علمی عمارت کے ستون گرتے جا رہے ہیں اور سب سے افسوس کی بات ہے کہ
ان کی جگہ پر نئے ستون کے قائم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، بلخی صاحب مرحوم
ان ادیبوں میں تھے جنہوں نے اردو کے دامن میں کچھ نئے پھولوں کا اضافہ کیا ہے۔
بلخی صاحب مرحوم زندگی بھر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی طرح خوش رہ کر
کام کرنے والوں کی کمی ہے، تحقیق و تنقید ان کا محبوب فن تھا، "تاریخ پر ماہرانہ
نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے "تاریخ گدھ لکھ کر بہار کے نام کو اونچا کیا، شاید
انگریزی کے علاوہ ہندوستان کے کسی بھی زبان میں بہار کی ایسی تاریخ موجود نہیں
ہے۔ تذکرہ شہوان ہند کو اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت حاصل ہے، تذکرہ ہندو
شعرا نے بہار بھی ترتیب دے رہے تھے۔ اگر کچھ دلوں تک زندہ رہتے تو شاید
ہو جاتا بلخی صاحب مرحوم سے میں بہت قریب تھا، وہ مجھے بہت
مانتے تھے "اشارہ" میں ان کے کافی مضامین شائع ہوئے جو کسی دوسرے رسالہ میں شائع

نہیں ہوئے۔

رسالہ "کوئل" ڈالٹن گنج نے اپنے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء کے ادارہ میں بلخی صاحب کی موت سے متاثر ہو کر اپنا گہرا اظہارِ تاسف پیش کیا چنانچہ مدیرِ رسالہ "کوئل" نے فصیح الدین بلخی فزیر کا لے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ بہت سارے اہل قلم نے بلخی صاحب کی شخصیت اور فن پر اپنے تاثرات قلمبند کر کے ادارہ رسالہ "کوئل" کو ارسال کیا، لیکن رسالہ "کوئل" کوچہ ناساز گار حالات کا شکار ہوا، یہ مسودات راقم کے پاس محفوظ ہیں۔

رسالہ "سہیل" گیا نے اپنے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء کے ادارہ میں بلخی صاحب کی موت سے متاثر ہو کر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا چنانچہ ابواللسان جناب بسمل سنہاروی مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کی موت سے متاثر ہو کر ایک قطعہ تاریخِ وفات لکھا جو رسالہ "سہیل" کے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، قطعہ تاریخِ وفات یہ ہے۔

قطعہ تاریخِ وفات از ابواللسان بسمل سنہاروی گیاوی
 بگو شمع از عظیم آباد این ناگہ خبر آمد
 فصیح الدین بلخی زیں جہاں سہیل نصت شد
 چہر گویم شرح غم از انتقال پر ملالِ او
 بہادر مجلس علم و ادب شور قیامت شد
 سنین رحلت او گفت بسمل از سرا بجد
 فصیح الدین بلخی وارد ایوان جنت شد

۶۲ ۶۱۹

قطعہ تاریخِ وفات از بلبل بہار فردوسی ہند حضرت
 سریر کا بری گیاوی مینائی

جناں کو گئے بلخی پاک باطن
 دامنے میں ہے ماتم مرگ بلخی
 سریرہ از سر آہ سال وفاتش
 یہ کہہ دو کہ اے داعی مرگ بلخی

۶۲ ۶۱۹

اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم کی موت سے متاثر ہو کر علامہ جمیل مظہری، نواب نقی جان قمر گیاوی اور سید محمد یوسف وکیل عظیم آبادی نے تاریخِ وفات لکھے جو حسب ذیل ہیں:

دنیا ہے اک مرقع شادی و غم کا بے شک
تھا کل وطن میں جس سے برج علوم روشن
عیسیٰ نفس کے غم میں دم پر بنی ہوئی ہے
یا قوب غم پر میں نادم کو صبر دے تو
رحلت کی اے قر ہے تاریخ عیسوی میں
کھل چور ہے ہیں خنداں شبنم گرہے گریاں
وہ آفتاب تاباں زیر زمیں ہے پنہاں
زندہ تو ہوں بظاہر لیکن ہوں مثل بے جاں
اسی مہر کا یہ پتہ ہو اور بھی فردزاں
ہے ہے فصیح بلخی فیاض کامل انساں

۶۲ ۱۹ ۶

قطعہ تارخ وفات از نتیجہ فکر علامہ جلیل مظہری

آج ہے فردوس کا منظر مرے پیش نگاہ
سیر ہیوں پہ حوض کوثر کے میں سیدی کبیر
شاد و آتش ہیں عراقی و فتاحی کے قریب
اس طرف ارباب فکر اور اس طرف ارباب فکر
با ادب بیٹھا ہے ابن رشد ارسطو کے قریب
ہے سیاسی بحث میں چانک نظام الملک سے
پھنکتی ہے گاڑھی لب کوثر میں خیام و ریاض
شمس پر شاہیں لئے اقبال بھی ہیں زیر عرش
الغرض ہے خلد وہ بزم طرب جس میں جمیل
باوہ خواران معانی جمع ہیں ساقی کے پاس
زیر طوبی اتمسی ہو کر ہیں فردوسی کے پاس
میکدے میں میر و غالب حافظ و عرفی کے پاس
اہل دل رومی کے پاس اہل خرد رازی کے پاس
کانٹ اور ہیکل ہیں سرگرم سخن طوسی کے پاس
ہنس رہا ہے مارکس افلاطون یونانی کے پاس
اور ہیکل ہنر کین پر کینس اور شبلی کے پاس
ہم سخن جبریل سے سدرہ کی ایک کھڑکی کے پاس
ہیں کسبھی اپنے رفیق فکری و ذہنی کے پاس

باول شاد ادب ہاتھ ہم کو دیتا ہے خبر
کہہ فصیح الدین بلخی آج ہے شبلی کے پاس

۸۱ ۱۳ ۸۰

قطعہ تارخ وفات از نتیجہ فکر جناب سید محمد یوسف وکیل
صاحب علم و ہنر شد سو گوارہ و اشکبار
گفت پردہ دین حیات و نبوی را الفراق
حادثہ افتاد چوں امروز فاجع و تبیح
آں طیبے کہ مریض جہل و ظلمت را سیح

آن سراپائے تلاش و جستجوئے گم شدہ
آن سخن بیخ و شناسائے نکات شاعری
آن کہ آثار قدیمہ را نشان داد و مرتب
آن کہ گفتا فاش و پیدیا چہ سیاه و چہ صبح
وقت باید کہ مثل نو دگر آید فصیح

۶۲ ۱۹۶

مکتب علم و حکم ویرانہ کردی یا فصیح

۸۱ ۱۳۵

بطنی صاحب مرحوم کے مزار کے کتبہ کا قطعہ تاریخ وفات جناب سید محمد یوسف وکیل نے
لکھا۔ جو اُن کے مزار کے سر ہانے خوبصورت سنگ مرمر پر کندہ ہے۔

قطعہ تاریخ وفات حضرت فصیح الدین بلخی

از بس کہ جہاں است بسے زشت و قبیح
ایں کتبہ بخوان کہ سال مرگ است ایس
جاں داد و بگریختہ زیاں مردِ صبح
آسودہ بایں تربت صاف است فصیح

۶۲ ۱۹۶



باب چہارم

صوبہ بہار میں اردو نشر کا ارتقاء

فضیحہ الدین بلخی کے عہد تک

اردو نشر کے آغاز کے سلسلے میں صوفیوں، مبلغوں اور عالموں نے جو کارنامے انجام دیے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ان بزرگانِ دین کی تصنیفات کا واحد مقصد تبلیغ اسلام تھا۔ چنانچہ ان صوفیوں نے مقامی زبان میں رسالے لکھے۔ ظاہر ہے یہ زبان ابتدا میں ادبی اہمیت کی حامل نہ تھی لیکن ان صوفیائے کرام کا فیض تھا کہ ان کی مقامی بولی میں لکھے ہوئے رسالے اردو زبان و ادب کی تعبیر کے سلسلے میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہ عماد الدین قلندر زاب تک کی تحقیق کے مطابق ان کی تصنیف ”رسالہ صراطِ مستقیم عرف سیدھا راستہ“ بہار کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالودود کی بولیں رائے ہے۔

”لے“ کتاب ”سیدھا راستہ“ کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ بتایا گیا ہے۔ اگر واقعی گیارہویں

صدی کا لکھا ہوا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صوبہ میں نشر و نظم اردو کا اس سے

قدیم نمونہ اس وقت تک دستیاب نہ ہوا ہے۔“

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تحقیقی کتاب ”اردو نشر کا آغاز و ارتقاء“ میں اردو زبان کی پہلی نثری

تصنیف ”حنوتیہ“ بتائی ہے۔ یہ مختصر رسالہ اخلاق و تصوف کے رموز و نکات پر مشتمل ہے۔

”لے“ رسالے کی تصنیف کا جو قدیم ترین سنہ مقرر کیا جاتا ہے وہ ۷۸۲ھ کے بعد ہوگا۔“

”لے“ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۰۱ء تک مصنفہ ڈاکٹر اختر ادریسوی ص ۳۵۱، ۳۵۸

”لے“ اردو نشر کا ارتقاء۔ رفیعہ سلطانہ بحوالہ شاد کی نثر نگاری مرتبہ دہاب اشرفی ص ۱۷۸

حضرت ظہور الحق ظہور : شاہ عماد الدین قلندر کے بعد جناب ظہور الحق کی شخصیت قابل ذکر ہے، موصوف کے چار نثری رسالے خاتقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سبھی میں محفوظ ہیں، رسالہ نماز، فضائل رمضان، فیض عام اور کسب النبی۔

رخشاں ابدالی کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں رسالے یعنی رسالہ نماز اور فضائل رمضان ۱۲۰۰ھ کے قبل لکھے گئے فیض عام کا سنہ تصنیف ۱۲۲۹ھ ہے اور رسالہ کسب النبی کا ۱۲۳۰ھ ہے۔ رسالہ نماز اور فضائل رمضان کے نفس مضمون ان کے نام سے ظاہر ہے، فیض عام بھی دینی امور سے متعلق ہے لیکن رسالہ کسب النبی کی غرض مسلمانوں کو صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

حضرت محمد تقی بلخی فردوسی : حضرت بلخی حضرت ظہور الحق کے ہم عصر تھے ان کی کتاب احکام الہی کا تلمی نسخہ جناب اختر اور میزوی کو پروفیسر ذکی الحق بی۔ ان۔ کالج پٹنہ سے ملا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ میں صفحہ ۳۵۷ تا ۳۶۱ میں ذکر کیا ہے، اس تصنیف کی کتابت ۱۲۵۶ھ میں شیخ خیرات علی نے کی۔ اختر صاحب اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

”احکام و عقائد، ایمانیات، شرح اعمال اور تفصیل شریعت کے متعلق عمدہ کتاب ہے۔“

حضرت سید شاہ عطاء حسین منعمی گیاوی : موصوف کئی نثری تصنیف دید مغرب

بہدایتہ المسافر کے متعلق رخشاں ابدالی یوں کہتے ہیں :

”اس کے مصنف حضرت سید شاہ عطاء حسین منعمی ۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ مصنف

کشف العارفین و کنز الانساب (فارسی) میں بہدایتہ المسافر میں حضرت کا مفصل

سفر نامہ حج کی تین ضخیم جلدیں ہیں۔ میرا ہند ہندستان کے مشہور شہروں کے حالات

پر مشتمل ہے۔

”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ ۱۸۰۱ء تک مصنف ڈاکٹر اختر اور میزوی ص ۳۵۱

”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ ندیم بیار بھر ۱۹۳۵ء

(۲) دائرِ عرب (۳) کیفیتِ مراجعت، کتاب کی تالیف ۱۲۶۰ھ سے

شروع ہو کر ۱۲۶۲ھ کو اختتام کو پہنچی اس کی پہلی جلد سیر الہند کا کچھ حصہ خالقانہ

منعمیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہے اور اس فہرست کہ بقیہ حصص آج مفقود ہے۔

ڈاکٹر اختر اور بیوی سیر الہند کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

”سیر الہند کی زبان مقفی اور مسجع رنگین و پرہ تصنیع ہے۔“

سید محمد اسحاق عرف پیر و دمڑیا: اختر صاحب نے اپنی تصنیف ”بہار میں اردو زبان و ادب کے

ارتقا“ میں موصوف کے دو نثری رسالے کا ذکر کیا ہے ایک کا نام اصول احکام شرع اور دوسرے کا

نام جذبات معینہ ہے۔ حضرت پیر و دمڑیا فاطمی الرقوی نسب تھے، شریعی کہتے تھے اور تخلص فقیر

فرماتے تھے یہ محلہ بارہ دری (دائرہ) کے رہنے والے تھے۔ اختر صاحب کا بیان ہے:

”یہ رسالہ اجیر شریف کا سفر نامہ ہے نثر کے بین میں ابیات و اشعار مصنف

کے درج ہیں کہیں کہیں پوری غزل بھی ہے، منظوم کی کثرت ہے.....

مصنف کئی بار اجیر شریف کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے مگر مقصد پورا نہ ہوا۔

آخرش روزِ دو شنبہ تاریخ ساتویں صفر ۱۲۷۱ھ مطابق چودھویں کاڑک ۱۲۶۱ھ فیصلی

ردانہ عظیم آباد ہوئے۔

حضرت پیر و دمڑیا کا دوسرا رسالہ اصول احکام شرع ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، قصہ ہندی منظوم کے ساتھ

مجلد ہے، اختر صاحب کہتے ہیں:

”رسالہ کا سال تصنیف کہیں درج نہیں، نیز یہ کہ اس کی زبان صاف اور رواں

ہے لیکن طرزِ مقفی کے نمونے ملتے ہیں۔“

عالم علی عظیم آبادی: رنشاں ابدالی نے اپنے متذکرہ مضمون میں فارسی تصنیف ”بوستان خیال“

سے بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا مصنف ڈاکٹر اختر اور بیوی ج ۳۶۲

۳۷۰ ” ” ” ” ” ” ”

مصنف میر محمد تقی کے ایک شخص ترجمہ زبدۃ الخیال کا ذکر کیا ہے انہوں نے اس کے مترجم عالم علی عظیم آبادی کے حالات لکھے ہیں، عالم علی عظیم آبادی نے بوستان خیال کا ترجمہ ۱۲۵۶ھ میں کیا، فارسی کی اصل کتاب سولہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا مخلص کتب خانہ خاندان قادریہ اسلام پور میں محفوظ ہے۔ اختر صاحب عالم عظیم آبادی پر مزید روشنی نہیں ڈالتے۔

لیکن قاضی سعید کا یہ خیال ہے کہ عالم عظیم آبادی بھاگلپور میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (۱) بوستان خیال (۲) وہ مجلس (۳) عقائد فقہ (۴) ہدایۃ العارفین، اختر صاحب نے ایک شخص مولوی عالم عظیم آبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ایک کتاب وہ مجلس انہیں شاہ نضر عالم سجادہ نشین حلیفہ حضرت شاہ سہباز بھاگلپوری کے کتب خانہ سے حاصل ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

”وہ مجلس تالیف مولوی محمد عالم صاحب سررشتہ دار کشتری اضلاع بھاگلپور وغیرہ

واسطے پڑھنے محرم کی مجلسوں میں ۱۲۶۵ھ قدسی رمضان المبارک میں مطابق ماہ اگست ۱۸۴۸ء کے چھپوایا..... وہ مجلس کی تصنیف ۱۲۶۱ھ میں ہو گئی تھی۔

مولوی شجاع الدین: رخشاں ابدالی اور اختر صاحب مولوی شجاع الدین ضوی کی ایک تصنیف مطبوعہ ۱۲۵۷ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ رسالہ جواز تعزیر داری میں ہے اور جس میں طاہر امت علی جو نپوری کے رسالے قوۃ الایمان اور مولوی غنیمت عظیم آبادی کے خیالات کو پیش کیا ہے کتاب کے جو نسخے ان محققوں کی نظر سے گزرے ہیں ان میں اس کا نام درج نہ تھا، ۹۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چھپرہ میں چھپی تھی۔ اختر صاحب کا یہ خیال ہے کہ مولوی شجاع الدین کا وطن بہار میں شریف ہی ہو گا یا چھپرہ۔ موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ مصنف نے اس سے قبل تین اور رسالے رد نصاریٰ لکھ کر شائع کئے تھے، شاہ نضر عالم کے کتب خانہ سے اختر صاحب کو ایک اور کتاب ملی جس کا نام مجلس چہلم ہے، موصوف لکھتے ہیں:

”مجالس چہلم کے مصنف کو کی اور بزرگ ہوں گے جن کا تخلص حیدری تھا۔“

اختر صاحب حیدری کو بہاری تصور کرتے ہیں، دراصل یہ کتاب حیدر بخش حیدری کی تصنیف گُل معرفت مطبوعہ ۱۲۲۷ھ کا کوئی ایڈیشن ہو، اس کا تعلق بہار سے نہیں ہے۔

گُل معرفت کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

”گُل معرفت تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے.....

علامہ حسن دہلوی کا شفی کی تصنیف روضۃ الشہداء نہایت مشہور اور اہم ہے، موضوع کی

بے نظیر کتاب ہے..... گُل معرفت میں بھی روضۃ الشہداء سے شہدائے کربلا کے

واقعات لئے گئے ہیں۔“

مولانا محمد احسن گیلانی: مولانا مناظر احسن نے ایک مضمون رسالہ ”ندیم“ بہار نمبر ۱۳۳ھ میں

یہ لکھا ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی نے بنارس میں ۱۲۶۶ھ میں ایک رسالہ حقائق ائمہ اربعہ اہل معارف و لطائف

کے موضوع پر لکھا تھا، موصوف کا یہ خیال تھا کہ یہ رسالہ بہاریں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے، رسالہ سیدھا راستہ

مصنف حضرت محمد الدین قلندر کا رسالہ تصنیف ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس لئے محمد احسن گیلانی کی کتاب بہار کی

پہلی نثری تصنیف نہیں ہو سکتی۔

بہار کے اردو نثر کے انتق میں مولانا ولایت علی اور عنایت علی صادق پوری کے کارنامے ناقابل فراموش

ہیں، اختر صاحب نے ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ رسالے زبردست

حکیم کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

اصحیح الدینی علی مرحوم کی تحقیق کے مطابق مولوی شجاع الدین کا وصال ۱۲۳۷ھ میں ہوا لہذا انہوں نے یہ رسالہ اپنی

وفات سے قبل لکھا تھا، مگر صاحب مرحوم نے رسالہ صبح نو پر ۱۲۵۸ھ میں مولوی شجاع الدین اور ان کے اہل خاندان کے

مزارات کے کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں، اس مضمون میں تین مزارات کے کتبات کی نقلیں درج ہیں جن میں مولوی شجاع الدین

کے والد حضرت تیم الشہ بہاریؒ ان کی بیگم نواب گنج شہزادہ بنت رفعت النساء بنت شاہ عالم اور مولوی شجاع الدین

علیؒ کی، ان کتبات سے تاریخ وفات کے علاوہ دیگر واقعات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مولوی شجاع الدین علیؒ اور ان کے

اہل خاندان کے روح پرورہ شخصیات ہیں۔

اہل خاندان کے روح پرورہ شخصیات ہیں۔

(۱) رد شرک (۲) رسالہ دعوت (۳) رسالہ شجرہ یا ثمرہ (۴) بتیان شرک (۵) بدعت
 'رد شرک' مولانا کی فارسی تصنیف ہے لیکن یہ کتاب مولوی الہی بخش کے اردو ترجمہ کے ساتھ
 چھپی ہے سنہ طباعت درج نہیں ہے، رسالہ دعوت مولانا کا یہ رسالہ اردو میں ہے، اختر صاحب نے
 اس کا تصنیف ۱۸۳۱ء بتایا ہے، اس میں کل سولہ صفحات ہیں۔
 رسالہ عمل با حدیث: سولہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولانا نے فارسی میں لکھا تھا لیکن یہ مولوی الہی بخش
 کے ترجمہ ساتھ شائع ہوا۔

رسالہ بدعت: ۲۰ صفحات کا یہ رسالہ گلستانہ میں چھپا۔ اختر صاحب نے اس کی ایک نقل مولوی
 عبدالغفار صادق پوری سے حاصل کی تھی۔ اس رسالہ میں اشغال مراقبہ، خواب، رویائے صالحین، الہام، وحی
 اور اقسام الغامات سے بہت ہی تشفی بخش بحث کی گئی ہے۔
 مولانا غنایت علی صادق پوری: اختر صاحب نے مولوی غنایت علی کے ایک رسالہ بت شکن کا
 انکشاف کیا ہے، سنہ تحریر درج نہیں ہے۔

مولوی قیاض علی: مولانا قیاض علی کے رسالوں میں فیض الغیوض قابل ذکر ہے، اس میں سوال و جواب،
 اجتہاد، نقابت، تقلید، سنت، استنباط، تفکر فی الدین کے متعلق ہیں۔
 اختر صاحب نے مندرجہ بالا علما کے تذکرہ پر ۱۸۵۶ء تک کی بہار کا اردو نشر کا جائزہ ختم
 کیا ہے..... لیکن اس عہد کے اندر چند دوسری تصنیفات سے بھی ہم متعارف ہوئے ہیں۔

وسیلۃ النجات: ترجمہ موسوم بہ سبیل النجات، وسیلۃ النجات کے مصنف آغا محمد احمد
 امجدی ہیں لیکن اس کا اردو ترجمہ ذوالفقار علی رضوی نے کیا ہے، سال ترجمہ ۱۸۱۸ء ہے۔
 رسالہ گوہر: اس کے مصنف بندہ ذہیر شاہ ساکن ضلع غلیم آباد میں اس کی کتابت ۱۲۵۶ھ
 میں ہوئی ہے، رسالہ کا موضوع رد عیسائیت ہے۔

قصہ غم ربا: یہ بہار دالش کا ترجمہ ہے، مترجم عابد حسین غلیم آبادی ہیں، سال اختتام ترجمہ

۱۸۵۷ء، ملاحظہ ہو بہار میں اردو ارتقا فی محمد سعید مطبوعہ ندیم اور ان کی کتاب فہرست نائش
 اردو بحوالہ ساد کی نشر نگار ۵۵ تا ۵۶

۱۲۲۲ء ہے۔

خوان الوان : اس کتاب کے مصنف سید حمید الدین بہاری ہیں، سید صاحب نے فارسی کی مشہور کتاب خوان الوان جو کھانا پکانے کے قیمتی نسخوں سے متعلق ہے اس کا ترجمہ آسان ہندوستانی زبان میں کیا، پروفیسر جاوید نہال کا خیال ہے کہ خوان نعمت کا نام الوان لکھا گیا ہے۔ خوان نعمت کا ترجمہ ۱۸۷۸ء میں مکمل ہوا تھا۔

گلشن ہند : اس کے مصنف باسط خاں ہیں۔ موصوف کا شمار فورٹ ولیم کالج کے گمنام منشیوں میں ہوتا ہے، باسط خاں شاہ عالم کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے چنانچہ اس پر آشوب زمانہ میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ چنانچہ باسط خاں کے والد مواد خاں کو ہجرت کرنے والے قافلے کے ساتھ عظیم آباد آنا پڑا اور عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ گلشن ہند ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی حکایات ذیلی داستانیں اور گل صنوبر کی کہانی درج ہے، طرز تحریر صاف و سلاہ ہے۔ مصنف کے دیباچہ سے اس دور کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے کی ذہبت نہ آئی۔

شہادت نامہ : اس کے مصنف شاہ امیر الحق ہیں۔ ۱۸۴۵ء کے آس پاس لکھی گئی ہے۔

میلاد الرسول : شاہ امیر الحق کی دوسری تصنیف ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ ہے۔

ترجمہ چہار درویش : چہار درویش کے اردو ترجمہ کا ایک فلمی نسخہ پروفیسر سید حسن عسکری کے پاس محفوظ ہے اس کا سال کتابت ۱۸۴۷ء ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں لیکن قرینہ ہے کہ اس کے مترجم کوئی بہاری ہیں۔

ڈاکٹر اختر اور میوڑی مرحوم کی تصنیف 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء' ۱۸۵۷ء

تک محیط ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر منظور اقبال نے اپنا ایک گرانقدر تحقیقی مقالہ 'بہار میں اردو' شرکا ارتقاء' ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۲ء تک لکھا۔ بلاشبہ موصوف کا یہ ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

چنانچہ اس تحقیقی مقالے کی بدولت کئی غیر معروف اور گمنام نثر کی شخصیتیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔
 موصوف نے جس دماغ سوزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے وہ حد درجہ قابل تحسین ہے۔ یہ صیح
 ہے کہ اس تحقیقی مقالے میں مصنفوں کی سوانح پر کوئی روشنی نہ ڈالی گئی ہے، انہوں نے بہار میں
 اردو نثر میں لکھی جانے والی کتابوں کا صرف سرسری جائزہ لیا ہے نیز انہوں نے نثر کی ہر صنف میں لکھی
 جانے والی تصنیفوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مثلاً تاریخ، تذکرہ، سوانح عمری، افسانہ، سفرنامہ
 سیرۃ النبیؐ، طب، ڈراما، ناول وغیرہ یا ان اخبار و رسائل کا بھی جائزہ لیا ہے جن کا تعلق
 اس دور سے ہے، بہر حال ڈاکٹر مظفر اقبال کا نام صوبہ بہار کے اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے
 حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

۱۔ ۲۔ تاریخ اردو تذکرہ کا ذکر آئندہ ابواب میں مفصل کیا گیا ہے جہاں بلخی صاحب کی تاریخ نویسی
 اور تذکرہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۳۔ سوانح عمری: (۱) نجات قائم مؤلف شاہ محمد قائم دانا پوری مطبوعہ ۱۸۵۶ء (۲) احسن الشہادین
 فی رموز السبطین۔ مؤلف شاہ رضا حسن مطبوعہ ۱۸۸۳ء (۳) تذکرہ مؤلف حکیم عبد الجلیل قادری (۴)
 المسمیٰ بہ بزم لورانی محفل ثانی در حالات طفولیت محبوب علی مؤلف محمد وحید قادری مطبوعہ ۱۸۸۹ء (۵)
 مسمیٰ بہ خانم لوری مؤلف شاہ اکبر دانا پوری (۶) تذکرہ فصیح مؤلف شجاعت علی اردی مرتبہ محمد شہرت عظیم آبادی
 ۱۳۱۰ھ (۷) یادگار گوہری مؤلف محمد زبیر دیالواری (۸) افضل اسیر مؤلف محمد جرم دانا پوری (۹) میلاد علی
 شیر خدا مؤلف عبد الوحید قادری (۱۰) فضل رحمانی مؤلف سید تاج حسین دہلوی (۱۱) سیرۃ الشرف مؤلف
 سید ضمیر الدین (۱۲) وصف پاک قطب اعظم المعروف بتحفیر یازدہم مؤلف مطبوعہ ۱۹۰۴ء (۱۳) سیرۃ شیر شاہ
 سوری مؤلف عبد الغفور دانا پوری (۱۴) انجیاء بعد الممات معروف بہ مولانا سید محمد زبیر حسین کی سوانح عمری
 مؤلف فضل حسین مظفر پوری (۱۵) سیرۃ اللقب سوانح مکمل مخدوم شعیب و تذکرہ الاعرابی مؤلف وزیر علی
 شیخ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی (۱۶) فیض سبانی مؤلف شیخ بہادر علی خاں عاشق مطبوعہ ۱۹۱۳ء (۱۷) ریاض
 شفق مؤلف محمد اسماعیل ذریعہ مطبوعہ ۱۹۱۳ء (۱۸) (۱۹) وسیلہ شرف اور ذریعہ دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

فیض الدین بلخی مرحوم کا تعلق جس دور سے ہے اس دور کی بہار کی اردو نثر ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد بہار میں اردو نثر ایک ادبی روش اختیار کر لیتی ہے اور بہار میں اردو نثر نگاروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے جن کی تصنیف و تالیف نے اردو نثر کی توسیع و اشاعت میں ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ چنانچہ سید فرزند احمد سفیر بلگرامی، عبدالغفور نساج، علامہ شوق نیوی، پروفیسر عبدالغفور شہباز، عبدالغنی استھانوی، اکبر دانا پوری، صوفی منیری، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، نواب نصیر حسین خیال، نواب امداد امام اثر، علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ اس کے علاوہ کئی نثر نگار ہمارے سامنے آئے جنہوں نے بہار کی اردو نثر کی الگ الگ صنفوں میں ایسی بیش بہا خدمات انجام

دلوں (سلسلہ) مصنفہ صوفی منیری (۲۰) رسالہ غریب نواز مولفہ اکبر دانا پوری (۲۱) حیات خسروی مولفہ پروفیسر عبدالغفور شہباز کی یہ کتاب نامکمل رہ گئی (۲۲) قدیریہ مولفہ امداد امام اثر (۲۳) حیات حضرت خضر مولفہ عبدالغفور عظیم آبادی۔ (۲۴) عروج ثقلین الملوک الحسین مولفہ سید ہدی بھلواروی (۲۵) داستان حضرت سلیمان مولفہ لطف اللہ (۲۶) حیات حضرت خضر مولفہ شاہ سلیمان (۲۷) حالات اخوند مولفہ عبدالغفور (۲۸) تذکرہ خواجہ معین الدین مولفہ فاطی گیاروی۔

۱۷۷۷ء آپ بیتی (۱) تذکرہ بہار رخانی مولفہ شیخ بہار علی خاں مطبوعہ ۱۸۸۷ء (۲) یادگار وطن مصنفہ شوق نیوی مطبوعہ ۱۸۹۴ء (۳) الدر المنثور فی تراجم اہل صدقہ پور، اس تصنیف کے تین ادیشن شائع ہوئے پہلی بار مصنف کی زندگی میں ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی، دوم موصوف کے انتقال کے بعد سوئم ۱۹۶۴ء (۴) خیابان بے خزاں الموسوم بہ اہم تاریخی شہر و سرایہ مصنفہ سید محمد تقی شبیر صاحب رضوی مطبوعہ ۱۹۱۳ء۔ ۱۷۷۷ء سفرنامہ: (۱) دید مغرب مصنفہ عطا حسین گیاروی (۲) سیر دہلی مولفہ شاہ محمد اکبر دانا پوری۔ مطبوعہ ۱۸۹۴ء (۳) معین الحجارج یعنی سفرنامہ جدید حجاز مولفہ حاجی وحید الدین خاں مطبوعہ ۱۹۰۲ء (۴) سیر بنگال مولفہ شوق نیوی مطبوعہ ۱۹۰۲ء (۵) سفرنامہ حج مولفہ عبدالغفور رمضان پوری مطبوعہ ۱۹۰۸ء (۶) سیر شملہ مع تاریخ شملہ مولفہ سید احمد باروی ثم دہلوی (۷) رسالہ سبیل نجات مولفہ سید خیرات احمد مطبوعہ ۱۸۹۰ء کریملا علی کا سفر موصوف نے کیا تھا انہوں نے پابندی سے اپنا روزنامہ لکھا (باقی اگلے صفحہ)

دیں اور ایسے نثاروں کا تعلق بلخی صاحب مرحوم کے عہد سے ہے اور مثال کے طور پر جناب قاضی عبدالودود،
 پروفیسرین الدین ذردانی، عطاء کا کوئی، وکی کا کوئی، مولانا مناظر احسن گیلانی، حمید عظیم آبادی، مولوی
 سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی، جناب وصی احمد بلگرامی، مولوی سید عزیز الدین بلخی مرحوم، جناب اختر ادرہئی
 مرحوم، حافظ شمس الدین شمس مینری، جناب رخشاں ابدالی، انجم مانپوری، قاضی محمد سعید، سہیل عظیم آبادی،
 مولوی سید عبدالرؤف ندوی مرحوم، عبدالملک آردی، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر
 سید صد الدین فضا مرحوم، پروفیسر مسلم عظیم آبادی مرحوم، قاضی محمد سعید مرحوم، پروفیسر شاہ مقبول احمد اور
 مولوی سید احمد اللہ ندوی وغیرہ کا تعلق فیض الدین بلخی مرحوم کے عہد سے ہے، ان بزرگوں نے بہار میں
 اردو شری ترویج و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، ذیل میں ہم ان نثاروں کی تخلیقات کا مختصر
 طور پر جائزہ لے رہے ہیں۔

صغیر بلگرامی :- ڈاکٹر ظفر ادگانوی نے اپنی تصنیف جلوہ خضر تلخیص و تنقید میں
 صغیر بلگرامی کی نثری تصنیف کی تعداد لگ بھگ چودہ بتائی ہے۔

- (نوٹ مسلسل ۶ سیرۃ النبی : انوار ناصری مؤلف حکیم ناصری علی مطبوعہ ۱۸۶۳ء (۲) ناصر الحنین فی اخلاق سید المرسلین
 مؤلف ناصری علی غیاث پوری مطبوعہ ۱۸۷۲ء (۳) ناصر الاحمید فی اسماء الحبیب مؤلف ناصری علی غیاث
 پوری مطبوعہ ۱۸۷۲ء (۴) مولود شریف شاہ اکرام مؤلف شاہ محمد اکرام مطبوعہ ۱۸۷۷ء (۵) فیض القلوب
 مؤلف محمد فیاض الدین بھلواروی مطبوعہ ۱۸۷۷ء (۶) میلاد شریف جدید مؤلف محمد اسماعیل صاحب مطبوعہ
 ۱۸۹۷ء (۷) افضل السیر ملقب بہشت گوہر جلد اول مؤلف عبدالرحیم دانا پوری مطبوعہ ۱۸۹۳ء یہ
 کتاب ۸ جلدوں پر مشتمل ہے (۸) در ظہور مؤلف محمد وزیر الدین، در ظہور اہم تاریخی ہے ۱۳۲۵ھ
 (۹) خاتم النبیین مؤلف محمد شرف علی قادری مطبوعہ ۱۹۰۷ء (۱۰) ذکر میلاد مؤلف غلام محمد عباس
 مطبوعہ ۱۹۰۷ء (۱۱) حدیقہ آخرت مؤلف شفق عماد پوری مطبوعہ ۱۹۱۰ء (۱۲) مولود شریف مؤلف سید محمد
 عمر کریم مطبوعہ ۱۹۱۳ء [وسیلۃ النجات] (۱۳) میلاد النبی مؤلف حافظ عبدالحق (۱۴) مختصر سیرۃ نبوی
 مؤلف حکیم سید عبدالرؤف دانا پوری (۱۵) میلاد النبی مصنف حافظ عبدالحق مطبوعہ ۱۹۱۴ء -

(۱) محشرستان خیال (۲) جوہر مقالات (۳) ایک جلد (۴) رشحات صغیر (۵) جلوہ خضر جلد
دہا ضمیمہ محشرستان خیال (۶) خلاصہ فیض صغیر (۷) طبقہ محبت و شیعہ (۸) ضمیمہ اظہار الاسرار (۹) تاریخ
بلگرام (۱۰) انشا سید گل (۱۱) تصدیق الایمان (۱۲) مرغوب القلوب (۱۳) پرستان خیال ترجمہ بوستان خیال
(۱۴) قطعات ترقی -

عبد الغفور خاں نساج : نساج کی نثری تصانیف یہ ہیں۔

سخن شعرا تذکرہ، انتخاب تفصیل (مستفید) خود نوشتہ سوانح (مخطوط) نصاب زبان اردو۔
علامہ شوق نیویؒ : شوق نیوی نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے بلکہ ایک عظیم شارح بھی تھے۔
شوق کی کئی ایسی تصانیف ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے، ان کی ادبی تصنیف یوں ہے۔

(۱) از راحت الاغلاط صحت الفاظ کے باب میں (یہ کتاب فارسی میں ہے)

(۲) اصلاح اردو انشا پر دازی اور شعر گوئی کے باب میں۔

(۳) ایفائے رسالہ اصلاح کی تائید میں (۴) سرمہ تحقیق سابق الذکر رسالوں کی تائید میں (ہا یا دگار وطن

اپنے وطن اور اہل وطن کے تذکرے مباحث علمیہ پر مشتمل (۶) سیر بنگال۔

اکبر دانا پوریؒ : اکبر دانا پوری مرحوم نے مثنوی کئی کتابیں لکھیں، ان کتابوں کی فہرست ۲۰ ہے۔

(۱) اشرف التواریخ ۴ جلد مکمل (۲) خدا کی قدرت (۳) چہل حدیث (۴) رسالہ الماس (۵) دل

(۶) ارادہ (۷) ادراک (۸) مولد غیب (۹) سرمہ بینائی (۱۰) مولد فاطمی (۱۱) چراغ کعبہ۔

صوفی مینیریؒ : حضرت صوفی مینیری کی نثری تصانیف یہ ہیں (۱) راحت روح (۲) وسیلہ

شرف نوریہ دولت (۳) خط راست (۴) العروة الوثقی

۱۔ نساج سے وحشت تک مصنف سید انیس الرحمن ص ۳۵ تا ۴۲

۲۔ مقالہ شوق نیوی مصنف فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ اشارہ دسمبر ۱۹۵۹ء

۳۔ مسلم شرائع بہار جلد اول مصنف حکیم احمد اللہ ندوی ص ۸۴

۴۔ حضرت صوفی مینیری کے نثری کارنامے مصنف ڈاکٹر طیب ابدالی ص ۶۵ تا ۶۷

ڈاکٹر طیب لدھیانی نے صوفی مینری کے نثری کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ سپر قلم کیا، راحت روح موصوف کی ایک تمثیلی داستان ہے جس میں مذہب اور تصوف کے رموز و نکات کے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، وسیلہ شرف و ذریعہ دولت میں حضرت صوفی مینری نے بزرگان دین کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

شاد عظیم آبادیؒ: شاد عظیم آبادی ایک عظیم شاعر کے علاوہ ایک نثر نگار بھی تھے پھر بھی ایک نثر نگار کی حیثیت سے شاد زیادہ شہرت کے مستحق نہیں۔ انہوں نے نثری صنف میں ناول، سوانح، تاریخ، تذکرہ اور لسانیات جیسے موضوع پر تصانیف لکھی ہیں، ان کی نثری تصانیف یہ ہیں:-

(۱) ناول صورتہ الخیال، سہ جلد (صورۃ الخیال، ہیئتہ المقال، حلیۃ الکمال) بدھوا، انیونی، صورت حال۔ سوانح اول حیات فیباد اور دوسری کمال عمر پاشا کی کہانی شاد کی زبانی (یہ سوانح اپنے شاگرد پروفیسر مسلم عظیم آبادی کے نام لکھی ہے) فکر، طبع، حصہ دوم، نوائے وطن، فکر، طبع (سہ جلد) فارسی تعلیم، اردو تعلیم، مکتوبات شاد مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری نور۔

تاریخ:- مرآۃ الابصار اور نقش پائیدار (سہ جلد) مختصر یہ کہ شاد عظیم آبادی کثیر التصانیف تھے۔

نواب امداد امام اثر:- جناب امداد امام اثر ایک شاعر کے علاوہ ایک عظیم نثر نگار بھی تھے چنانچہ اثر کی تصنیف کا شرف الحقائق اردو تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے بقول مولوی احمد اللہ مولف تذکرہ مسلم شعرائے بہار مرآۃ الحکما کی تعریف سرسید نے بھی کی تھی، اثر نے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی شعری اور نثری تصانیف کی فہرست یوں ہے:

- (۱) فوائد دارین (۲) بہار سخن (۳) مرآۃ الحکما (۴) کتاب الاشہار (۵) کتاب الزراعة
- (۶) رسالہ طاعون (۷) معصبات العظم (۸) مناظر المصاب (۹) میاد الحق (۱۰) فسانہ ہمت (۱۱) رسالہ فیل
- (۱۲) سوانح عمری حضرت مخدوم الملک بہاری بزبان انگریزی (۱۳) سوانح عمر ملکہ معطرہ و کٹوریا بزبان اردو
- (۱۴) دیوان اثر فارسی (۱۵) ترجمہ انشا رلاؤ بکین در زبان فارسی (۱۶) دیوان اثر ارض رسالہ جرقیل در زبان فارسی

سہ شاد کی نثر نگاری مصنفہ ڈاکٹر وہاب اشرفی
تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول مولفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی ص ۶

(۱۷) رسالہ فاکیا - در زمان فارسی (۱۸) رسالہ علم حرکت بزبان فارسی (۱۹) رسالہ علم المرایاد المناظر در زبان فارسی (۲۰) کاشت الخلاق۔

فیض الدین بلخی مرحوم کا تعلق جس دور سے ہے اس دور میں بہار میں اردو نثر ایک نئی روش اختیار کرتی ہے اور اس دور کے نثر نگار نے ادب کی نثری صنف میں چار چاند لگائے، مثال کے طور پر افسانہ نگاری کو لیجئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اختر اور میزوی مرحوم اور سہیل عظیم آبادی مرحوم جہاں تک ناقدوں کا سوال ہے پروفیسر کلیم الدین احمد کا نام لینا کافی ہے۔ ذیل میں ہم مختصر طور پر ان نثر نگاروں کی نگارشات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ سلیمان ندوی: علامہ سلیمان ندوی مرحوم اردو ادب کے مایہ ناز نثر نگاروں میں تھے۔ موصوف علامہ شبلی نعمانی کے عزیز ترین تلامذہ میں تھے چنانچہ سلیمان ندوی نے اردو کے نثری ادب میں کئی کارآمد تصنیفیں لکھیں۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔ ارض القرآن دو جلدیں، سیرۃ عائشہ، سیرۃ النبیؐ، ضخیم جلدیں، حیات امام مالک، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام اور نقوش سلیمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سلیمان ندوی ایک عظیم محقق اور ناقد تھے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی: مولانا مناظر احسن گیلانی ایک عظیم عالم دین تھے۔ مذہب اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ موصوف عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں صدر شعبہ دینیات تھے، موصوف عربی زبان میں کافی مہارت رکھتے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے چند رسالے بھی لکھے، بعض عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ یہ مضامین بھی کثرت سے لکھے ہیں چنانچہ بعض اہل علم حضرات نے ان کو کجا کر کے ان کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، مولانا مناظر احسن کی تصانیف کی فہرست یہ ہے:

(۱) کائنات روحانی (۲) النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم (۳) الدین القيم (۴) العفلاوی (۵) اسلامی معاشیات (۶) امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی (۷) تدوین حدیث (۸) تدوین فقہ۔
مولانا مناظر احسن گیلانی ایک عظیم محقق تھے۔

عزیز الدین بلخی مرحوم: عزیز الدین بلخی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور و معروف محقق، تذکرہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف کی تصانیف تاریخ شعرائے بہار کے علاوہ انسان کی پرواز قابل ذکر ہے۔

انسان کی پرواز فہم بخارہ بازی اور جہاز رانی کے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔
حافظ شمس الدین شمس منیری: شمس منیری کا نثری کارنامہ بہت زیادہ وسیع نہیں تاہم
موصوف کے مضامین صوبہ بہار کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ رسالہ معاصر پٹنہ میں شمس منیری کے
مضامین راقم کی نظر سے گذرے ہیں ماسوا اس کے شمس منیری نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے متعلق ایک
کتاب لکھی۔

وصی احمد بلگرامی: وصی بلگرامی کی بعض تخلیقات صوبہ بہار کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ وصی
بلگرامی انشا پردازی میں کمال رکھتے ہیں اور انہوں نے نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے گہرے رنگ کو قبول
کیا ہے موصوف کا مضمون س ش ص رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۳۵ء میں شائع ہوا، یہ مضمون آج بھی بہار
کی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ماسوا اس کے وصی صاحب کے چند ادبی مقالات
مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

شائق عظیم آبادی: شائق عظیم آبادی صوبہ بہار کے شاعروں میں ایک غیر معمولی شہرت کے
حامل ہیں۔ شاعری میں موصوف منشی باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے، شائق کا واحد نثری کارنامہ شاہ
رکن الدین عشق کی شاعری سے متعلق ان کی کتاب یادگار عشق ہے، یہ تصنیف ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔
انجم مانپوری: انجم صاحب صوبہ بہار کے واحد مزاحیہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی عظمت کا لوہا
سارے ہندوستان میں منوایا، موصوف کی نثری تصانیف میں طنزیات مانپوری ۲ جلد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔
مولانا تمنا عمادی: مولانا تمنا عمادی کا شمار صوبہ بہار کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے، موصوف
عربی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ جناب اقبال عظیم نے اپنی کتاب مشرقی رنگال
میں اردو میں مولانا تمنا عمادی کی عربی، فارسی اور اردو نثر و نظم کی تصنیفات میں ۲۱ مطبوعہ اور ۲۲ غیر مطبوعہ
بتائی ہیں۔ بلاشبہ مولانا تمنا عمادی ایک عظیم عالم دین تھے۔ بحیثیت نثر موصوف نے کوئی وسیع کارنامہ انجام
نہیں دیا۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا تمنا عمادی سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) تشریف
لے گئے جہاں آپ کا وصال ہوا، مولانا کی نثری کتابیں یہ ہیں۔
(۱) ایفائے سخن یعنی شوق سندھوی کی مشہور کتاب اصلاح سخن کے ایک حصہ پر تنقید ادبی دنیا

میں اس کتاب نے تہلکہ مچا دیا (۲) الفرقان (تاریخ جمع القرآن) (۳) اعجاز القرآن ۵ جلدوں میں (۴) شرح دیوان امر القیس (۵) مجموعہ مکتوبات علمی و ادبی مجموعہ مضامین شری و مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ باقی کتابیں بیشتر صرف و نحو، قرآن و حدیث، تفسیر و تاریخ اور معانی و بیان سے متعلق ہیں۔

سہیل عظیم آبادی: سہیل عظیم آبادی صوبہ بہار کے اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں پریم چند کے گہرے رنگ کو قبول کیا، سہیل صاحب کی تصانیف میں 'الاؤ'، 'چار چہرے'، 'بے جر کے پودے' (ناولٹ) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

رخشاں ابدالی: رخشاں ابدالی بہار کے اردو کے نثری ادب میں ایک اچھا خاصہ مقام رکھتے ہیں، موصوف کے مقالے ہندوپاک کے مختلف جرائد میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خصوصی طور پر صوبہ بہار کے رسائل 'رسالہ ندیم'، جو مختلف اداروں میں تقریباً ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۹ء تک گیا اور آخر میں پٹنہ سے شائع ہوئے۔ 'فطرت'، 'راجگیر'، 'گنجینہ پٹنہ'، 'معارف اعظم گڑھ'، 'یادگار لاہور' اور 'قومی زبان کراچی' مخزن الحمر لاہور جیسے رسائل میں آپ کے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن موصوف کے دو مقالے اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء اور غالب کی اصلاحیں مخزن جولائی ۱۹۵۰ء میں شائع ہو کر مقبول و معروف ہوئے، جناب مولوی احمد اللہ ندوی اپنی تصنیف 'مسلم شعراء بہار جلد دوم' میں لکھتے ہیں کہ ایک تصنیف صوفی میری کی شخصیت پر لکھی ہے۔

حمید عظیم آبادی: حمید عظیم آبادی دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اپنے شاعری کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ موصوف کے مقالات 'رسالہ ندیم' میں کافی شائع ہو چکے ہیں۔ راسخ عظیم آبادی کی شاعری سے متعلق ایک کتاب لکھی اس کے علاوہ آپ کا ایک کتابچہ 'رسالہ انشاد شاد' مولفہ صبح الدین لکھی کے جواب میں لکھا، اس رسالہ میں طنزیہ جملے مزید استعمال کئے گئے ہیں، بہر حال حمید صاحب بہار کی اردو نثر نگاری میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکے، حمید عظیم آبادی اپنے اساتذی محترم جناب شاد عظیم آبادی کا دیوان 'مخزن الہام' کے عنوان سے مرتب کیا، 'مخزن الہام' کا مقدمہ علامہ سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا۔

ولی کا کوئی: ولی کا کوئی نے نثر میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی بلکہ یوں کہے کہ ضمناً انہوں نے

نثر نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔ موصوف کے مقالات ہندوپاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہی صاحب کا ایک مضمون رسالہ نقوش لاہور شخصیات نمبر میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ قاضی محمد سعید :- قاضی محمد سعید کے چند مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاص تحقیقی ہیں چنانچہ قاضی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں اردو کے مخطوطات کی نمائش کا اہتمام اپنی سرکردگی میں کیا تھا بعد ازاں ان نمائش کی ایک فہرست بھی مرتب کر کر شائع کی، افسوس ہے کہ قاضی صاحب نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔

مولوی سید عبدالرؤف ندوی :- رؤف صاحب کی چند گراں قدر تحقیقی تاریخی مضامین بہار کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے، ان رسالوں میں معارف اعظم گڑھ اور رسالہ معاصر پٹنہ کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ رؤف صاحب مرحوم ایک محقق تھے افسوس ہے کہ وہ شہرت حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ کلیم الدین احمد : کلیم الدین احمد حالی کے بعد اردو کے عظیم ناقد ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو واضح شکل دی۔ کلیم صاحب نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی ہے آپ کی کتابیں یہ ہیں (۱) اردو شاعری پر ایک نظر ۲ جلد (۲) علی تنقید (۳) اردو تنقید پر ایک نظر (۴) سخن ہائے گفتنی۔ تحقیقی تصانیف میں دو تذکرے (تذکرہ شورش اور تذکرہ عشق) کو مرتب کیا لیکن اس میں صرف حرف س تک کے شعرا کے حالات ہیں، کلیات شاد ۳ جلد، کلیات جوشش، مقالات قاضی عبدالودود ۱ جلد ان سب تصانیف کو آپ نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر اختر اویسی :- اختر اویسی ملک کے مشہور و معروف افسانہ نگار و ناقد ہیں، اختر صاحب نے اردو نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ بنیادی طور پر اختر صاحب نے بحیثیت افسانہ نگار اور ناقد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ان کی تصانیف یہ ہیں (۱) حسرت تعمیر (ناول) شہنشاہ حبشہ (ڈراما) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۹۵۷ء تک (تحقیق) سپنوں کے دیش میں، کلیاں اور کانٹے افسانوں کے مجموعے) سراج و منہاج، تحقیق و تنقید، کسوٹی اور قدر و نظر (تنقیدی مضامین کے مجموعے)۔

قاضی عبدالودود : قاضی عبدالودود ملک کے مشہور و معروف محقق ہیں۔ قاضی صاحب کے لگ بھگ ڈھائی سو مضامین ہندوپاک کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے، قاضی صاحب نے باضابطہ

کوئی کتاب نہیں لکھی۔ قاضی صاحب کی تصانیف یہ ہیں: تذکرہ ابن طوفان مرتبہ دیوان جوشش،
 اشتر و سوزن اور عیارستان، اس کے علاوہ قاضی صاحب غالب بحیثیت محقق، آئاد بحیثیت محقق اور
 عبدالحق بحیثیت محقق مستقل ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، قاضی صاحب کے مقالوں کو جناب
 کلیم الدین احمد نے کتابی شکل میں مرتب کر کے مقالات قاضی عبدالودود بہار اردو اکادمی کی سہ سے شائع کیا،
 مسلم عظیم آبادی: جناب مولوی احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد چہارم
 میں جناب مسلم عظیم آبادی کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ یہ تفصیلی حالات ان کی خود نوشتہ تحریر سے ماخوذ ہے۔
 بہر حال مسلم عظیم آبادی نے شاعری سے زیادہ ادبیاتِ شرکی طرف بھی توجہ کی ہے۔ موصوف نے اردو کے علاوہ
 انگریزی زبان میں بھی کتابیں لکھی ہیں ان کی تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

(۱) مشیر الحق عربی نحو سہل اردو میں مع مترادف اصطلاحات انگریزی گرامر (۲) سلیقہ تحریر مبتدیان
 کے لئے (۳) مبادیات لسانیات فارسی انگریزی میں (۴) فارسی علوم اور اسلام پارسی قوم اور علوم کے
 ساتھ مسلمانوں کا سلوک، (۵) ذکر حبیب سیرۃ النبویؐ بالترام روایات صحیحہ مع مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد
 مجالس سیرت کے (۶) دولت فکر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ (۷) شادی کہانی شادی زبانی ترتیب و تکمیل (۸)
 معتقدات عجم یہ کتاب اسلام پر عجمی عقائد کے اثرات کی تاریخ ہے، برسوں کی کاوش کے بعد یہ کتاب مطبع جامعہ
 ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں طبع ہو کر تیار ہوئی تو مؤلف کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا کیونکہ اس کتاب کے سارے
 مواد اہل سنت مورخین سے ماخوذ تھے یا مغربی متاخرین کی تحقیقات سے بعد، مؤلف نے اسماعیل فاضل
 ڈاکٹر زاہد علی ڈی نل کسن پروفیسر عربی پرنسپل نظام کالج حیدر آباد دکن کی دو ضخیم تالیف تاریخ فاطمی مصر
 سے استفادہ کر کے اپنی کتاب مکمل کی لیکن حکومت پاکستان نے اس کتاب کے شائع ہونے پر پابندی عائد
 کر دی، مسلم عظیم آبادی نے ڈاکٹر قیام الدین کی کتاب *Wahabi movement in India*
 کا اردو میں بھی ترجمہ کیا اور یہ کتاب پاکستان میں شائع ہو گئی ہے۔

پروفیسر سید حسن عسکری:۔ حسن عسکری صاحب ملک کے مشہور و معروف مورخ ہیں۔ موصوف
 نے تاریخی و تحقیقی مقالات اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہے، حضرت آیت اللہ جہری کی مثنوی، مثنوی گوہری
 آپ ہی کی بدولت منظرِ عالم پر آئی، عسکری صاحب کے مضامین کو مرتب کر کے جناب ڈاکٹر سید محمد حسین صدر

شعبہ اُردو نگدہ یونیورسٹی بہار اُردو اکادمی کی سعی سے شائع کر رہے ہیں۔

عطا کا کوئی : عطا کا کوئی کا شمار صوبہ بہار کے ایک مشہور و معروف محقق اور ناقد میں ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ آپ نے نثر میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے تنقیدی مطالعہ اور نقابلی مطالعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ بیدار عظیم آبادی پر ایک کتاب "حیرت زار" چھپ چکی ہے، دو مشہور تذکرے "سفینہ ہندی" اور "سفینہ خوشگو" کو آپ نے ایڈٹ کیا ہے۔

مولوی احمد اللہ ندوی : احمد اللہ ندوی کی حیثیت صوبہ بہار کے تذکرہ نگار اور محقق کی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک اہم اور وسیع تذکرہ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" ۶ جلد کراچی پاکستان سے شائع ہو چکا ہے، بلاشبہ مولوی احمد اللہ ندوی نے یہ تذکرہ کافی محنت کے بعد لکھا ہے۔

معین الدین وردائی : معین الدین وردائی صوبہ بہار کے ایک مایہ ناز محقق تھے۔ ان کی کتابوں میں بہار اور اردو شاعری، سلسلہ فردوسیہ قابل ذکر ہے، ماسوا اس کے وردائی صاحب کے کافی تعداد میں تحقیقی مقالات صوبہ بہار کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

مذکورہ بالا سطور میں فیض الدین بلخی مرحوم کے عہد سے تعلق رکھنے والے بہاری نثر کی نگارشات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اس سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ بہار میں اردو نثر اپنی ہر ایک صنف میں ایک واضح شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جلد پنجم

فصح الدین بلخی بہ حیثیت مورخ

فصح الدین بلخی مرحوم کی تاریخی کتابیں دو ہیں، ایک تاریخ مگدوہ اور دوسری *Wahabi movement in Bihar* تحریک وہابیہ اور بہار، ذیل میں ہم دونوں تصنیفات کا جائزہ لے رہے ہیں جس کے سبب فصح الدین بلخی مرحوم ادبی دنیا میں ایک مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

- تاریخ مگدوہ یعنی صوبہ بہار کی مکمل تاریخ ۶۴۲ ق م سے ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) تک کے تمام تاریخی واقعات درج ہیں، یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:
- باب اول ابتدائی حالات اور ۶۴۲ ق م سے تندر خانان کی حکومت ۱۹۴۳ء تک۔
- باب دوم موریہ خانان کی حکومت ۱۹۴۳ ق م سے ۱۸۶۱ء ق م تک۔
- باب سوم سونگا خانان کے زمانہ سے اندھرا کی حکومت کے بعد ۱۸۶۱ء تک۔
- باب چہارم گپتا خانان کی حکومت ۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۳ء
- باب پنجم بت شکن برہمن ساسانیوں کے حملے کے بعد سے ۱۹۴۳ء تک کے مختلف واقعات۔
- باب ششم پال خانان کی حکومت ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء۔
- باب ہفتم اقتطاع بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز۔
- باب ہشتم بہار و بنگال میں خانانِ علی کی حکومت۔
- باب نہم اقتطاع بہار و بنگال میں طوائف الملوکی اور آزاد حکومت کا آغاز۔
- باب دہم صوبہ بہار میں سلاطین شرقیہ کی حکومت۔

باب یازدہم بہار میں پٹھانوں کی حکومت۔

باب دوازدہم بہار میں شہنشاہ اکبر کی حکومت ۱۵۴۲ء تا ۱۶۰۵ء

باب سیزدہم جہانگیر بادشاہ کا دور ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۵ء

باب چہار دہم شاہجہاں کا دور ۱۶۲۵ء تا ۱۶۵۷ء

باب پانزدہم اورنگ زیب کا عہد ۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء

باب شانزدہم سلاطین مغلیہ کے ورثا کا دور ۱۷۰۷ء تا ۱۷۶۰ء

باب ہفت دہم بہار کا بنگال میں شامل ہونا اور صوبہ داروں کی منصوبہ بازی

اشجاع محمد خاں اسد جنگ ۱۷۶۱ء تا ۱۷۶۹ء

باب نوزدہم انگریزی حکومت بحیثیت شاہی دیوان ۱۷۶۵ء تا ۱۸۵۷ء

باب بستم سلطنتِ برطانیہ کی براہ راست حکومت ۱۸۵۸ء تا ۱۹۳۰ء

اس باب میں تبدیلی وزارت ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی ۱۹۴۲ء

کی تحریکات اور ۱۹۴۳ء کے کچھ حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔

تاریخ گدھ فصیح الدین بلخی مرحوم کا اپنے ملک و قوم اور خصوصی طور پر اپنے وطن دالوں کو دیا ہوا

ایک بیش بہا سرمایہ ہے اس کتاب میں صوبہ بہار کے مکمل تاریخی واقعات و حالات مستند تاریخی کتابوں

سے اخذ کر کے سلسل اور مکمل طور پر ماخذوں اور حوالوں کے ساتھ تفصیل وار درج ہیں یعنی ۲۷ انگریزی

تاریخوں اور ۲۶ اردو فارسی تاریخوں کے ماخذ اور حوالات مستند طور پر درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی ۲۰۸ سے تعلق رکھتی ہے، انجمن مذکور نے ۱۹۴۴ء میں دہلی سے شائع کرایا

اور اس کی اشاعت کا سہرا خصوصی طور پر آنجنابی سر تیج بہادر سپرو کو ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

کے بلخی صاحب مرحوم سے گہرے تعلقات تھے جس کی نشاندہی سہیل عظیم آبادی کے مضمون "بلخی صاحب"

سے ہوتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی یوں رقمطراز ہیں:

”شاید ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو دہلی نے ان کی کتاب تاریخ گدھ شائع کی۔

”ملاحظہ ہو سہیل عظیم آبادی کا مضمون "بلخی صاحب" مخطوط۔

بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں اکثر باریابی کا موقع ملتا ہے، بابائے اردو نے
 بار بار اس کتاب کی تعریف کی۔ یہ کتاب ۱۰ x ۵ کی تقطیع ہے۔ پوری کتاب میں
 مقدمہ سے لے کر اختتام تک چار سو اہتر (۴۶۹) صفحات ہیں، ۱۵ صفحات پر فہرست
 مضامین ہے چار صفحات برہان کتابوں کے حوالے درج ہیں جن سے یہ تاریخ مرتب
 کی گئی ہے۔“

میں ادھر عرض کر چکا ہوں کہ پوری کتاب ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے، ان ۲۰ ابواب کے علاوہ سات
 صفحات پر کتاب کا مقدمہ ہے جو ملنی صاحب مرحوم ہی کا پسزد قلم کیا ہوا ہے، یہ مقدمہ اس اعتبار سے بھی خصوصی
 اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں صاحب کتاب نے صرف کتاب ہی سے متعلق مواد کی نشاندہی کی ہے بلکہ
 صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت پر بھی دلیلوں اور حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، مقدمہ کا حرف آغاز بھی اس
 جملے سے شروع ہوتا ہے :

”کسی مقام کی عظمت اس کی تاریخی قدامت یا اس کی مذہبی یا سیاسی اہمیت
 کے سبب ہوتی ہے اور اس اعتبار سے گدھ صوبہ بہار کی سرزمین جس پر گیر برنج
 (قلعہ راجگڑھ) پاٹلی پتر، نیرپٹہ و عظیم آباد کی بنیاد قائم ہوئی، ہندوستان کی تاریخ
 میں نہایت ہی عظیم الشان مقام ہے۔“

اس کے بعد ہندو قدیم سے دور حاضر تک ہندوستان گیر اہمیت رکھنے والے مذہبی، سماجی
 اور سیاسی واقعات کا قوالہ دیتے ہوئے مرحوم نے اس صوبہ کی تاریخی اہمیتوں کو ثابت کیا ہے کہ
 ”مذہبی حیثیت سے دنیا کے مشہور مذاہب (بودھ، دھرم اور جین دھرم) کا
 آغاز اور ان کی نشوونما اس سرزمین بہار میں ہوئی اس لئے کہ وڑوں نفوس اس کو
 مقدس و متبرک مانتے ہیں۔“

تاریخی اور سیاسی طور پر ہندوستان میں منظم حکومت سنسکرت قبل مسیح کے قریب راجہ چندر گپت موریہ

نے قائم کی۔

اس طرح بلخی صاحب مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ صوبہ بہار کو نہ صرف تاریخی اعتبار سے ہندوستان گنہ
بلکہ عالمگیر اہمیت بھی حاصل ہے، اس صوبہ کی تاریخی حیثیت کو موزا لے کے لے مقدمہ میں یہ بھی ثابت کیا
ہے۔ لکھتے ہیں:

”مردم خیزی میں اس سرزمین کو ایک امتیازی رتبہ حاصل ہے جس طرح سلطنت قدیم
کے قریب چند رگیت موریہ نے ایک معمولی شخص کی حیثیت سے ترقی کر کے لکھ سے
سرحد ایران تک اپنی سلطنت قائم کی اسی طرح سولہویں صدی کے وسط میں یہاں کا
ایک باشندہ فرید خاں ملقب بہ خیر شاہ معمولی جاگیر دار کی حیثیت سے ترقی کر کے
سارے ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔“

مختصر یہ کہ اس کتاب کا یہ مقدمہ بذات خود صوبہ بہار کی مختصر ترین مگر جامع تاریخ ہے، مقدمہ
کے آخری حصے میں مرحوم نے اپنے ان ذخیروں کا ذکر کیا ہے جن میں صوبہ بہار کے جغرافیائی حالات و آثار
قدیمہ اور عمارات کی تصنیف اور سیکڑوں کتبہ انہوں نے بڑی محنت اور جستجو سے حاصل کئے ہیں ان کو
وہ کتابی شکل دینا چاہتے تھے جو ان کی غیر مطبوعہ تصنیف کی بھرپور حیثیت رکھتی ہے، تاریخ لکھ بارہ
سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔

”الحمد للہ اس کتاب میں ۶۴۲ ق م سے ۱۹۴۳ءء مطابق ۲۶۲ھ تک
لکھ، پاٹلی پتر، بہار و عظیم آباد، پٹنہ کے سلسلے وار تاریخی حالات اختتام کو
پہنچے اور راقم کی بارہ برس کی محنت ٹھکانے لگی۔“
مقدمہ کا اختتام اور کتاب کا اختتام بھی حافظ شیرازی کے مشہور شعر پر ہوتا ہے
احمال ماز عوصلہ نامہ پیش بود
لختہ ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ام

”لے، مقدمہ تاریخ لکھ مصنف ضمیمہ الدین بلخی مرحوم

اور کتب کا اختتام بھی اس شعر پر ہوتا ہے ۔

بشری تراز حکایت مانیت قصہ

تاریخ روزگار سراپا پوشتہ ایم

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبہ اردوٹی۔ ان بی کالج بھاگلپور اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان فیض الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات میں تاریخ گدھ سے متعلق اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں۔

”تاریخ گدھ صوبہ بہار کی پہلی مستند تاریخ ہے جس میں دلائی سے انگریز

مورخوں کی بے شمار غلطیوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی بہت سے اپنے

اہم واقعات پیش کئے گئے ہیں جو جنگ مرہٹوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔“

نیز یہ لکھتے ہیں:

کہ اس کتاب کے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبہ بہار کے

سابق گورنری آر آر دیوار کی تالیف Bihar through the ages

کا ایک اہم ماخذ یہ کتاب بھی ہے۔

سید عبدالرؤف ندوی مرحوم اپنے گرانقدر تحقیقی مقالہ ”فیض الدین بلخی کی عظیم شخصیت“ میں یوں رقمطراز ہیں۔

”بلاشبہ بہار کی تاریخ اور بزرگوں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اور لکھی بھی ہے

مگر جس شرف نگاہی تحقیق و تعدیل سے انہوں نے لکھا ہے مورخین دادمیتے ہیں

اور فن کے صحیح معیار پر بھی اترتی ہے جس دور اور عہد کے واقعات درج کتاب ہیں

مستند ہیں حوالات درج ہیں۔ مبالغہ سے پرہیز اور اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔“

فیض الدین بلخی مرحوم سے قبل خصوصی طور پر خان بہادر سید علی محمد شاد نے بھی تاریخ نویسی کی طرف

توجہ کی تھی لیکن موصوف تاریخ نویسی کے فن سے نا آشنا تھے۔ ان کی تاریخی کتابیں تاریخ صوبہ بہار اور

نقش پائیدار (سہ جلد) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

”مقالہ فیض الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوط۔“

فائلر دھاب اشرفی اپنے گراں قدر تحقیقی مقالہ "شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" میں شاد کی تاریخ نویسی کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"شاد کی تاریخ بحیثیت زیادہ اہم نہیں اس لئے کہ تاریخ نویسی جو جوہر چاہتی ہے وہ ان کی ذات میں نہ تھا۔"

خود شاد عظیم آبادی تاریخ صوبہ بہار کے دیباچہ میں اپنی تاریخ نویسی پر فخر نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک مشکل فن سمجھتے ہیں۔

تاریخ گدھ شاد کی تاریخ "صوبہ بہار" کی تمام غلطیوں کا پردہ فاش کرتی ہے جہاں شاد نے سنی سنائی باتیں اپنی تاریخ میں درج کی ہیں، دیباچہ صوبہ بہار میں شاد عظیم آبادی نے تاریخ کے مواد سے متعلق اپنی واقفیت پیش کی ہے، نیز شاد نے حیات فریاد کے دیباچہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "راقم نے ۱۸۷۶ء میں جو تاریخ بہار لکھی وہ حضرت فریاد کے زبانی لکھوؤں پر مبنی ہے، شاد نے بہار کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے:

یوں تو حالیہ بہار گدھ دیش کے نام سے موسوم تھا لیکن اس سر زمین میں جہاں اس وقت قصبہ بہار ہے برہمنوں نے ایک دارالعلوم قائم کیا تھا چونکہ سنسکرت میں دارالعلوم کو دھار کہتے ہیں اسی سبب اس کا نام بہار مشہور ہو گیا۔" فیض الدین بلخی تاریخ گدھ میں بہار کی وجہ تسمیہ یوں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۷۷۷ کے قریب راجہ گوہال نے دھار بنوایا اور راجاؤں نے (جس جگہ موجودہ قصبہ بہار ہے) دھارے کی تعمیر میں اضافہ کیا انہی دھاروں کے سبب قصبے کا نام بہارہ (بہار) ہو گیا اور دارالحکومت ہونے کے سبب تمام گدھ پر اس نام کا اطلاق ہو گیا۔ (تاریخ گدھ ص ۹۷)

آر۔ آر۔ دیوکر کی کتاب بہار فردی ایجز Bihar through the ages ص ۵۱ پر ہے

"The territory of Bihar covered State of Bihar today did not bear its present name. In the ancient period the name of Bihar was give by the Muslim invaders.

ادنت پوری کے نواح میں جہاں عالیہ بہار شریف ہے وہاں دیہاروں کی کثرت دیکھ کر مسلمان آواروں نے اس کا نام بہار رکھ دیا۔

فیض الدین بلیغی مرحوم نے بہار کی جو وجہ تسمیہ بتائی ہے اس کے ماخذ میں دی اہل ہسٹری ص ۳۲ کا حوالہ دیا ہے۔

مختصر یہ کہ فیض الدین بلیغی مرحوم نے جتنے تاریخی واقعات اپنی تصنیف میں لکھے ہیں ان کے ماخذ اور حالات ادلتا آخر درج کئے ہیں، ایسی مثالیں ہم پوری کتاب میں پاتے ہیں، اس کے برعکس شاد عظیم آبادی نے اپنی تاریخ میں صرف سنی سنائی باتوں پر عمل کیا ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے تحقیقی مقالے میں جہاں شاد کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا ہے وہاں تاریخ گدھ کے حوالے سے شاد کی تمام غلطیوں کا پچھا چٹا پیش کیا ہے، نیز تاریخ بہار اور تاریخ گدھ کا موازنہ بھی کیا ہے پچھانچہ کتاب کے خاتمہ میں مورخ نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ تاریخ گدھ سے قبل ہمارے صوبہ کی کوئی مکمل تاریخ نہیں تھی بلکہ صاحب لکھتے ہیں :

"لیکن گزشتہ واقعات کے متعلق ایسی کوئی تاریخی کتاب موجود نہ تھی جس میں ہمارے صوبہ کی مکمل تاریخی حالات مستند تاریخوں کے حوالے سے مرتب کئے گئے ہوں ایک مورخ کو خصوصی طور پر اعتدال پسند اور مبالغہ سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مورخ کو تاریخ نویسی کے ضمن میں غیر جانبدار رہنا چاہئے یعنی حقائق کو منظر عام پر لانا مورخ کا مقصود ہوتا ہے، واقعات میں تضاد کی کیفیت نہیں آنی چاہئے نیز یہ کہ کسی تاریخی حالات کو قلمبند کرتے وقت کسی کا طرفدار نہیں ہونا چاہئے۔"

نصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی کا جہاں تک تعلق ہے ایسی تمام خوبیاں ہم پاتے ہیں، تاریخ نگدہ ہویا وہابی موومنٹ (Wahabi movement) موصوف کی دونوں تاریخوں ایسی خصوصیتیں پاتے ہیں 'فی الحال' تاریخ نگدہ سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بت شکن راجہ ساسانیکا جس نے بودھ مذہب کے ماننے والوں پر ایسے ظلم ڈھائے جو فعل دراصل انسانیت کے منافی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی مقدس عبادت گاہوں کو بھی نیست و نابود کر دیا بلخی صاحب مرحوم ان واقعات کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں :

”ساسانیکا بودھ دھرم کا سخت مخالف تھا“ اس نے اس مذہب کے ماننے والوں کو سخت ایذائیں پہنچائیں، نگدہ بودھ دھرم والوں کی مقدس جگہ تھی یہاں حملہ کر کے اس نے تمام بودھسٹ مورتیوں اور عمارتوں کو توڑ کر خاک میں ملا دیا اور اس مذہب کی ایسی بیخ کنی کی کہ بودہ گیا کے مقدس درخت کو جس کے سائے میں گوتم کرہقانیت اور روشن ضمیری حاصل ہوئی تھی جڑ سے کٹوا کر ”بادیا“۔

اس مختصر عبارت میں بلخی صاحب مرحوم نے خصوصی طور پر راجہ ساسانیکا کے اس سیاہ کارنامہ پر اپنے سخت رد عمل کا اظہار کیا ہے اور یہ جملہ ”اس مذہب کی ایسی بیخ کنی کی“ پر معنی اہمیت کا حامل ہے حالانکہ راجہ ساسانیکا ایک برہمن تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بودھ دھرم سے ذاتی طور پر بغض رکھتا تھا۔ بلخی صاحب مرحوم دنیا کے ہر مذہب کا تہ دل سے احترام کرتے تھے خصوصی طور پر اس کی واضح مثال ہندو دھرم کی مقدس دیوی سیتا [ؑ] کے ضمن میں جو ان کے خیالات ہیں کیونکہ انہوں نے بودھ دھرم پر ہونے والے مظالم کی سخت مخالفت کی ہے اور بودھ دھرم کا احترام کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لفظ بیخ کنی کو استعمال کیا ہے، اکثر انگریز مورخوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جہاں کسی مذہب کا ذکر آیا وہاں انہوں نے تعصب کا سہارا لیا، اس ضمن میں مذہب اسلام کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، اکثر متعصب انگریز مورخوں نے مذہب اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ مکہ ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی، ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، میں
سوانح حیات کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ بلّی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین بلّی
عمر بھٹیشلسٹ (Nationalist) رہے اور بلّی صاحب بھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے
گاندھی جی کے عدم تعاون تحریک (Non co operation movement) کے سلسلہ میں
جو نپور کی مجسٹریٹی سے استعفا دے دیا اور کھادی کے لباس میں بلبوس ہوئے لیکن بلّی صاحب مرحوم
کی دور میں نگاہ متقی راہنوں نے سلسلہ ۱۹۴۲ء میں ہونے والے تشدد آمیز فسادات کے سلسلے میں
کانگریسیوں کی تعریف نہیں کی کیونکہ کانگریسیوں نے وحشیانہ حرکتیں کیں بلّی صاحب مرحوم سلسلہ
کی تحریک میں لکھتے ہیں :

”بعض مقام پر ان ظالم باغیوں نے ایسی وحشیانہ حرکتیں کیں جن سے ہر ایک نیک نفس
انسان کا دل دہل جاتا ہے، انہوں نے سیتا ٹرھی (ضلع مظفر پور) کے سب ڈویژنل ایفیسر اور پولیس
انسپیکٹر کو س دو چہرہ سیوں کو سر راہ گھیر کر محض اس جرم پر بار ڈالا کہ انہوں نے کانگریسی بننے سے
انکار کیا، پٹنہ کے قریب سی ریل کے مسافروں میں ہوائی جہاز کے (وائسروں کو جو ملک کیفٹا (امریکہ)
کے رہنے والے تھے وحشیانہ طور پر مار ڈالا۔“

اس مختصر سی عبارت کو پڑھنے کے بعد اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ بلّی صاحب مرحوم کانگریسیوں
کے اس فعل سے سخت نالاں نظر آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلّی صاحب مرحوم انگریزوں کی مداحی
کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنا غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا کیونکہ ایک مورخ کی طرز تحریر سے
جانبداری ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ بلّی صاحب مرحوم کو ہم تاریخ نویسی کے معاملہ میں غیر جانبدار
پاتے ہیں اس کی ایک اور مثال کو لیجئے بلّی صاحب مرحوم بیتابی سبھااش چندر بوس کو اس پالیسی
سے سخت برہم نظر آتے ہیں جو انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے خفیہ طور پر نازی جرمنوں اور
جاپانیوں سے ساز باز کیا تھا، بلّی صاحب مرحوم لکھتے ہیں :

۱۔ "غیر مسلم فرقوں میں کچھ اشخاص ایسے بھی ہیں جو جاپان کی حکومت کو مددگار بنا کر انگریزی حکومت کا استحصال کرنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ناخدا شناس اور ناخدا ترس جاپانیوں سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی اور اہل چلیں چھ برس سے ان کی شرارتوں کا تلخ تجربہ اٹھا رہے ہیں۔ عوام الناس کو اس کا بھی یقین ہے کہ بابو سبھاش چندر بوس کلکتہ سے خفیہ فرار ہو کر جرمنوں اور جاپانیوں کی پناہ میں ہیں۔" اس عبارت کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نیتا جی سبھاش چندر بوس کی اس سیاسی غلطی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس جملہ پر ان کا مزید زور ہے "ناخدا شناس اور ناخدا ترس جاپانیوں سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔"

تاریخ صرف کسی صوبہ یا ملک یا کسی مخصوص قوم کی تاریخ نہیں ہو سکتی، تاریخ بدلتے ہوئے حالات کی ہوتی ہے لہذا بلخی صاحب مرحوم انصاف پسند مورخ نے سبھاش چندر بوس کے اس کارنامہ کو نہیں سراہا کیونکہ جاپانیوں اور جرمنوں سے بھلائی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی کیونکہ اہل چلیں جاپانیوں کے ظلم کا مزہ چکے ہیں اور یہ بلخی صاحب مرحوم کو عظیم مورخ ہونے کی ایک عظیم دلیل ہے۔

تاریخ مگدھ اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص مگدھ کی تاریخ ہے، عام طور پر مورخ اپنے بیان کو تقویت پہنچانے کے لئے دوسرے مورخوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ فیض الدین بلخی مرحوم نے تاریخ مگدھ میں دوسرے تاریخ دانوں کے علاوہ فارسی کی منظوم تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے، تاریخ میں ادبیت، شہرت پیدا کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، منیر کب فتح ہوا اور یہاں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم کب آئے، انہوں نے مختلف تاریخی حوالوں کے علاوہ اس کے ثبوت میں فارسی کے دو اشعار بھی پیش کئے ہیں، بلخی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

۲۔ "منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۷۶ھ ۱۱۸۱ء میں

حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں پچیس آدمیوں کے نام سفینوں میں مذکور ہیں اور فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے:

یافت چوں بر راجہ منیر طغر
داد امام از دیں چہلے راندی
ہست منقول از بزرگان سلف
سال آن دین محمد شد قوی

۵۵۷۶ھ

تاریخ مکہ میں ایک سُرخ سیاحان غیاث الدین حاکم بنگالہ اور حافظ شیرازی کی ملتی ہے اور ریاض السلاطین ص ۱۰۵ کے حوالہ سے نیز تاریخ فرشتہ باب دوم ص ۴۲۲ کے حوالہ سے حضرت حافظ شیرازی سے متعلق باتیں کہی گئی ہیں۔ یعنی صاحبِ حرم نے لکھا ہے:

لے ایک بار غیاث الدین اعظم شاہ مشرقی بنگالہ کی طرف گیا ہوا تھا۔ اتفاقاً اس سفر میں کوئی مرض ایسا لاحق ہوا کہ اس کو زیست سے یاس ہو گئی۔ اس وقت اس کی تین بیویاں ساتھ تھیں جن کے لقب سر و محل، گل محل اور لالہ محل تھے۔ اس نے ان کو وصیت کی کہ میرے مرنے پر تم غرض کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا لیکن غیاث الدین اعظم شاہ نے مرض سے شفا پائی تو اس کی اور بیویوں نے ازراہ طعن ان کو غسل نہ کرنا شروع کیا، انہوں نے موقع پا کر اعظم شاہ سے شکایت کی، اس وقت عالم انبساط میں اعظم شاہ کی زبان پر برہمتہ یہ مصرعہ آیا ”ساقی حدیث سر و گل دلالہ می رود“ لیکن اس کے برابر کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہ آیا اور دربار کے شعرا بھی حسب دل خواہ مصرعہ نہ لگا سکے، اعظم شاہ نے یہ مصرعہ طرح ایک قاصد کی معرفت کچھ مخالف کے ساتھ حضرت شمس الدین حافظ شیرازی کے پاس روانہ کیا اور حضرت حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی۔ حضرت حافظ بھی بنگال آنے کے شائق تھے، کبر سنی اور صوفی سفر کا اندیشہ مانع ہوا۔ تاہم ایک غزل روانہ کی جس کے تین اشعار بیان سے خاص تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔ پوری غزل دیوان میں موجود ہے۔

ساقی حدیث سر و گل دلالہ می رود
شکر شکن ٹوند ہمہ طوطیان ہند
اس بحث از ثلاثہ غسالہ می رود
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ رشوقی مجلس سلطان غیاث الدین خامش مشوکہ کار تو از نامہ می رود
 "تاریخ اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص خشک ہوتی ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم
 کی تاریخ نویسی میں ادبی چاشنیاں بھی موجود ہیں جو فاضل مورخ کے گہرے ادبی ذوق کی نشاندہی
 کرتی ہیں، اس ضمن میں کتاب کی ابتدا میں مقدمہ کا اختتام اور کتاب کے آخر میں بھی اشعار موجود ہیں۔
 ڈاکٹر شعیب راہی اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی اور ان کا اسلوب" میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ
 نویسی کے ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

”وہ تاریخ نویسی کو ادب و شاعری کی بلند منزلوں تک لے جانے کے قائل تھے،
 فصیح الدین بلخی مرحوم نے تاریخ مکدہ لکھتے وقت ادبی واقعات کو بھی نظر انداز نہیں
 کیا ہے۔ مثال کے لئے غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین اولیا کے متعلق
 ”ہنوز دہلی دور است“ کے واقعہ کو بھی طبقات اکبری جلد اول کے حوالہ سے درج
 کیا ہے۔“

بلخی صاحب یوں رقمطراز ہیں:

”طبقات اکبری میں مذکور ہے کہ تغلق شاہ جب تربت آیا تو بعض وجوہ سے
 ناخوش ہو کر اس نے حضرت نظام الدین اولیا کو کہلا بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے
 دہلی سے نکل جائیں، شیخ نے اس کا اندیشہ کچھ نہ کیا یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ تغلق شاہ
 روانہ ہو کر دہلی کے قریب پہنچا چاہتا ہے، شیخ نے کہا ”ہنوز دہلی دور است“ اس کے
 بعد ہی تغلق شاہ دہلی سے ایک منزل پر اچانک ایک چھت کے گرے سے ہلاک ہوا۔
 بالآخر ”ہنوز دہلی دور است“ فارسی اردو میں محاورہ ہو گیا، چنانچہ سیر تقی میر کا شعر ہے
 شکوہ آبلہ ابھی سے میر ہے پیارے ہنوز دہلی دور

”فصیح الدین بلخی کا اسلوب مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی، شائع شدہ رسالہ زبان و ادب پٹنہ اکتوبر ۱۹۷۷ء
 صفحہ تاریخ مکدہ۔“

تاریخ اودھ مؤلفہ نجم الغنی بلاشبہ اودھ کی ایک مستند تاریخ ہے لیکن جس پیرائے اور جس انداز سے تاریخ نگدہ لکھی گئی ہے وہ بات نجم الغنی کی تاریخ میں نہیں پاتے، بلاشبہ اس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان اور انداز بیان پر آپ خود فرمائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک طرف صوبہ کی اہم تاریخ ہے تو دوسری طرف اس تاریخ کا لکھنے والا صرف ایک باشعور اور ذی علم مورخ ہی نہیں بلکہ ایک صاحب ذوق ادیب بھی ہے۔ جس کی انشا پر دلہی نے تاریخ نگاری کے بھاری بھر کم پن کو ادبی لہجے میں تبدیل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے مقالے فیض الدین بلخی مرحوم کی "چار تصنیفات" میں یوں لکھتے ہیں :

"اس کتاب کی زبان بہت ہی صاف و سادہ اور سلیس ہے، انداز بیان مورخانہ اور ناقدانہ ہے۔"

قلعہ پٹنہ کے متعلق بلخی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو :

"اس تاریخ داؤدی میں مذکور ہے کہ شیر شاہ نے بنگالہ سے واپس آکر پٹنہ میں گنگا کے کنارے قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا، مہاروں اور پشت کاروں نے پانچ لاکھ روپے اس کے خرچ کا تخمینہ کیا، شیر شاہ نے بعض معتمدوں کی نگرانی میں کام شروع کرایا اور کچھ عرصہ میں مستحکم قلعہ تیار ہو گیا۔"

کرنل ایڈل نے لکھا ہے کہ غالباً یہ قلعہ پاٹلی پترا کی اینٹوں سے تیار ہوا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا ہے کہ تاریخ شیر شاہی کے مطابق یہ قلعہ دو میل لمبا تھا اور اتنے بڑے قلعہ کے لئے پانچ لاکھ روپے صرف مزدوری کے کام میں ہو سکتے ہیں (بحوالہ ڈسکوری آف دی اکرزٹ سائٹ آف پاٹلی پترا) راقم کے خیال میں یہ قیاس نہیں اس لئے کہ پاٹلی پترا کے کھنڈروں میں جو اینٹیں پائی جاتی ہیں وہ اس قلعہ کی اینٹوں سے بالکل مختلف ہیں اور پاٹلی پترا کے خوشامترائے ہوئے پتھروں کا بھی کوئی وجود اس قلعہ کے کسی حصہ میں نہیں پایا گیا، برخلاف اس قلعہ کا وہ پستہ جو گنگا کے دھارے سے ٹکراتا ہے

جس کو لشب میر نے غلطی سے پہاڑی ٹیلہ سمجھا تھا اس کی تعمیر ہو رہی تھی اسی طور کی ہے جس طرح راجگیر میں گنگا نامی نالے کے قریب ترین فصیل ہے غالباً یہ حصہ راجہ اجات شتر دے کے بنائے ہوئے قلعہ کی یادگار رہ گیا ہے جس کی کیفیت اس راجہ کے حالات میں بھی مذکور ہو چکی ہے، چینی جاتری پوٹنگ جو انگ کی تحریر سے بھی پایا جاتا ہے کہ ۶۳۸ء کے قریب گنگا کے کنارے جو شہر آباد تھا وہ فصیلوں سے محیط تھا۔ اس سے یہ بھی قریب قیاس ہے کہ شیر شاہ نے کوئی نیا قلعہ نہیں بنوایا بلکہ پرلے قلعہ کو درست کرایا اور اس کے لئے اس زمانہ میں پانچ لاکھ کی رقم کافی ہوگی۔

مختصر یہ کہ تاریخ مگدھ ایک مستند تاریخ ہے یہی وجہ ہے کہ جب انجمن ترقی اردو کے سامنے یہ کتاب پیش کی گئی تو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی اشاعت کا دم لے لیا۔ سید عبدالرؤف ندوی اپنے مقالہ فصیح الدین کی عظیم شخصیت میں یوں رقمطراز ہیں:

”انجمن ترقی اردو کے سامنے جب یہ کتاب پیش کی گئی تو مولانا عبدالحق مرحوم جیسے نقاد اور قدرداں ہستی نے اس کی طباعت و اشاعت کا دم لے لیا۔“

”Wahabi movement in Bihar“ تحریک وہابیہ اور بہار

فصیح الدین بٹنی مرحوم کی دوسری تاریخی تصنیفات کے ضمن میں *Wahabi movement in Bihar* کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، یہ مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ایک ہونڈ کڑی ہے یہ تصنیف انگریزی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ ایک مودخ کی حیثیت سے بٹنی صاحب مرحوم کا یہ دوسرا کارنامہ ہے۔

یہ تصنیف سر دست ۸ x ۱۴ کے سائز پر ٹاپ کی ہوئی ہے جس میں کم از کم ۳۲ سطریں (اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ سطریں ہیں) پوری کتاب اول تا آخر ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۶۰ دسٹھا صفحات

۱۔ مقالہ فصیح الدین کی عظیم شخصیت مصنف عبدالرؤف اورنگ آبادی۔ مخطوط
۲۔ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

میں سوبہ بہار میں تحریک دہا بیہ کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ان کتابوں کی فہرست مرتب نہیں کی جاسکی جن کے حوالے سے یہ تاریخ لکھی گئی ہے لیکن اول تا آخر فوٹو لٹس دیئے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے پوری کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبہ اردو ڈی۔ان۔بی۔کالج بھاگلپور نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے لیکن نا ضل مترجم نے اردو کے مشہور شاعر مونس دہلوی سلطان دہلوی بہادر شاہ تغور اور امیر تحریک دہا بیہ کے ذکر کو با ضابطہ ایک باب قرار دیا ہے۔ اس طرح ترجمہ میں ۲۳ ابواب کی جگہ ۲۴ ابواب ہو جاتے ہیں لیکن اس سے اصل کتاب کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۲۴ ابواب کی تفصیل یوں پیش کی جاتی ہے :

(۱) حضرت سید احمد شہید کا مسلک

(۲) شہر عظیم آباد کو مرکز قرار پانا

(۳) علمائے عظیم آباد کی خصوصیت

(۴) علمائے عظیم آباد کا سید احمد شہید کے ساتھ ہونا

(۵) اصول ہجرت

(۶) سرحدی جنگ

(۷) بالاکوٹ کا سانحہ

(۸) غزنی میں مولوی نصیر الدین کی شکست

(۹) حقارت ولایت علی اور عنایت علی غازی بحیثیت سربراہ۔

(۱۰) بری بھد میں دہائیوں کا اعتراف شکست

(۱۱) ۱۸۵۷ء تحریک کا حیار اور قلعہ دہلی کے اندر تبلیغ

(۱۲) سلطان دہلی اردو کے مشہور شاعر مونس دہلوی کی وساطت سے تحریک دہا بیہ کے امیر کو مدعو کرتے ہیں۔

(۱۳) عدم تعاون و خاموش مزاحمت اور متوازی حکومت

(۱۴) حضرت عنایت علی غازی کا برطانوی حکومت سے نبرد آزما ہونا۔

(۱۵) ۱۸۵۷ء میں دہلی کے دہاوی رہنماؤں کی گرفتاری۔

(۱۶) سرحد پر برطانوی لشکر کی یورش

(۱۷) مولوی عبداللہ کا منصب امارت حاصل کرنا۔

(۱۸) انبالہ کی عدالتی تحقیقات

(۱۹) پٹنہ کی عدالتی تحقیقات

(۲۰) جانگادوں کی ضبطی اور قبور کی بربادی و بے حرمتی

(۲۱) نتائج مابعد (عواقب)

(۲۲) ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۰ء میں امیر خاں حشمت دادخاں کی گرفتاری اور سزا

(۲۳) بے ضابطہ کاروائی

(۲۴) ۱۸۸۴ء میں باقیماندہ لوگوں کی رہائی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے اس کی فہرست جو فوٹ نوٹس میں ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل کتابیں ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) سیرت اسمعیل شہید

(۲) سیرت سید احمد شہید

(۳) خطوط سید احمد شہید

(۴) تذکرہ صادقہ مصنفہ مولوی عبدالرحیم صادق پوری (امیر کالابائی)

(۵) انڈین مسلم از ہنٹر ۵۲ (Indian Muslim by Hunter)

(۶) کلکتہ ریویو ۳۸ تا ۳۹ (Culcutta Review)

(۷) مضمون ڈاکٹر کے۔ کے مدتا شائع شدہ بہار جرنل حصہ اول

ماسوا اس کے محلہ صادق پور کے گھروں اور قبروں کے نقشے وغیرہ اس کتاب کے خصوصی ماخذ

کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم نے کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں پٹنہ سکریٹریٹ اور پٹنہ کلکٹریٹ کے سیکرٹریوں

کی چھان بین بھی کی تھی ان کے بھی حوالے دیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر اقبال صمد شعبہ ادوٹی۔ ان بی۔ کالج بھاگلپور اپنے گرانقدر مقالے فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات میں کتاب کے ماخذ کے سلسلے میں اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں۔

”اس کتاب کی ترتیب ذالیف میں تمام مستند ماخذ سے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مرحوم نے تمام اہل دستاویزوں کی چھان بین بھی کی اور ان کی مدد سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے اس گم شدہ باب کو نہایت ہی دل آویز و پیرایہ میں بیان کیا۔“

ہندوستان کی جنگ آزادی میں حضرت سید احمد بریلوی کی جماعت نے ایک نمایاں کام انجام دیا اس جماعت نے باضابطہ طور پر انگریزوں سے جنگ لڑی اور اس جماعت کے حامیوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے نیز سرحد میں ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی جس خلوص اور جوش سے یہ جماعت اپنے ملک سے انگریزوں کو نکلانے کے لئے کوشاں تھی اور آج سے بہت قبل انگریزوں کی حکومت کا ہندوستان سے صفایا ہو جانا لیکن ایہوں کی عماری اور انگریزوں کی عیاری و مکاری سے یہ جماعت پسپا ہو گئی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس تحریک کا جائزہ لیا جائے لگا تو لوگوں نے ان کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا۔ تعصبات کی دنیا میں ان بزرگوں کے کارناموں کو صحیح تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے، سید احمد بریلوی اور مجاہدین صادق پور نے جو کارنامے انجام دیئے ان کا آج کہیں نام و نشان نہیں، اس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں بہار کے علمبرداروں میں صرف بابو کنود سنگھ کا نام لیا جاتا ہے، اس طرح مولوی عبدالرحیم صادق پوری (امیر کالا پانی) کا نام کسی تاریخ میں موجود نہیں۔

اس موقع پر ملک کے کچھ باشعور اور انصاف پسند مورخوں نے اس جماعت کے کارناموں کو غلام سے روشناس کرانے کی کوشش، اس ضمن میں مولانا غلام رسول تھہر اور مولانا ابوالحسن ندوی کی کوشش قابل تحسین ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے یہ تصنیف لکھ کر ان بزرگوں کے کارناموں کو جنہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی، جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ ”فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت“ میں تحریک و ہامیہ بہار

(Wahabi movement in Bihar) کے بارے میں اپنی اپنی خیال ظاہر کرتا ہے۔

”یہ تذکرہ ان کی سیاست اور سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے۔ تذکرہ مذکور کو انگریزی میں مرتب کر کے صوبائی اقد مرکزی حکومت دونوں کے سامنے پیش کر دیا۔ مولانا آزاد مرحوم چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے طبع ہو کر شائع ہو لیکن ان کی مجلس کے ارکان نے انہیں اجازت نہیں دی۔“

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے ”راندھرتھالہ“ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات میں تحریک واپس بہار کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنی اپنی اظہار خیال کرتے ہیں:

”اس غیر مطبوعہ کتاب سے کئی اہل علم استفادہ کر چکے ہیں، حال ہی میں اس موضوع پر پیر قیام الدین صاحب نے ایک راندھرتھالہ (Thesis) پیش کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس مقالہ کی ترتیب میں اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اس طرح صوبہ بہار کے مشہور و معروف مولانا اور فی الحال مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کالی نکروت صاحب کی کتاب Freedom movement in Bihar کی تدوین میں بھی بلخی صاحب مرحوم کی اس کتاب سے مدد لی گئی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے اس کتاب کے آغاز میں یوں تحریر فرمایا ہے:

“The term Wahabi which means disciple of Abdul Wahab of Najad (Arabia) was applied to them by the British for the purpose of political propaganda. The Wahab of Najad had defied Turkish authorities in Arabia and resisted British influence in North Africa. The British subsequently took revenge in 1898 by destroying the grave

of Mahadi the last great leader of
the sect in Sudan."

ہندوستان کی آزادی کا کوئی بھی تذکرہ بغیر وہابیوں کی تحریک کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں
ہو سکتا یہ اصطلاح انگریزوں نے عبدالوہاب نجدی کے پیروؤں کے لئے پروگنڈہ کی غرض سے
استعمال کیا تھا، نجد کے وہابیوں نے عرب کے ترکی حکمرانوں سے مقابلہ کیا، شمالی افریقہ میں برطانوی
اثر و اقتدار سے ٹکری لیتی تھی، برطانیہ نے آخر کار اس فرقے کے آخری امام مہدی کی قبر کھودی۔

بلخی صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "تحریک وہابیت اور بہار" میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے
کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کانگریسی رہنماؤں نے بطور تین سیاسی حربہ "عدم تعاون"
غاموش مزاحمت اور متوازی حکومت استعمال کیا تھا دراصل اس کی وارغ بیل وہابی رہنماؤں نے
ڈالی تھی، بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

^۱
"It is highly interesting to note that the
use of the three great weapons namely
non-co-operation, passive resistance
and establishing parallel government
which the Congress leaders adopted to
fight against the bureaucracy was
originally advocated and preached
by the Wahabis."

راقم اوپر عرض کر چکا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند مورخ
تھے اس کی مثالیں راقم نے تاریخ گدھ کے قوالے سے دی ہیں۔ تحریک وہابیت اور بہار، میں بھی

ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں۔

برطانوی حکومت نے ۱۸۶۲ء میں دہا بی رہنماؤں پر مقدمہ چلایا اور بہنوں کو سزائے موت کا فیصلہ صادر کیا گیا، جس جج نے پھانسی کا حکم دیا تھا اس کا نام سر ہربرٹ ایڈورڈس (Sir Herbert Edwards) تھا۔ فیصلے کے مطابق حضرت جعفر تھانی شوری، مولوی یحییٰ علی، مولوی الہی بخش، مولوی احمد اللہ وغیرہ کو سزائے موت دینی تھی چنانچہ جج نے ان ملازموں سے متعلق اپنے فیصلے کے تمام کاغذات نیچے بڑھا دیئے لیکن بعد میں یہ فیصلہ اس لئے تبدیل کر دیا گیا کہ ملازموں کے شہید ہونے کے سبب ان کی شخصیت زندہ جاوید ہو جاتی لہذا پھانسی کی سزا کے بجائے انہیں کالا پانی بھیج دیا گیا۔ عدالت عالیہ کے اس فیصلے اور نیچے کی عدالت کی تبدیلی پر بلنجی صاحب کس انداز سے تنقید کرتے ہیں، ہنر ۶۸ میں لکھتا ہے کہ برطانوی حکام نے نہایت ہی عقلمندانہ قدم اٹھایا کہ انہیں شہادت کے درجہ سے اس طرح محروم کیا لیکن یہ برطانوی امور اور کارکردگی پر نہایت ہی افسوسناک دھبہ ہے کہ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر عدالت عالیہ کے فیصلہ کو بھی قربان کر دیا۔

Hunter (page 68) observes that "the British authorities took the wise revenge of denying even to the most reasonable of them the glory of martyrdom". But is a sad reflection on the British administration of justice that the judgement of even their highest tribunal was not free from subtle political consideration."

انبارہ کی عدالت عالیہ نے پٹنہ کے دہا بی رہنما مولوی احمد اللہ کو پھانسی کی سزا دی تھی لیکن

پٹنہ کی عدالت نے اس فیصلہ کو ترمیم کر ڈالا ساتھ ہی ساتھ مقدمہ کا بھی مذاق اڑایا، بلخی صاحب مرحوم برطانوی قانون شکنی کی کس طرح تنقید کرتے ہیں۔
 پٹنہ کے آخری عظیم وہابی رہنما کو انبالہ کی عدالت نے چند شہادت کی بنا پر سزا دی لیکن پٹنہ کے جج نے آخری قانون شکنی کی جبکہ انبالہ کی عدالت عالیہ نے اپنے آخری فیصلہ میں پھانسی کا فیصلہ صادر کیا لیکن پٹنہ کی عدالت کو اس امر کا مجاز نہیں تھا کہ اپنے فیصلہ کو ترمیم کر کے انہیں کالا پانی بھیجے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"Thus Ahmadullah: the last great
 Wahabi leader of Patna was convicted
 in the Ambala trail. The judge of Patna
 sentenced him to the last penalty of
 law with forfeiture of all his properties.
 But like the final decision in the
 Ambala trail the sentence of death passed
 on Ahmadullah was altered by the
 High Court."

بلخی صاحب مرحوم نے "تحریک وہابیہ اور بہار" میں ایک باب "جامکاد کی ضابطہ" اور
 قبور کی بے حرمتی" رکھا ہے لیکن اس باب کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر نیرط کو اپنی علم و
 حکمت اور تہذیب و تمدن پر بڑا ناز تھا لیکن اپنے اقتدار کے لئے بین انسان سوز مظالم ڈھائے
 تھے جس کو پڑھ کر انسانیت بکا راٹھتی ہے اور ایسے واقعات کی مجموعی طرح بر تاریخ کے صفحات پر
 سیاہ حروف کی لکیر رہ جاتی ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

بلاشبہ یہ اعتراض شدہ حقیقت ہے کہ اہل برطانیہ نے کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے جو انسانیت کے منافی ہیں یعنی جائداد کی ضبطی اور قبور کی بے حرمتی کا سیاہ کارنامہ جو برطانیوں نے انجام دیا۔ ملحق صاحب نے لکھا ہے:

“But the most objectionable and we may say in human part played by the British authorities in connection with the confiscation of properties was the deliberate destruction of the graves of the Wahatis ancestors.”

مولوی عبدالرحیم صادق پوری ایسے کالابانی نے اپنی تصنیف 'تذکرہ صادقہ' میں اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ ملحق صاحب مرحوم نے تذکرہ صادقہ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے:

Abdurrahim in the memories (Page 144)

describes the site of Sadiquepur's house as he saw after his return from the Andaman as follows.

“In the morning I went to Sadiquepur. There I saw that our houses had been demolished and turn into levelled ground and bazar and municipal buildings had been erected over them.” Then I wanted

to visit the Cemetery where our ancestors had been buried for 14 generations. Particularly I wanted to visit my parents graves to say "Fatihah" (Requiem) and pray for their salvation. But all efforts to locate them were in vain. After thorough search and taxing my memory it appeared that the municipal buildings had been erected over the graves.

اس طویل اقتباس کو پڑھ کر انگریزوں کے بدترین کارناموں کی طرف ذہن رجوع ہوتا ہے خصوصی طور پر انگریزوں کو اپنے مذہب، علم و حکمت اور تہذیب پر بڑا ناز تھا لیکن اقتدار کی ہوس اور نشے میں انہوں نے انسانیت کے منافی کام انجام دیئے۔ اگر انہیں دنیا کی بدترین قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ان وہابیوں کی نہ صرف جائدادوں کی ضبطی کی بلکہ ان کے آباد اجداد کی قبروں کی بھی بے حرمتی کی جو چودہ پشتوں سے اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوتے آرہے تھے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنے گرانقدر مقالہ میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اس غیر مطبوعہ تصنیف سے کئی حضرات استفادہ کر چکے ہیں، بہار کے مشہور و معروف مورخ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب "تحریک بہار اور آزادی" (Freedom movement in Bihar) کی ترتیب میں اس کتاب "تحریک وہابیہ اور بہار" (Wahabi movement in Bihar) سے کافی مستفیض ہوئے ہیں۔ چنانچہ کے۔ کے دت صاحب اپنی کتاب کے دیباچہ میں یوں لکھتے ہیں:

"I am indebted to Sri F. Balkhi for the

لے ملاحظہ فرمایا۔ "تحریک آزادی اور بہار" (Freedom movement in Bihar) مصنفہ ڈاکٹر کے۔ کے دت صاحب

trouble he has taken in supplying me with information of certain sources."

فیض الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تحریک وہابیہ اور بہار" باب اول بعنوان تحریک وہابیہ (حضرت سید احمد بریلوی کا مسلک) The Wahabi creed کا آغاز یوں کیا ہے۔

The movement was originally started by Syed Ahmad of Rai Barailly with the object of introducing certain social and religious reforms among the Muslims of India.

But in the political circumstances of the time it developed and transformed itself into a religio-political creed which aimed at the destruction of the British power in India.

ڈاکٹر کے کے دتا اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" کے باب سوم میں تحریک وہابیہ اور بہار کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

The movement was originally started by Syed Ahmad of Rai Barailly with the object of introducing certain social and religious reforms of Muslims of India. But in the political circumstances of the time it developed and assumed a religious political character at the destruction of the British power in India.

میں نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ انبالہ کی عدالت عالیہ نے پٹنہ کے وہابی رہنما مولوی احمد اللہ کو پچاسی کی سزا دی تھی لیکن پٹنہ کی عدالت نے اس فیصلہ کو ترمیم کر ڈالا۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اس فیصلہ کی تبدیلی پر سخت نکتہ چینی کی ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

Thus Ahmadullah the last great Wahabi leader of Patna was convicted in the Ambala trail. The judge of Patna sentenced him to the last penalty of law with forfeitures of all his properties. But like the final decision in the Ambala trail, the sentence of death passed on Ahmadullah was altered by the High Court.

چنانچہ ڈاکٹر کے دتا نے بلخی صاحب مرحوم کی اس انگریزی عبارت کی ہو بہو نقل اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" (Freedom movement in Bihar) میں پیش کی ہے۔ دتا صاحب یوں لکھتے ہیں۔

"Thus Ahmadullah the last great Wahabi leader of Patna was convicted mainly on the evidence of the convict in the Ambala trail. The judge of Patna sentenced him to the last penalty of law with forfeitures of all his properties. But like the final decision in the

Ambala trail the sentence of death passed on Ahmadullah was altered by the High Court." ڈاکٹر کے۔ کے دتتا نے اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" حصہ اول کے تیسرے باب میں جہاں انہوں نے تحریک وہاں بیاد بہار کا جائزہ لیا ہے وہاں انہوں نے اس باب میں سر جہاں پریش کی ہیں۔

- (۱) حضرت سید احمد بریلوی کا مسلک
- (۲) صوبہ بہار و بنگال میں تحریک وہاں بیہ کی ترویج و ترقی
- (۳) مولوی ولایت علی اور مولوی غلامت علی بحیثیت سربراہ
- (۴) ۱۸۵۰ء میں تحریک کا احیاء اور قلعہ دہلی کے اندر تبلیغ
- (۵) ۱۸۵۷ء میں وہابی رہنماؤں کی گرفتاری
- (۶) سر حد پر برطانوی لشکر کی یورش
- (۷) مولوی عبداللہ کا منصب امارت حاصل کرنا
- (۸) انبالہ کی عدالتی تحقیقات
- (۹) پٹنہ کی عدالتی تحقیقات
- (۱۰) جائیدادوں کی ضبطی اور قبور کی بے حرمتی اور بربادی
- (۱۱) امیر خاں اور حشمت داد خاں کی گرفتاری اور سزا
- (۱۲) ۱۸۸۴ء میں باقی ماندہ لوگوں کی رہائی۔

مذکورہ مثالوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کے کے دتتا نے اپنی تصنیف کی ترتیب میں بلخی صاحب مرحوم کی اس غیر مطبوعہ تصنیف سے کسی قدر استفادہ کیا ہے نیز جہاں پریش نے بلخی صاحب کی عبارت کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنے مقالہ "فصح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات" میں یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے بھی اس غیر مطبوعہ تصنیف سے استفادہ کیا ہے چنانچہ قیام الدین صاحب نے

اپنی تصنیف "ہندوستان میں تحریک وہابیہ" کے دیباچہ میں یوں لکھا ہے:

"The late Fasihuddin Balkhi Sahab of the Persian manuscript section of the Patna University Library was also a valuable source of help."

ڈاکٹر قیام الدین احمد کی تصنیف "تحریک وہابیہ اور ہندوستان" دس ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب کی سرخیاں یہ ہیں:

- (۱) تحریک وہابیہ کے اصول اور اغراض و مقاصد
- (۲) حضرت سید احمد بریلوی کے حالات زندگی اور مسلک
- (۳) جنگ بالاکوٹ اور تحریک فرازی
- (۴) مولوی ولایت علی اور عنایت علی بحیثیت سربراہ
- (۵) تحریک وہابیہ کی خفیہ تنظیم
- (۶) سرحدی تحریک ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۳ء
- (۷) وہابی رہنماؤں کی حکمت عملی اور ۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۹ء کا غدر
- (۸) وہابی رہنماؤں پر ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۵ء کے دوران مقدمہ اور عدالتی تحقیقات
- (۹) تحریک وہابیہ کے مختلف ادوار
- (۱۰) بعدہ تحریک وہابیہ کے نتائج

انبالہ تحقیقات کے ضمن میں ڈاکٹر قیام الدین احمد اپنی تصنیف "تحریک وہابیہ اور ہندوستان" میں یوں لکھتے ہیں۔

The preliminary commitment enquiry lasting over a week was held in the court of Tighi by the Deputy Commissioner of Ambala.

The session trial opened in the court of Herbert Edwards the session judge Ambala in April 1884. The session judge was assisted by four assessors, two Hindus and two Muslims. In all eleven persons faced the charge of waging war against the Queen. The prisoners were charged under section 121 of Indian penal code for waging was against the Queen."

راقم نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ حکومت برطانیہ نے ان وہابی رہنماؤں کی جائیدادیں غنیمت کی اور قبو کی بے حرمتی بھی، محلہ سادقپور میں جو آج موجود پٹنہ میونسپل کارپوریشن آفس ہے وہاں ان وہابی رہنماؤں کا آبائی مکان اور خاندانی قبرستان تھا، چنانچہ ڈاکٹر قیام الدین نے بھی اپنی کتاب "تحریک وہابیاں ہندوستان" میں اس پہلو کی نشاندہی کی ہے، قیام الدین احمد صاحب لکھتے ہیں:

Lieutenant Governor also directed the Commission under section 7 of Regulation XIX of 1810 to report how the immovable properties were to be dealt with at the same time he recommended the Government of India that the land and house properties situated within the City be made over to the municipal corporation for the use of City. In reply to this recommendation the Government of India directed that the premises at Sadiquepur where the conspiracy

was carried on to be made over to the municipality with a view to their being raised to the ground and on open market be built on the site to devote a portion for sale."

ڈاکٹر قیام صاحب نے بلنجی صاحب مرحوم کی اس غیر مطبوعہ تصنیف کی اشاعت سے قبل حد درجہ استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے اپنی کتاب میں ان دہابی رہنماؤں کی ضبط شدہ جائداد کا جو سابق نقشہ پیش کیا ہے وہ دراصل بلنجی صاحب مرحوم کی تصنیف سے اخذ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ بلنجی صاحب مرحوم کی اس تصنیف سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں دہابی رہنماؤں نے کیا کیا قربانیاں پیش کیں۔



باب ششم

فصح الدین ملخی بحیثیت محقق

فصح الدین ملخی مرحوم نے ادبی دنیا میں بحیثیت ایک محقق کیا کارنامے انجام دیئے ہیں وہ کسی سے بلا فریدہ نہیں موصوف بحیثیت محقق ایک نئی روش پر کامزن ہوئے ساتھ ہی ساتھ ان کی تحقیق کا انداز دیگر محققین سے جداگانہ تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فطرت میں تحقیق کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ذیل میں ان کے تحقیقی کارناموں سے بحث کی جاتی ہے۔ ایک محقق کا سب سے اہم یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ تحقیقی امور کے ضمن میں دیگر محققوں کی رہبری اور رہنمائی کرے چنانچہ ملخی صاحب مرحوم تحقیق کے سلسلہ میں ہمیشہ دوسرے محققوں کے تحقیقی کاموں میں رہنمائی کرتے۔ ڈاکٹر اختر اورینٹی مرہوم نے اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان ”فصح الدین ملخی کے متعلق میرے تاثرات میں اس امر کی نشاندہی کی ہے انہوں نے لکھا ہے۔

”حضرت ملخی مورخ، محقق اور جامع الحقائق تھے، وہ صرف میر تحقیق نہ تھے بلکہ شیخ دستگیر بھی تھے، نہ جانے کتنوں نے ان سے فیض پایا۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا کے سلسلہ میں حضرت ملخی سے مجھے بھی ارادت رہی ہے، حضرت ملخی نے ہمیشہ بڑی کشادہ دلی سے میری مدد کی ہے، میں نے حضرت ملخی کی کتاب ”تاریخ گدھ“ کے علاوہ ان سے براہ راست بھی استفادہ کیا ہے۔ حضرت آیت اللہ جوہری پبلواروی کی مثنوی ”مثنوی گوہری“ جوہری کا کانسوز پر دفیہ حسن عسکری کی تلاش و جستجو کا حامل ہے تو جوہری کی تصویر حضرت ملخی کے اکشاف کی دلیل ہے۔“

چنانچہ اختر صاحب نے اپنی تصنیف ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ میں ملخی صاحب مرحوم کو

بطور تحفہ پیش کیا ہے اس میں بھی موصوف نے اپنے دستِ خاص سے یہ جملہ لکھا ہے۔

”اعترافِ معاونت کے طور پر مدیہ پر خلوص منجانبِ اختر اور بنوی“

پروفیسر سید علی حیدر نے اپنے مقالہ ”فیض الدین بلخی کی شخصیت اور علمیت“ میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنا یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

”ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں میر سوز پر اپنے تحقیقی مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ میں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں گیا، وہاں پہلی بار فیض الدین بلخی مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ اندون شعبہ مخطوطات کے انچارج تھے، آپ بے حد شفقت و محبت سے پیش آئے۔ میر سوز کے کلام کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ جو اس شعبہ کی ملک ہے..... علاوہ بریں ایک قدیم انتخاب کلام شعراً اردو سے بھی مطلع فرمایا جس میں میر سوز کے کلام کا انتخاب تھا اور مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔“

بلخی صاحب مرحوم نے بہار کے تمام نوجوان محققین کی کڑی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ جن نوجوان محققین نے تحقیقی مقالہ پر قلم کئے وہ بھی حضرت بلخی مرحوم کی ذات سے مستفیض ہوئے، ڈاکٹر مظفر اقبال نے اس امر کی مزید وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

”بلخی صاحب نے صوبہ بہار کے تمام نوجوان محققین کی رہنمائی کی ہے اور ایک طرح سے اس فن میں انہیں تربیت دیتے۔ اس لحاظ سے بلاشبہ ان کی بڑی اہمیت ہے۔ صوبہ بہار میں اس وقت کئی بلند پایہ محقق موجود ہیں جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں لیکن حق یہ ہے کہ بلخی صاحب جس شفقت اور لگن سے نوجوانوں کی رہنمائی کرتے تھے وہ ان کی ذات پر ختم ہو گئی۔“

ڈاکٹر خواجہ افضل امام اپنے مقالہ بعنوان ”بلخی صاحب مرحوم اور پٹنہ یونیورسٹی“ میں رقم طراز ہیں کہ بلخی صاحب نے اپنی پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ہر ریسرچ اسکالر کی رہنمائی کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے بھی ریسرچ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں خواہ وہ اردو فارسی یا تاریخ کے ہوں وہ تمام ریسرچ اسکالرز بلخی صاحب مرحوم کے مرہونِ منت ہیں۔

موصوف یوں لکھتے ہیں:

”جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو، فارسی یا تاریخ میں ریسرچ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلاشبہ بلخی صاحب مرحوم کے مرمون منت ہیں۔ خوش نصیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کر لیا، جو بچ گئے وہ اب تک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں۔ مرحوم کا تعلق جتنا اردو، فارسی و عربی سے تھا اس سے کسی طرح کم تاریخ سے نہ تھا..... تاریخ کے طلبہ بھی ان سے فیضیاب ہوتے تھے، ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ڈاکٹر قیام الدین احمد، برہم پور پشاد انبشٹ اور لکھنوی کانت چودھری کر سکتے ہیں۔“

مندرجہ بالا شہادت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کے جہان تک محقق ہونے کا سوال ہے۔ ان میں یہ خوبیاں موجود تھیں کہ وہ تحقیقی امور کے ضمن میں ہمیشہ فراخ دلی سے دیگر محققین کی حوصلہ افزائی نیز رہنمائی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کا تحقیقی مقالہ ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک“ ڈاکٹر سید صد الدین کا مقالہ ”شاہ آیت اللہ جوہری اور ان کی مثنوی“ ڈاکٹر سید محمد حسین کا مقالہ ”مرزا محمد علی فدوی“ ڈاکٹر مطیع الرحمن کا مقالہ ”راسخ کے دو شاگرد محسن اور فرحت“ وغیرہ۔ مثالیں کہاں تک دی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبہ اردو ٹی۔ ان۔ بی کالج بھاگلپور اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ صوبہ بہار میں جو تحقیق کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ان میں بلخی صاحب کی ذات مقدم ہے، یہاں تک کہ بعض تحقیقی مقالوں کی ترتیب و تدوین میں بلخی صاحب مرحوم کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس طرف چند برسوں میں صوبہ بہار میں تحقیق کا جو غیر معمولی ذوق و شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ان میں بلخی صاحب کا بھی ہاتھ ہے تحقیق کرنے والے اپنی انہیں دیکھ کر بلخی صاحب کے پاس حاضر ہوتے اور وہ بڑی آسانی سے ان کی مشکلوں کو حل کر دیتے۔ بعض حضرات کے مقالے کی ترتیب و تدوین کا کام بلخی صاحب نے انجام دیا ہے لیکن افسوس ہے یہ حضرات مرحوم کی بے لوث خدمت کا اعتراف تک نہیں کرتے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں میں ان کی تصنیفات اور ان کے مضامین خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں نیز ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات بھی خصوصی طور پر اہمیت کی حامل ہیں، ان کی مطبوعہ تصنیفات میں تذکرہ نسوان ہند اور تذکرہ ہندو شعرائے بہار ہیں۔ ان دونوں تصنیفات کی حیثیت ایک تذکرہ کی ہے۔ ایک تذکرہ لنگار اس وقت تک اپنے فن میں کامیاب نہ ہو گا جب تک کہ وہ پختہ شعور نہ رکھے۔ تحقیق کے سلسلہ میں وہ سنی یا سنی باتوں پر عمل نہ کرے۔ تحقیقی امور میں اگر کسی محقق سے کوئی لغزش سرزد ہو تو اس کی تصحیح کر لے۔ ایک محقق کے لئے اشد ضروری ہے کہ اگر کوئی نیا انکشاف ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ قلمبند کرے۔ اگر کوئی محقق سے تحقیق کے سلسلہ میں کوئی غلط بیانی ہو تو اس کی ادبی حیثیت پر حملہ نہ کرے بلکہ اس کی ادبی اہمیت کا احترام کرے۔

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں کا سطور ذیل میں جائزہ لیتے ہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم تحقیق کے سلسلہ میں کوئی بھی انکشاف کو ہمیشہ مد نظر رکھتے تھے یہاں تک کہ تصنیف کی ترتیب و تدوین کے بعد بھی یعنی مطبع (Press) میں جانے کے بعد بھی کسی تحقیقی واقعیت کو بلخی صاحب مرحوم اپنی تصنیف کے مقدمہ میں درج کر دیتے تھے اس کی مثال دکن کی مشہور شاعرہ چندا ملقا سے پیش کی جاتی ہے، چندا کے دیوان کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

”دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہوئی۔“

چنانچہ جب بلخی صاحب مرحوم کی نظر سے چندا کا دیوان گذرا تو انہوں نے اس کا ذکر کتاب کے مقدمہ میں کیا۔ بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

”راقم نے صفحہ ۲۰ میں دوسرے تذکروں کے حوالے سے لکھ دیا ہے کہ چندا ملقا کا دیوان لندن میں ہے اور صفحہ ۲۳ میں لکھ دیا ہے کہ دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہوئی لیکن ابھی ایک ہفتہ ہوا اس کے دیوان کا ایک نسخہ ۱۲۸۸ء کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ

حیدر آباد میں راقم کی نظر سے گذرا۔“

تذکرہ نسوان ہند کے متعلق پروفیسر منظر اقبال کا یہ خیال ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد بلخی صاحب مرحوم ایک نکتہ رس اور شرف نگاہ محقق کی حیثیت سے مشہور ہوئے، موصوف لکھتے ہیں:

”تذکرہ نسوان ہند کی اشاعت نے انہیں ایک نکتہ رس اور شرف نگاہ محقق کی حیثیت سے کافی شہرت عطا کی۔“

بلخی صاحب مرحوم اپنی تصنیف تذکرہ نسوان ہند میں جہاں بھی کسی خاتون کے کارناموں کو پیش کیا ہے وہاں انہوں نے تحقیقی امور کو مد نظر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر شہنشاہ بابر کی بیوی اور ہمایوں کی والدہ ماہم بیگم کے تذکرہ سے اس کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس بیگم نے دہلی کے پرانے قلعہ کے پاس ایک مدرسہ اور مسجد ۹۶۹ھ میں تعمیر کرائی تھی چنانچہ صاحب تصنیف نے اپنی تحقیق کو تقویت پہنچانے کے لئے مسجد کے کتبہ کی نقل بھی پیش کی ہے۔ اس کتبہ پر اشعار کندہ ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

بد وراں حلال الدین محمد	کہ باشد اکبر شاہان عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی	بنا کرد این بنا بہر فاضل
ولے شد ساعی این بقعہ خیر	شہاب الدین چھٹان باذل
نہے خیریت این بقعہ خیر	کہ شد تاریخ او خیر المنازل

۹۶۹ھ

لفظ خیر المنازل مصرعہ کا مادہ تاریخ ہے۔

دہلی کی مشہور خاتون فخر النساء بیگم جو نواب شجاعت علی خاں کی حرم خاص تھی اس خاتون نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی یادگار میں ایک مسجد کشمیری ہوا ازہ دہلی کے قریب تعمیر کرائی تھی جو اس کے نام سے فخر المساجد کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ فاضل محقق نے اپنی تصنیف میں اس مسجد کے کتبہ کی بھی نقل پیش کی ہے۔

خاں دیں پرور شجاعت خاں بخت یافت جا
بارضائے حق تعالیٰ از طفیلِ مرتضیٰ

صد خاتوناں کنیز فاطمہ بخش جہاں

یادگارش ساخت این مسجد بفضل مصطفیٰ

فیض الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسواں ہند" میں کسی خاتون کے سنہ وفات کے ضمن میں اس قطعہ تاریخ کو بھی پیش کیا ہے تاکہ ان کی تحقیق کو مزید تقویت پہنچ سکے۔

صوبہ بہار کی مشہور نیر خاتون بی بی صغریٰ جواہر فیوض و برکات میں مشہور تھیں نیز انہوں نے اپنی کافی جائیداد اہل حاجت کے لئے وقف کر دی تھی اس خاتون نے ۱۹۰۹ء میں وصال کیا چنانچہ بلخی صاحب نے ان کی تاریخ وفات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قطعہ تاریخ کا بھی سہارا لیا ہے تاکہ ان کی تحقیق صحیح اور درست ثابت ہو۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

رفت صغریٰ بباغ خلد از دہر
از سرو پائے حزن ہاتھ گفت

حسنہ بعد مریم و زہرا
سال رحلت فیما مت صغریٰ

۱۹۰۹ء

بیگم عابدہ جو نواب یوسف علی خان دانی ریاست رام پور کی دختر اور نواب لہین العابدین خان بہادر فوجدار راج سوامی ریاست جے پور کی محل خاص تھیں۔ یہ خاتون فن شاعری میں بہارت رکھتی تھیں چنانچہ اس بیگم کی وفات کا تاریخ کے سلسلہ میں فاضل مکتون نے قطعہ تاریخ کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے یہ قطعہ تاریخ میر محمد جویا نے اس بیگم کے ایک مصرعہ سے روکالی تھی۔ تاریخ وفات یہ ہے۔

یہ کرامت اس کی ہے جیسا کہ خود فرما دیا
تہا قیامت رحمت خلاق باری قبر کو

گشتہ ہیں لے لاغری ہم رنگ گندم گوں جو
ہے شکن گندم کی بس کافی ہماری قبر کو

۱۲ ۸۶

فیض الدین بلخی مرحوم کسی تحقیق طلب عاملہ میں مزید طوالت میں جانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے بلکہ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس نکتہ کو چند سطور میں ادا کر دیتے رہے چنانچہ اس کی مثال تذکرہ نسواں ہند سے بھی دی جاسکتی ہے۔

شہنشاہ اوزنگ زیب (عالمگیر) کی دختر زیب النساء محفّی اپنی شاعری میں یکتائے زمانہ

تھی۔ تصوف سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور اس کی طبیعت میں مذہبی رجحان بھی تھا، 'زیب النساء' صاحب دیوان شاعرہ بھی تھی لیکن ایک تذکرہ نگار مولف اختر تاباں نے اپنے تذکرہ میں یہ لکھ دیا کہ یہ صاحب دیوان نہ تھی، چنانچہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان مخفی کے نام سے جو دیوان مشہور ہے وہ کسی اور شاعر یا شاعرہ کا کلام ہے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اس غور طلب تحقیقی مسئلہ کو زیب النساء مخفی کا یہ شعر کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

"زیب النساء کے یہی خیالات اور اس دیوان کے اشعار کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ یہ دیوان

اس کی تصنیف ہے اور ذیل کے شعر سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے، شریہ ہے۔

دختر شام و لیکن او بفقر آدرہ ام زیب و زینت بس معینم نام من زیب النساء است
بہر کیف اب تک کوئی نہ بتا سکا کہ اگر یہ دیوان اس کا نہیں تو کس کا کلام ہے۔ آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے اس شہادت کو مزید یوں پیش کیا ہے۔

"لوگوں نے بہت سے لطیفے اور ہزلیات اس کی طرف منسوب کئے ہیں لیکن اس کے کلام کی پاکیزگی کو دیکھ کر یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ تمام لطیفے اور ہزلیات لوگوں کی من گڑھت ہیں۔" فیض الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسواں ہند" میں بعض ادبی مسائل کے ضمن میں غیر تحقیقی امور کا بالکل پردہ چاک کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر نور جہاں بیگم جو شہنشاہ جہانگیر کی بیگم تھی شاعری میں مہارت رکھتی تھی اور اس کا تخلص مخفی تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اردو اشعار بھی اس شاعرہ کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ چنانچہ فاضل محقق ان غلطیوں کو کس طرح بے نقاب کرتا ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے کچھ اردو اشعار بھی اس بیگم کی طرف منسوب کر دیئے ہیں.....

اشعار کی زبان خود بتاتی ہے کہ ایسی سلیس زبان جہانگیر کے وقت میں نہیں بولی جاتی تھی۔

جن لوگوں کو اردو زبان کی ارتقائی تاریخ سے واقفیت ہے وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اشعار

نور جہاں بیگم کے نہیں ہو سکتے۔"

ملاحظہ ہو۔ کل تم جو یہ کہتے تھے شمشیر ہے اور میں ہوں

یہ طشت ہے اور سر ہے تقصیر بہادر میں ہوں

ظاہر ہے مرے حال کو سرسبز نہ جانو
پوشید جگر رکھتی ہوں مانند خا کے
جسم میں ہے یہ ہستی ہے جو بوٹی
نگہ کے بوجھ سے جاتی ہے بوٹی

عام طور پر کوئی محقق اپنی تصنیف میں تحقیق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ماخذوں کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر اکتفا کرتا ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تحقیق میں ایک نئی روش اختیار کی ہے جہاں کے علاوہ کسی دیگر محقق میں ہم ایسی باتیں بہت ہی کم پاتے ہیں۔ انہوں نے کسی واقعہ کی چھان بین کے بعد اپنی ذاتی رائے پیش کی ہے اس کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ بلقیس میگم جو تصویر مخلص اختیار کرتی تھی یہ شاعرہ عشقی عظیم آبادی کی زوجہ تھی۔ چنانچہ مولوی عباس مؤلف ”مشاہیر نسواں“ نے آخر کتابوں کے حوالے لکھا ہے کہ جب ایک دن اپنے طفل شیرخوار بچہ کو گود میں لئے رہتی کہ عشقی نے دیکھ کر یہ مصرع کہا ہے

دیدم بدوش آن ہمہ طفلے پری نرادرے

تصویر نے اس وقت دوسرا مصرع کہا ہے

چوں مصرعہ کہ باشد پیوند مستزادرے

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اس تحقیقی پہلو کو چھان بین کرنے کے بعد اپنی رائے لکھی ہے:

”حال میں راقم نے عند المذکرہ مشہور و معروف ادیب و محقق قاضی عبدالودود بیرشر

سے اس کا ذکر کیا تھا انہوں نے کہا کہ عشقی نے اپنے تذکرہ میں کسی شاعرہ کا ذکر نہیں کیا

ہے اور ان دونوں مصرعوں سے جو مطلع مرثب ہوتا ہے وہ عشقی کے کلام میں موجود ہے

بہر کیف تذکرہ عشقی میں شاعرات کا ذکر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں گلستان سخن میں

مرزا صابر دہلوی نے اپنی بیوی کا جو مخفی تخلص کرتی تھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف ”تذکرہ نسواں ہند“ کی ترتیب میں لگ بھگ پینتیس^{۲۵} مطبوعہ قلمی کتابوں کا حوالہ دیا ہے چنانچہ کافی عرق ریزی کے بعد یہ کتاب ترتیب پائی۔

بلخی صاحب مرحوم کی دوسری تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے یہ ایک خالص تذکرہ ہے۔ یہی یہ دیکھنا ہے کہ اس تذکرہ میں صاحب تصنیف نے کس حد تک تحقیق کا سہارا لیا ہے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف کافی محنت کے بعد لکھی گئی ہے چنانچہ اس تصنیف کی ابتدا سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔
 نند لال گویا صوبہ بہار کے متقدمین فارسی شعرا میں تھے یہ سکھوں کے مقدس آخری گرو گرو گوبند سنگھ کے رفیقوں میں سے تھے اس قرب کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے نانک شاہی اختیار کر لیا تھا لیکن ان کا کلام نایاب تھا لیکن بلخی صاحب نے اول ان کے کلام کو منظر عام پر لایا، بلخی صاحب نے گویا کے متعلق یوں لکھا ہے۔

"نند لال گویا کے کچھ حالات پنجابی زبان میں کتابی صورت میں طبع ہوئے تھے غالباً امرتسر میں دستیاب ہو سکتے ہیں گویا کا دیوان نایاب تھا لیکن حسن اتفاق سے ایک دوست نے مجھے لا کر دیا۔ اس کے آخر میں کاتب نے گویا کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔ اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے گویا کے قلمی دیوان کی نقل پیش کی ہے اور ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔"

کے بحال غریبان نارسا نرسد رسیدہ ایم بجائے کہ پارسا نرسد
 طبیب عشق چنین گفتہ است بحال درد غریباں بجز خدا نرسد

سدن مردک دیدہ در یاد دیدم بہر طرف کہ نظر کردم آشنا دیدم
 بگرد کعبہ و بتخانہ ہر دو گریہ دیدم و گریہ فتم آنجا میں ترا دیدم
 بہر سوئے کہ نظر کردم از روہ تحقیق میان خانہ دل خانہ خدا دیدم
 مرا ز روز انل آمد این ندا گویا کہ انتہا جہاں را در ابتدا دیدم

از دوست غیر دوست تمنا نمی کنیم باد سرخوشیم وداوا نمی کنیم
 بیمار ز گسم کہ در گس غلام دوست ما چشم را بروئے کسے و انمی کنیم

ہر جا کہ عیدہ ایم جمال تو دیدہ ایم ماجز جمال دوست تماشا نمی کنیم
 گویا خوش باش کہ سودائے عشق یار تا میں سہاست از سر خود دانی کنیم
 بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف ”تذکرہ ہندو شعرائے بہار“ میں کسی بھی شاعر کے حالات
 قلمبند کرنے کے سلسلہ میں کافی چھان بین کی ہے۔ عام طور پر کوئی محقق اپنی تحریر میں حوالوں کو ہمیشہ
 مد نظر رکھتا ہے تاکہ اس کی تحقیق کو تقویت پہنچ سکے۔ اگر کسی محقق نے مزید چھان بھی نہ کی تو ایسا
 بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے فن میں لغزش ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک بلخی صاحب مرحوم کی تحقیق کا سوال
 ہے انہوں نے کسی بھی تحقیقی مسئلے کی مزید چھان بین کی ہے اس کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے اس کی
 اجاگر چند الفت کی شاعری سے متعلق ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے الفت کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

”الفت تخلص اور اجاگر چند نام عظیم آباد کے متقدمین ہندو شعرا میں امتیازی حیثیت
 رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ الشایردازی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، آغا حسین
 عاشق مولف تذکرہ نشر عشق ہند اپنی خوشگو مولفہ سفینہ خوشگوار ڈاکٹر عبداللہ ادبیات
 فارسی میں ہندوؤں کا حصہ اور مولوی عزیز الدین بلخی مولف تاریخ شعرائے بہار نے ان کا ذکر
 کیا ہے اور پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے رسالہ معاصر ۳ بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں
 الفت پر ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کو انہوں نے انشا غریب کا نادر نسخہ دریافت کرنے
 کے بعد لکھا ہے۔ اس مقالہ کی بدولت الفت کی ایک اردو غزل منظر عام پر آگئی۔۔۔۔۔
 عسکری صاحب نے ریختہ میں الفت کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔“

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے عسکری صاحب کے مقالہ کا حوالہ دیکر صرف اکتفا نہیں کیا بلکہ ذاتی
 طور پر فلمی دیوان الفت کا معائنہ کیا ہے نیز فاضل مضمون نگار (عسکری صاحب) سے مل کر مزید چھان
 بین کی ہے۔ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

”انشا غریب کا واحد نسخہ جس میں دیوان الفت بھی شامل ہے، کے پی۔ جیوال
 ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ملک ہے، راقم نے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ اس میں ریختہ کے چندہ
 اشعار اور مخزن الدولہ کے نام الفت کے خطا کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ میں نے عسکری صاحب سے

اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے وہ اشعار خط اب اس نسخہ میں موجود نہیں،
واقعہ یہ ہے کہ یہ نسخہ فروخت ہونے کے لئے آیا تھا یہ دونوں چیزیں موجود تھیں میں نے نقل کرنی
تھی بعد میں یا تو فروخت کرنے والے نے وہ اوراق نکال لئے یا جعل سازی کے وقت وہ اوراق
خستہ حال اور بیکار سمجھ کر ضائع کر دیئے گئے۔“

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کسی قدر تحقیق کے ضمن میں چھان بین کرتے
تھے اس کے بعد انہیں جو نتیجہ برآمد ہوا تھا اس کو تحریر میں لاتے تھے، آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے
دیوان الفت کے متعلق یوں لکھا ہے۔

”دیوان الفت ۱۳۸ صفحات پر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے بہت طرزیں کاتب نے

نامام چھوڑ دی ہیں اور اکثر اوراق آتش زدہ ہیں اول صفحہ پر یہ عبارت ہے۔

”دیوان منشی اجاگر چند الفت سکنہ باشی تخلص بہ الفت این لالہ مہا بلخی سورگ باشی

جد مادی تخلص مذطلہ امالی۔“

اس کے بعد فاضل محقق نے الفت کے فارسی اور نہختہ کے نمونہ کلام کو پیش کیا ہے:

نمونہ کلام :- الفت نے جو غزل شیخ علی حزیں کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی اس کو بطور

نمونہ کلام پیش کرنا مناسب ہوتا ہے اس میں حزیں کی شاگردی کا بھی اعتراف ہے۔

کہ دشمن در بغل ہچوں دل خود در کیس دارم
نظر از بسکہ ہر زنجیر زلف تنہا دارم
ز بس در دل خیال قامت آن نازنین دارم
بسان نقش پا در کوئے او سر بہ زمیں دارم
نہ چہو کا کل اد عقدہ در خاطر زکیں دارم
کہ اسم آن صنم نام خدا نقش نگین دارم
دل دیدار نہ اک چشم وحشت آفرین دارم
ز راہ کو چہ آن شوخ گردے بر جبین دارم

من از در جدائی خاطر اندوگین دارم
تسلل تا ابد تار سر شکم را شود لازم
بجائے ناز آم در سینہ سرو ناز می روید
بخاک افتادہ چوں من ز عالم بر نمی خیزد
دل از بسگی بافتہ تہمت در گره دارد
بہ ہفت اقلیم گرد نام کفر عشق او روشن
بدام آوردنش و یاروین آسان نمی باشد
مباد ایل اشک دیدہ از سر بگذرد یارب

بفوج غمزہ غار مگر نگارے گشتہ مہانم
چہ سازم نذر لویا رب نہ دل عام نہیں دارم
ز سونگر تہ ہجران خسار ش چہ می پرسی
صد آتش پارہ لخت جگر دہستیں دارم
تراز دنگتہ ہائے آبدار از خامہ ام الفت
کہ ہر ساعت نظر بر فین استاد حزیں دارم

نمونہ کلام ریختہ

ریختہ میں الفت کی ایک غزل ہی دستیاب ہوئی ہے جس کو مسکری صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا تھا وہی اس جگہ نقل کی جاتی ہے۔

خلوت نشین غم کو تماشا میں کام کیا
مخمر جام عشق کو صہبا میں کام کیا
دیوانہ محبت بے اختیار کون
تکلیف جان محبت دانا میں کام کیا
مست مئے الست کہ ہے تشنہ دگر
جام شراب کہنہ و مینا میں کام کیا
آباد باد ملک قناعت و مردی
دیرانہ خرابی دنیا میں کام کیا
جس کو ہے زور ہمت باز دے مردی
ارث پدر و خانہ بابا میں کام کیا
آزما کہ ہست قفل خموشی بہ باب لب
چون و چرلے... گویا میں کام کیا
صاحب سخن سوں صحبت جاہل....
پروردہ آفتاب محبت کو روز حشر
سک.... دگوہر یکتا میں کام کیا
جس کو ہے دلغ سینہ و آتش تمام دل
بلغ نعیم و سایہ طوبی میں کام کیا
لینا متلع دل کا کف اختیار سوں
سیر گل و تفریح لالہ میں کام کیا
جس کو تپ جلدائی ہی کامرض دل میں ہے
سودائے عشق دے سر شمایں کام کیا
ترک وجود درس محبت کا ابتدا
ناز طیب و تاب عدا میں کام کیا
جلے کہ بوریائے نشیناں قدم نہند
بے مسئلہ بہ صحبت ملا میں کام کیا
حاکم سادارنس.... شاہ ملک دل
فرش کور و بستر دیبا میں کام کیا
یارب غریب ملک معافی کو رہ نما
ملک شہ سکندرو دارا میں کام کیا
شکل مہیب صورت زیبا میں کام کیا

انشاد غریب اور دیوان الفت میں دو ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جن کو بظاہر الفت سے تعلق نہیں،

انشا غریب کے صفحہ اول پر رزنا جلیل الدین محمد کی لکھی ہوئی ایک رسید مبلغ پچیس روپیہ کی ایک انگریز حاکم کے نام سے ہے جس میں ۳۱ جنوری ۱۸۲۱ء تاریخ بھی درج ہے اور دیوان کے ایک صفحہ پر سمجھوتہ رفعتی شاگرد اکتفی کا کہا ہوا ایک قطعہ تاریخ ہے۔

راجہ رام نرائن موزوں کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”مہاراجہ رام نرائن نائب ناظم صوبہ بہار فارسی کے صاحب دیوان اور خوشگو شاعر تھے“ شیخ علی حزیں متوفی ۱۲۸۰ھ کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان ۴۴۴ صفحوں پر محیط ہے، راقم کی نظر سے گذرا ہے اس کے علاوہ ان کے خطوں کا ایک مجموعہ موسوم بہ دستوہ الانشا بھی ان کے وارث رائے منہا پر شاد کے پاس ہے جس میں سیکڑوں مکتوبات ہیں جو اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں یہ بھی راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ سفینہ خوشگو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ان کی سیاسی زندگی اور عہد حکومت کا صوبہ بہار کے تمام تاریخوں میں بھی ان کا ذکر ہے۔

مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کی شخصیت کے بارے میں بلخی صاحب مرحوم نے اپنی یوں تحقیقی روشنی ڈالی ہے :

”کلیان سنگھ اپنے باپ کی طرح شعرا اور ادیبوں کے قدرداں ہونے کے علاوہ بذات خود تواریخ شاعری اور ادب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مثنوی زیبا، حبیب اسیر، مدح المہ اطہار اور اس کے علاوہ خلاصۃ التواریخ اور واردات قاضی یادگار چھوڑیں، یہ سب کتابیں فارسی میں ہیں، تاریخی کتب انہوں نے مسٹر براہم والیڈ کی فرمائش سے لکھی تھیں، ان کتابوں کو انہوں نے ۱۲۲۷ھ میں تمام کیا، اس وقت ان کی بھارت بھی جاتی رہی تھی..... خلاصۃ التواریخ کا انگریزی ترجمہ نواب سر فزاز حسین خاں مرحوم نے کیا تھا۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے مزید چھان بین کے بعد اپنی تصنیف ”تذکرہ ہندو شعرائے بہار“ ترتیب دی۔

فیض الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں میں ان کی غیر مطبوعہ تصنیف آثار قدیمہ کی ایک اہمیت ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنی تصنیف ”تاریخ مگدھ“ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ اس تصنیف میں ہیں عملات

مساجد اور قبور کے کتبات کی نقلیں ملتی ہیں، یہ کتبات انہوں نے بہت جانفشانی اور چھان بین کے بعد حاصل کیا تھا اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ وہ تحقیق میں فیلڈ ورک (Field Work) کو بہت ہی مقدم سمجھتے تھے، اپنے تحقیقی کارناموں کے سلسلے میں جس مقام کا انہوں نے سفر کیا وہاں کی نادر عمارات، مساجد اور قبور کے کتبات کی نقلوں کو حاصل کر لیتے تھے، اس ضمن میں جناب عبدالرؤف اورنگ آبادی مرحوم نے اپنے مقالہ ”فصیح الدین بلخی مرحوم کی عظیم شخصیت“ میں یوں لکھا ہے۔

”مرحوم کا اہم اور نمایاں کارنامہ اثری انکشافات اور تحقیقات ہے، صوبہ کے بیشتر تاریخی مقامات کے آثار قدیمہ کے کتبات انہوں نے نقل کئے اور بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے انہوں نے نقل کئے ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت دریافت کر کے ان پر نوٹ بھی لکھا ہے۔“

جناب بدرالدین احمد بدر عظیم آبادی اپنے مقالہ ”مولوی فصیح الدین بلخی“ میں اس امر کی مزید نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”بلخی صاحب مرحوم نے بڑی کد و کاوش کے بعد لگ بھگ نو سو کتبات کی نقلیں حاصل کی تھیں چنانچہ موصوف نے اپنے مقالہ میں ان کتبات کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے بدرالدین بدر عظیم آبادی یوں لکھتے ہیں۔

”اگر ضاویہ بہار جو بلخی صاحب مرحوم نے بڑی کاوش سے لکھی تھی اور جس میں نو سو کتبوں کا نوڈ چھپ کر منظر عام پر آ جائے تو ان کا مقام اور بھی اونچا ہو جائے گا، ضرورت ہے کہ ایک تاریخ داں اور ایک محقق کی حیثیت سے ان کا صحیح مقام لوگوں کو بتلادیا جائے یہ اس وقت مکمل ہو گا جب متعدد آثار قدیمہ سے متعلق ان کے تحقیقی کارنامے لوگوں کے سامنے لائے جائیں۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم نے صوبہ بہار کے آثار قدیمہ کے کتبات سخت تلاش و جستجو کے بعد حاصل کئے ان میں زیادہ تر قصبہ منیر، عظیم آباد اور اس کے مضافات کے علاوہ انہوں نے قصبہ اورنگ آباد اور سہسرام کے آثار قدیمہ کے کتبات حاصل کئے، راقم کو چھان بین کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی ایک خود نوشتہ بیاض دستیاب ہوئی جس میں انہوں نے قصبہ بہار شریف، ضلع مونگیر، شہر بھاگلپور اور ضلع سارن کے مقبرے اور مساجد نیز تاریخی عمارتوں کے کتبات درج ہیں، چنانچہ بلخی صاحب کے عمری تحقیقات اور انکشافات کے

ضمن میں جناب سید عبدالرؤف ندوی اورنگ آبادی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ ”نفع الدین بلخی کی عظیم شخصیت“ میں یوں لکھا ہے۔

عصری تحقیقات کے معلومات پر عبور حاصل کرنے کے لئے ان کو عربی، فارسی، انگریزی، پالی زبان بھی..... ہوئی تھی۔ مضافات اورنگ آباد میں مدن پوستانہ کے پہاڑ کی ایک شاخ اور بگاناں ہے جس پر پودہ کا مندر، تالاب اور حوض وغیرہ بھی ہے مندر کے اندر پالی زبان میں ایک کتبہ پتھر پر کندہ ہے جس میں ریاست دیو کے کچھ تاریخی معلومات ہیں، انہوں نے اس کا معائنہ کیا تو فوراً اس کا چربہ لے لیا اور کسی ماہر زبان پالی مدد سے اس کے معلومات حاصل کر کے ریاست دیو کے ایک مقدمہ دائر کئے گئے ہائی کورٹ پٹنہ اور پریوی کانسل میں اس کو پیش کرایا جس کے سبب انہوں نے موافقت میں دگری حاصل کی تھی۔“

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے آثار قدیمہ کے کتبات کی نقلیں کافی کد کاوش کے بعد حاصل کی تھیں، سطور ذیل میں ان آثار قدیمہ کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ایک محقق کی حیثیت بلخی صاحب مرحوم کا صحیح مقام متعین ہو۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف آثار قدیمہ میں اول قصبہ منیر سے تعلق رکھنے والے کتبات کی نقلوں کو پیش کیا ہے۔ جا بجا ان کتبات پر تاریخی حوالے اور تاریخی روشنی بھی ڈالی ہے، قصبہ منیر کی ایک قدیم ۷۹۸ء کی مسجد کا کتبہ یہ ہے

بجہ اللہ در عہد محبوب	شہہ محمود سلطان مہذب
بہیں مسجد کہ بدبانی اول	خلیل الحق ز اقطاب مقرب
جو حامد خطیر ایوان پیر است	عمارت کرد باز از سر مرتب
ز ہجرت ہفت صہشت و نود بود	بہ عصمت دار بنیادش تولد با

یہ کتبہ قدیم ہونے کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی ایک اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ شہہ محمود سے سلطان محمود کا عہد مراد ہے جس نے ۷۹۶ء میں خواجہ جمال کو جو پور صوبہ بہار کی حکومت دی تھی اس کی اولاد سلاطین شرقیہ کہلائی اور ایک صدی تک صوبہ بہار پر حکومت کرتی رہی، مسجد کے بانی

اول خلیل الحق سے غالباً مخدوم عینی کے بیٹے اور مخدوم شرف الدین کے بھائی مراد ہیں ، حضرت
مخدوم دولت منیری کا وصال ۱۰۱۵ھ میں ہوا ان کی وفات اور مقبرہ کی تعمیر کے کتبوں کی نقلیں
آثار قدیمہ میں یوں ملتی ہیں۔ شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۵ھ

قطب اقطاب زمان قدوہ دیں آں کہ از مہر و مہر اور بودہ
شاہ دولت کہ سوئے عالم قدس چوں ز گیتی بہ سفر در بودہ
سال ہجرش خرد عاقی یافت وارث حال بہ سیر بودہ

۱۰۱۵ھ

مقبرہ کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ

از بہر نثار این بنائے آباد از درج دلم دور تاریخ فساد
اول بشر روضہ احباب و دوم مانند بہشت جادواں امین باد

۱۰۲۵ھ

تصنیف منیر کی ایک مسجد کی نقل ملنی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف میں یوں پیش کی ہے۔
”اس مسجد کے اصل باقی ملا عبدالشکور تھے ۱۰۳۵ھ میں ابراہیم خاں نے اس کو
از سر نو درست کرایا“ یہ مسجد مخدوم دولت کے مقبرہ سے اتر جانب چند گز کے فاصلے
پر ہے اس کے اتر خانقاہ واقع ہے مسجد کی ساخت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں معلوم
ہوتی اس کا صحن راستہ سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر واقع ہے بیچ کے در کے اوپر
سنگ موشی لوح میں یہ کتبہ ہے ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شکر ایزد گو کہ از چو و چرا بردہ ست نام کز سپاس او شود فرخندہ دل شیریں کلام
مولوی عبدالشکور از واصلان حق بگو پیشوائے ماہ دیں، بودہ طریقت ما امام
کرد مسجد را بنائے نیک از صدق و یقین از برائے سجدہ طاعت خدائے پاک نام
مسجد آں مولوی افتادہ بود رستہ عالی کرد ابراہیم خاں الاسر بنالیش انتظام

در زمان شاہ عالمگیر شاہی دیں پناہ
 علوی نسل قریشی آن جان جان بن کبیر
 عادل و کشور کشا فرمانروا سردم دشام
 شد بنا از مولوی اور در جہاں فرخندہ نام
 چوں مرتب شد ز دل پر رسیدم از تاریخ او
 گفت از تاریخ او شد مسجد بیت الحرام

۱۱۰۳ھ

اس کے بعد اس غیر مطبوعہ تصنیف میں لان سے درگاہ شاہ ارزاں تک کی عمارات، مساجد اور قبو
 کے کتبوں کی نقل پیش کی ہے

باقرگنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ

یہ مسجد معمولی قسم کی ہے: بیچ محراب کے اوپر یہ کتبہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مسجد اُسَیْسَ عَلٰی تَقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمِ اِحْقَاقِ اَنْ تَقُوْمَ فِیْہِ

بہرِ رضائے خدا ساختہ خیر النساء
 خامہ زاد چکر د سال بتائش طلب
 مسجد عالی بنا چوں حرم محترم
 ہاتھ آواز داد ثانیہ بیت الحرام

۱۲۵۷ھ

شاہ ارزاں کے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ

رفت قطب زمان بہ آسانی
 سال فوٹش ز فیض ملہم غیب
 بہ ریاض بہشت لورانی
 گفت دل شاہ جنت ارزانی

۱۰۲۸ھ

اس کے بعد نمونہ سے چھ دروازہ تک پختی شرک (انگلش روڈ) کے اطراف کا محل اس کتاب میں
 درج ہے:

دنکے کی امی کی مسجد کا کتبہ ۱۱۹۶ھ

از کرم کریم گوید جیرت

۱۱۹۶ھ

بر رمضان روز جمعہ چوں گلاب
چنین ملہم غیب تاریخ گفت
بنا کرد محراب رب الخلیق
بود مسجد چو بیت العتیق

۱۱۹۶ھ

نور کثرے سے خواجہ کلاں گھاٹ تک
سعید جہاں شاہزادہ محمد کریم کی قبر کا کتبہ
دریغا کرد رحلت شاہزادہ
بہاں سلطان ٹیپو خلد مسکن
محمد باکریم و شاہ ہم کن
بہر چہل و دو زینجائیگہ رفت
دو شنبہ سویم ذیقعدہ رفتہ
مشرف بود از حج و زیارت
ارادت داشت با شاہ جہانگیر
پے تعلیم بیعت ساخت از جاں
بہ پٹنہ بارگاہ عشق منزل
پے سال وصالش گفت شمشاد

گرامی زادہ از سلطان میسور
زنسل دوست ٹالسیگنج معمر
برائے نام آن مرحوم و مغفور
پے سیرارم از مرگ مشہور
بسوئے جنت الفردوس مبرور
بہ دنیا ہم میسر عز موفور
کہ اجیری و چشتی ہست مشہور
بدست خواجہ امجد شاہ مشہور
گرفت از چشم عالم گشت مستور
سعید خلد منزل لامع النور

۱۳۳۳ھ

پچھم دروازہ سے پودب دروازہ تک عمارتوں کا حال
گر سہیل کی چھوٹی مسجد کا کتبہ

غلام محمد حکیم بزرگ
شدہ از سر بانگ تاریخ اد
چوں فرمود تعمیر ایسی سجہ گاہ
بخوبی بنا کرد مسجد براہ

۱۳۱۴ھ

محمدی جان کی مسجد کا کتبہ ۱۳۰۵ھ

أفضل الذكر لا اله الا الله محمد رسول الله

عمر

گشت این خانہ خدایتبار

علی

ابوبکر

زخا عات چند دے مس

عثمان

صالحہ بی بی محمدی جان چوں بیت خدا
با خلوص نیت و صدق و یقین آراستہ این
چوں نباشد این عبادت گاہ خاصانِ اله
منظہر نور خدا و جنت المآد است این
زاہتمام شیخ قاسم با علی دیندار
ہمیشہ مسجد دہلی فلک پیر است این
سال تعمیرش جو شہرت خواست از فکر بلند
شد رقم قصر بدیع مسجد اقصی است این

۱۳۰۵ھ

خواجہ عنبر کی مسجد کا کتبہ ۱۱۰۰ھ

در زمان بادشاہ دیں پناہ
شاہ عالم گیر غازی ذوالکرم
خواجہ عنبر ناظر شالیستہ خان
مسجد نو ساخت چوں بیت الحرم
منظہر الحق سال تاریخ نباش
معدن فیض الہی زد رقم

۱۱۰۰ھ

حسن علی کا دارالعدل ۱۲۲۲ھ

مہندہ لڑاب خزانہ دولہ محمد ورح زماں

آنکہ در نامش حسن را با علی باشد قرآن

ساخت دارالعدل جانیکو بنابر حب داد

در ہزار یکصد و حل دو شمر تاریخ آن

فصیح الدین بلخی کو تاریخ کتبات کو محفوظ رہنے کا برابر خیال رہتا تھا اگر انہیں کسی نادرا اور تاریخی کتبات کے تلف ہونے کا گمان ہوتا تو اس کی حفاظت کے لئے حکومت کے منتظمین سے درخواست کرتے چنانچہ حسن علی کے دارالعدل کا کتبہ انہیں پٹنہ سیٹی کے ایک تھانہ میں نظر آیا جو تھانہ کے احاطہ میں یوں ہی پڑا تھا، بلخی صاحب نے اس کی فوراً نقل حاصل کر کے حکومت بہار کے انسپکٹر جنرل آف پولس سے یہ درخواست کی کہ اس تاریخی کتبہ کو یا تو تھانہ کی عمارت میں لگادیا جائے یا اس کو پٹنہ میوزیم میں رکھنے کے لئے بھیج دیا جائے، اس کی تفصیل بلخی صاحب نے اپنی کتاب آثار قدیمہ میں یوں لکھا ہے:

”یہ کتبہ سابق میں کسی مزدور نے لوح مزار سمجھ کر تھانہ کے صحن میں ایک قبر پر لگادیا تھا کچھ مدت کے بعد اس قبر سے علیحدہ ہو گیا تو کانسٹیبلوں نے پڑب جانب سا بنان میں ڈال دیا اور راقم نے اس کو وہیں دیکھا تھا اور بذریعہ خط انسپکٹر جنرل آف پولس سے درخواست کی کہ اس تاریخی کتبہ کو تھانہ کی عمارت میں لگادیا جائے یا اس کو پٹنہ میوزیم میں رکھنے کے لئے بھیج دینا چاہئے۔ انسپکٹر جنرل نے راقم کی درخواست پر اس کتبہ کو بھی اول الذکر کتبہ کے پاس ہی تھانہ کی دیواریں لگادیا اور بذریعہ چھٹی مورخہ ۱۸ جون ۱۹۳۲ء راقم کو بھی مطلع کر دیا جس کے لئے راقم صاحب ممدوح کا بجد ممنون ہوا۔“

ظریف الملک اشرف علی خاں خاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ

هو الرب الرحيم

کو کہ خاں آن بہار بلخ سخن سوئے خلد بریں ز دنیا رفت

کرد مفتوں چو فکر تیار بخش گفت ہاتف سرور دہا رفت

نواب، ہیبت جنگ کے مقبرے کے حالات بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”پٹنہ سیٹی ریلوے اسٹیشن سے کوئی دو سو گز دھن اور کسی قدر چھم ایک بڑا احاطہ تقریباً سو گز لانا اور اس سے کچھ ہی کم چڑا ہے۔ احاطہ کی شمالی دیوار میں ایک خوشنما مغلیہ طرز تعمیر کا پھاٹک بنا ہوا ہے جس کے اوپر ایک بڑا گنبد اور دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں یہ پھاٹک زمین سے ایک گز کی بلندی پر ہے۔ اندر سے دونوں جانب سیڑھیاں ہیں جن پر چڑھ کر ایک چھوٹے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں جن کے دونوں جانب چھوٹے نما کھڑکیاں ہیں جو غالباً نگرانی یا تیر و تنگ چلانے کے خیال سے بنائی گئی تھیں، پھاٹک کے سامنے دھن میدان میں تیس فٹ مربع سنگین چوترو بنا ہوا ہے جو چار فٹ بلند ہے اس چوترو کے اوپر دس فٹ کا ایک اور چوترو ہے جس کے چاروں طرف نہایت نفیس جالی دار ترشے ہوئے پتھروں کا احاطہ ہے ہر لوح میں نئی وضع کی جالی ترشی ہوئی ہے جو پانچ فٹ اونچی اور گز بھر چوڑی ہے، چاروں کونوں پر سات سات فٹ لائے سیاہ پتھر کے ترشے ہوئے کلس دار پائے ہیں، اسی احاطہ کے اندر سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کی بنی ہوئی قبر ہے جس کے سر پر ایک سنگین طاغیہ بنا ہوا ہے، یہی قبر نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ صوبہ دار بہار و عظیم آباد پٹنہ کی ہے جن کا مفصل حال کتاب کے حصہ اول میں مذکور ہو چکا ہے، قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے نہ شاعر میں نواب سراج الدولہ کو تار مہدی خاں چند رفقا کے ساتھ ہے، قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ اس چوترو سے دھن اور چھم اور بھی قبریں ہیں لیکن کتبہ کسی پر نہیں ہے۔ نہ شاعر میں نواب سراج الدولہ کو تار مہدی خاں چند رفقا کے ساتھ اسی جگہ سے گھوڑے پر سوار کر کے قلعہ عظیم آباد پر قبضہ کرنے کو لے گئے تھے قبر سے چھم ایک خوشنما مسجد ہے جو پچاس فٹ لائنی اور بیس فٹ چوڑی اس کے تین گنبد ہیں جو پچیس فٹ بلند ہیں اور سنگ موسیٰ کے کلس بھی چڑھے ہوئے ہیں اور ان کے علاوہ سنگ موسیٰ کی برجیاں بھی ہیں، صحن مسجد میں بیس فٹ لائنا اور پندرہ فٹ چوڑا ایک حوض بھی بنا ہوا ہے پتھر میں جو پھوڑ دیا ہے اور اس کے نیچے سنگ موسیٰ کی ایک برسی لوح اس طرز پر لگائی ہے کہ حوض کا پانی اس لوح پر قدرتی جھرنے کی طرح بہتا رہے، اس لوح کو بھی نہایت صنت

سے تراشا ہے تمام عمارت بے مرمت رہنے کی وجہ سے نہایت خراب حالت میں ہے۔

محمد حسن ولد غلام حسین (مؤلف سیر المتاخرین) کی قبر کا کتبہ ۱۱۹۸ھ

هو الله بآتی والکل فانی

سید نوجواں بنام حسن	از جہاں رفت و نامش بروم
سید ایش دل محبانش	خاصہ از بہر مادر و ابا و عم
پے سال عزائے او گزاشت	بر زمان پدر غم صم

۱۱۹۸ھ

بندہ از بندہ ہائے خدا محمد حسن ولد غلام حسین بن ہدایت علی خاں طباطبائی عفی اللہ عنہم
در عقوان جوانی عین بہار زندگانی کہ از مدت عمرش نوزدہ سال و دو ماہ و بیست روز گذشتہ
بعد روز جمعہ شب بیست و یکم ذی الحج چون گل نو شکفتہ و پرمردہ در دل خود ارزد با برد
اما کمال صبر و شکیبائی کہ در شدائد بیماری ہرگز حرف شکایت غیر از حمد خدا بر زبانش
نرفت و بر دل والدین گذشت آنچه گذشت چہیں مصیبت کے مباد و ایزد تعالیٰ
رحمت کنار۔

سرباعی

ناخودہ بر از عمر جوانی رفتی با صبر و شکیب و شادمانی رفتی
در بیت حزن بدر و بچراں یعقوب در اندہ و تو ای یوسف ثانی رفتی
اس کے بعد اس کتاب آثار قدیمیہ کا خاتمہ جھٹولی کی مسجد کے کتبہ پر ہوتا ہے۔ یہ مسجد
۱۳۱۰ھ کی بنی ہوئی ہے۔

جھٹولی کی مسجد ۱۳۱۰ھ

ہمت براہل مسکن ہوئی	دوسروں کو بھی ہوا اس کا خیال
بدھ کا دن تھا عین روز بقرعید	بعد تیرہ سو کے نو ہجری تھا سال
اہتمام شیخ اسد اللہ سے	پڑ گئی اس کی بنائے قبل و قال

سن لکھنؤ نشی شفاعت نے کہا مسجد اظہریٰ جب خوش جمال

میں نے یہ مہر لکھا عبد الغفور

ہے یہ بیت اللہ اقصیٰ کی مثال

۱۳۱۰ھ

بلخی صاحب مرحوم نے صوبہ بہار کے دیگر شہروں، قصبوں، مساجد اور قبور کے کتبات کافی جانفشانی کے بعد حاصل کئے تھے۔ ان میں قصبہ اورنگ آباد، داؤدنگر اور سہرام کا نام قابل ذکر ہے چنانچہ ان کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی ایک بیاض دستیاب ہوئی جس میں قصبہ اورنگ آباد، داؤدنگر اور سہرام کے کتبات چند کاغذات پر مشتمل ہیں۔

(قصبہ اورنگ آباد کا حال)

عبدالواحد خاں تراہی کی مسجد کا کتبہ ۱۱۳۰ھ

یارب این خانہ قوی بنیاد باد از آفت زماں خالی

سالش از ہاتف خرو جستم گفت رشخوب مسجد عالی

۱۱۳۰ھ

قصبہ سہرام کا حال

بلخی صاحب مرحوم نے سہرام کے آثار قدیمہ کے کتبات کو کافی جانفشانی کے بعد حاصل

کیا ہے، ان آثار قدیمہ میں عالمگیری مسجد، تارا چند دیوی کا مندر، حسن سور کا مقبرہ، حسن سور کے

مقبرہ کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ، عید گاہ کے کتبے، سرست خاں کا روضہ، علامہ خاں کا روضہ اور

صفدر جنگ کا قلعہ وغیرہ قابل ذکر ہے۔

(عید گاہ کے کتبے)

اتر جانب والا کتبہ

خاں والا گہر مجاہد خاں ساخت مسجد بعد شاہ جہاں

گشت تارین این سرزور ہو بیت المقدس المعمور

۱۰۴۵ھ

درمیانی کتبہ

در ایام شاہ جہاں عید گاہ مجاہد بنا ساختہ بر طریق
چوتاریخ دے خواستم از خرد نماداد ہا تلف کہ بیت العتیق
۱۰۴۳ھ

دکن جانب والا کتبہ

نادر العصر عید گاہ شدہ عید گاہ ابد کرد مجاہد خاں
۱۰۴۴ھ ۱۰۴۵ھ

چندن پہاڑی کے قریب مسجد ۱۰۲۲ھ
یہ مسجد جہانگیر کے عہد ۱۰۲۲ھ میں علی اکبر نے بنائی ۱۰۳۰ھ میں بعض مختاروں نے
اس کی مرمت کرائی۔

مسجد کے کتبہ کی نقل

بدور شاہ نور الدین جہانگیر زماں خاں سرور صفدر القاب
علی اکبر چہم و مسجد بنا کرد کہ تالب تشنگاں گرد سیراب
چہ تارہ بخش طلب کردم خرد گفت ز بہر طاعت رزاق دوہاب
امام بارہ کا کتبہ ۱۱۹۱ھ نزد محلہ شیخ پورہ

بدور شاہ عالم شہر رمضان نباشد مسجدے از فیض رحماں
برائے روشنی حضرت امامین مکا نے ساختہ دائم علی خاں
ہزار و صد نو دیک بد ز ہجرت کہ شد آراستہ میں طے رضواں

۱۱۹۱ھ

جانی کے بازار میں ایک مسجد کا کتبہ

خانہ حق چو ساخت تیغ علی خواست تاریخ اپ ز ہا تلف غیب
از برائے ثواب در کونین مسجد خاص در گہ حنین
۱۲۰۵ھ

جانی کے بازار میں امام بارہ
چوں تیغ علی روضۃ اہل ازہب
تاریخ بنا ہاتھ غیبی فرمود
خوش کرد بنا بہر زیارت ہر کس
ایں بارگاہ خاص امام بیگس

۱۲۰۰ھ

مذکورہ بالا سطور میں میں نے اوپر یہ عرض کیا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے قصبہ بہار شریف کے کتبات کافی تلاش و جستجو کے بعد حاصل کیا تھا، انہوں نے کہ موصوف کے تحقیقی انکشافات اب تک منظر عام پر نہ آ سکے، ہو سکتا ہے کہ بہت سے نادر کتبات موجودہ دور میں موجود نہ ہوں لیکن بلخی صاحب مرحوم کی قلمی بیاض میں آج تک محفوظ ہیں۔

قصبہ بہار شریف

عزالدین طغرل کا کتبہ ۶۲۰ھ

صوبہ بہار میں قدیم ترین اسلامی کتبات جو اب تک نظر سے گزرے یہی ہیں، محند دوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے اتر جانب جو احاطہ ہے اس کو حلقہ دوم کہتے ہیں اور درمیانی دیوار میں جو در بنا ہوا ہے اس کو صندل دروازہ کہتے ہیں، اس حلقہ دوم کے اندر جانب حضرت جمال اولیاء کا مزار اور حجرہ ہے اس کے پاس یہ کتبہ موجود تھا لیکن درگاہ کے مجاوروں نے اسے محفوں سے پیسہ کمانے کے لئے اس کتبہ کا نام کڑا رکھا اور تیل ڈال کر بھوت جلانے کا فریب ایجاد کیا ہے، اس کتبہ میں تین سطروں میں یہ عبارت کندہ ہے۔

سطر ۱ بنا ہذا العمارۃ فی ایام المجلس العالی خان الاعظم خاقان

(اس جگہ لوح کا کنارہ ٹوٹ گیا ہے)

سطر ۲ عز الحق والدین عیار الاسلام والمساہین معین الملوک والسلاطین الی الفقہ طغرل

سطر ۳ السلطان خلد اللہ مملکۃ العبد مبارک الخازن یقین اللہ منہ فی محرم العین وستمائہ

طغرل خاں ۶۲۹ھ سے ۶۳۲ھ تک بہار و بنگالے کا حکمران تھا۔

سلیمان کرارانی کا کتبہ ۹۷۷ھ

در شرف جہاں قطب انقلاب
بریں درہر کہ آید نیک یابد
ادیب خلوتش سید امین است
بعہد شاہ عادل منظر نور
کجا اعلام عالی را بر فراخت
سلیمان جہاں ثمانی سلیمان
زمقند مفت ہفتا دایں لہاں بود

۹۷۷ھ

پہاڑ پورہ کی مسجد کا کتبہ ۸۵۹ھ

بارک اللہ در زمان ناصر دنیا و دین
صفدر گیمہاں پناہ ملکیت صدر کرم
مسجد جامع بنا کرد انجناں کاندہ جہاں
منبر و محرابش از فرط علوئے مرتبہ
ایں نذر از عالم بالا ہی آید فرود
چار شنبہ بست و ہفتم از مہ ایام صیام
در بنائے خیل و احمد ہی خواہد بجاں

شاہ محمود ابن ابراہیم شاہ راستیں
یافتہ توفیق خیر از فضل رب العالمیں
طاق و بنیاد آتش تاماہ و ماہی ہم نشیں
یافت آن رونق کہ تحسین میکند روح لایں
ہندہ جنت عدن فاد خواہا خلدین
ہیصد و پنجاہ و سہ بود ست تاریخ سنین
روح پاک شیخ شرف الحق والدین ربیعین

شاہ محمود ابن ابراہیم سے سلطان ابراہیم شرفی کا بیٹا اور جانشین مراد ہے جس کی زمان
حکومت ۸۴۰ھ سے ۸۶۸ھ تک تھی۔

۱۷ اس جگہ مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی خلیفہ و سجادہ نشین حضرت مخدوم بہاری، ان کی اولاد اور
سجادہ نشینوں کے مزارات ہیں۔

چھوٹی درگاہ کا کتبہ

حضرت مخدوم شرف الدین احمد کے مزار سے کوئی نصف میل پورب دکن ایک احاطہ کے اندر مخدوم بدر الدین بدر عالم زاہدی کا مزار کھلے ہوئے صحن میں واقع ہے۔ اس جگہ کو لوگ چھوٹی درگاہ کہتے ہیں۔ اس احاطہ کے اندر ایک جانب فیروز تغلق کے عہد کا کتبہ ہے۔ اس نادر کتبہ کو مجادروں نے احمقوں سے پیسہ حاصل کرنے کے لئے بھوت جلانے کا کڑاہ بنالیا ہے۔

فیروز شاہ کے عہد کا کتبہ ۷۸۱ھ

مجد گشت این میوں عمارت	بعہد بادشاہ عدلی پرور
شہنشاہ جہاں فیروز شہ آں	کز و آباد شد محراب و منبر
بسعئ التماس بندہ خاص	بذیل خطہ اندر دور داور
ملک سیرت ملک کافی کفالت	نہیم نامور حد ہفت کشور
گذشت ہفصد از تاریخ ہجرت	فزودہ بود یک بر ہفت دیگر
ہمیشہ بادشہ بر تخت دولت	چونام خویش فیروز و مظفر

درگاہ حضرت مخدوم احمد چرم پوش

اس درگاہ کے اندر تین نادر کتبات ہیں جن کی نقل بلخی صاحب مرحوم کی تلمیذ میاں میاں ہے۔ حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے مزار کے پائیں حضرت شمس الدین بلخی کا مزار ہے جو حضرت مخدوم کے دوست، مرید اور خلیفہ تھے اور حضرت مولانا مظفر بلخی کے والد تھے۔ صوبہ بہار میں بلخی خاندان کے لوگ آپ ہی کی اولاد سے ہیں، مخدوم احمد چرم پوش کے مزار کے سر پر ایک لوح پر کتبہ ہے جس کو مجادروں نے کڑاہ بنا ڈالا ہے۔

۸۵۹ھ کا کتبہ

قال البنی علیہ السلام من بنی مسجد اللہ بنی اللہ لا بیتا فی الجنۃ
مسجد جامع بتوفیق خداوند الہ وز طفیل مصطفیٰ صاحب تمکین جاہ
شد بعہد دولت شاہ کہ صیث عدل او مغرب و مشرق گرفت از بشت اہی تا ماہ

آئندہ شاہ پور ابراہیم عادل.... سرفراز
 این بنا کردہ بعہد حضرت صدر کرم
 اشرف الحق اکرم دارشد بفضل این چنین
 ترمیم بیت المقدس حرمت بیت الحرام
 بندہ فضل الہیستہ بہت ہفتہ از صیام
 آفتاب سلطنت شاہ جہاں محمود شاہ
 مقطع صوب بہار و دستگیر و لا خواہ
 دولت آوارہ سرداران ملی عالی پناہ
 مسجد نبوی چوں بیت علو بارگاہ
 پشت محمد پناہ و نہ تاریخ بودہ سال دہ

۵۸۵۹

قناتی مسجد کا کتبہ

کاغذی محلہ بہار شریف میں حضرت احمد بستی کا مزار ایک گنبد کے اندر ہے مشہور ہے کہ
 انہوں نے حضرت مخدوم شرف الدین بہاری کو بتایا کہ اس جگہ کا گنبد متصل ایک قناتی مسجد کی
 دیوار میں ایک کتبہ پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

در عہد بادشاہ جہانگیر جمناں
 نکر قطب احمد عارض بنا یقین
 برہان و دزگار براہیم دو جہاں
 تاریخ سال ہشت صد ہفت و جہاں

۵۸۵۶

محلہ پیر بہاری کے کتبات

قصبہ بہار شریف میں پیر بہاری ایک نمایاں بہاری ہے اس پر متعدد قبریں ہیں جو احاطے
 کے اندر واقع ہیں اس احاطہ میں ایک بلند گنبد کے اندر ملک ابراہیم (بی) کا مزار ہے گنبد کے شرقی
 دروازہ میں ایک کتبہ پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

کتبہ ۵۸۵۳

این مقطع بہار ملک سیف دولت است
 بت را ہی شکست جو ہم نام خویش را
 صفدار صف شکن چو راستے جوب
 خورشید اگرچہ لشکر سیارہ داشت
 کز ہم تنخ اد سپر افگندہ آفتاب
 در عالم بقاش شود بت شکن خطاب
 در علم ز تپ فنادے تہمت شد ز تاب
 آخر ز کجہ ساخت سہا پدہ بجا

تاریخ آفتاب کہ یکشنبہ از جہاں چوں لعل رفت در دل رنگ از برای خراب
بود از مرعظم نومی الحجبہ سیزدہ و ز سال بود ہفتاد و پنجہ در حساب

گنبد کے دکن جانب کا کتبہ ۱۵۳۳ھ

ددیں گنبد کہ ہست از روئے معنی بقدر از گنبد اسلاک بہتر
نخفتہ شیر مردے کز بہ ہمیش بخفتہ شیر اندر بطن شیر
مدار الملک ابراہیم ابو بکر کہ تیغ از بہر حق می زد و چون حیدر
چنین لشکر کشے لشکر کشائے نیز دویم اندر ہفت کشور
کنوں چوں بر درت افتاد یارب ز راہ لطف بکشائی برود در
بمشک رحمت و کافور راحت کنی دیوار خاکش را معطر

گنبد کے پورب جانب والا کتبہ

بعہد دولت شاہ جہانگیر کہ باد اورا بہار ملک نورد
شہنشاہ جہاں فیروز سلطان کہ بر شاہان گیتی گشت فیروز
ملک سیرت ملک بیوہ براہیم کہ بدور دین چوں ابراہیم کی سوز
چو آمد سیزدہ تاریخ از ماہ بجاہ ذی الحجہ یکشنبہ از روز
ز ہجرت ہفتاد و پنجہ تاریخ مسافر شد ملک در جنت ایں روز
خداوند افضل خویش بردے کنی آسان حساب آخرین روز

ہلسا کی مسجد کا کتبہ

یا مالک الملک لسانہ وقایلہ و کاتبہ

بدرگاہ ولی حق شاہ جن کہ او مرد مردان خدا بود
بدور شہ سلیم اکبر آل شاہ کہ از حامی شرع مصلح بود
بنائے مسجد بنیاد مردے کہ از جاں دوستدار مرتضیٰ بود
خود پسید کیس شخصے کہ بایست گونا مش چہ تاریخ از کجا بود

ابو بکر و عمر عثمان و حمید

خود گفت تاریخ سالش بگوئم بنا کرد مسجد زہر عبادت

کتبہ مسجد خالقہ رحمہ اللہ واقع مخصوص پور

قتل ہی مسجد اسس علی التقویٰ

صاحب پور نام خاں قیوہ ساختہ مسجد خوش و خوش

سال ہجری روز زبوسے دیں گفت ہاتھ بگوش دل بشنو

مسجد اسس علی التقویٰ فاعبدوا المسجد والوجه اللہ

کتبہ کنواں جو قلعہ کے دھن دروازہ سے کچھ فاصلہ پر یا ہر واقع ہے (مؤکیر)

بہر دو وقت مخصوص خاں کہ باد آتا ابرار در بقائیش

بنا کردند سد باغ چاہ کہ چاہ باغ شد دلکش نہایش

ز ہجرت در ہزار و ہفتی سال مرتب شد بنائے در بایش

و چاہ و چاہ در صورت یکے بود فزوں داں باغ را جائے بجایش

شدش تاریخ چاہ و باغ دروہر فزوں آمد ز چاہ باغ بایش

۱۰۱۲ - ۵ = ۱۰۰۷ھ

مؤکیر میں شاہ نافع کا مزار سنہ ۱۰۱۲ھ

قلعہ کے اندر حضرت شاہ نافع کا مزار واقع ہے کتبہ کی نقل یہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نصر من اللہ وفق قریب و بری المومنین بنا ہوا اللہ فی عبد السلطان العادل

سید السادات مجمع السعادت علاء الدین و الدین ابوالمظفر حسین شاہ

خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بانی خیر و انیال شاہ سنہ ۸۷۱ھ و تسعایہ سنہ ۸۹۷ھ

مؤکیر چنانکہ میں گنبد کا کتبہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ابو بکر صدیق و عمر فاروق و عثمان غنی و علی کرم اللہ وجہہ
چوں نصف العباد اللہ خواجه احمد مرتضیٰ حسب الکرم ذاب قدس القاب شاہزادہ
عالمیان شاہزادہ پرویز جہاگیر خدمت فوجداری سرکار موگیر آمدہ بود بہ بنائے عمارت
اسی روضہ منورہ توفیق یافت سلطنت ہزار سی و دو صاحب مزار کون تھے مجمع طور پر
معلوم نہ ہو سکا عوام الناس اس کو مخدوم یا پیر کا مزار بتاتے ہیں نام نہیں جانتے۔
کتبہ مسجد موضع چراند ضلع سارن

چھپرہ سے کوئی تین کوس پورب چراند ایک قدیم بستی ہے جہاں پڑنے قلو کے آثار پائے
جاتے ہیں وہی ایک قدیم مسجد ہے مسجد کا کتبہ یہ ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی مسجد اللہ بنی اللہ لدن بیت فی الجنۃ
مثلاً بنی ہذا المسجد الجامع السلطان المعظم والمکرم علاؤ الدنیا
والدین ابوالمظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی
خلد اللہ ملکہ سلطنتہ فی سنتہ تسع وتسعاۃ ۹۰۹ھ

اصل مسجد مقدم ہو گئی ہے اوساب اس کی بعض دیواریں شکستہ حال ہیں
مذکورہ بالا کتبات کی جو نقلیں پیش کی گئی ہیں ان سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ
یعنی صاحب مرحوم نے یہ تاریخی کتبائے کتنی جانفشانی اور سخت محنت کے بعد حاصل کئے تھے۔ ان کی
مجموعی تعداد اس طرح ہے:

کتبات: اطراف عظیم آباد مع تفصیل و دانا پور و جھولی ۲۶۰

۴ قصبہ اورنگ آباد

۲ داؤد نگر

۲۳ سہرام

۲۶ بہار شریف

کتابت : مونگیر

۶

نمبہ

۲

بھاگلپور

۲

ضلع سارن

۱

قصبہ بارہ

۱

۲۳۷

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے لگ بھگ ساڑھے تین سو کتابت کی نقلیں جمع کی ہیں۔
 بلخی صاحب مرحوم کے وہ مضامین بھی کافی قابل قدر ہیں جن میں انہوں نے چند نادار کتابت کی نقلیں
 شائع کی ہیں، بلخی صاحب مرحوم کا ایک تحقیقی مضمون مولوی شجاع الدین رسالہ صبحِ نوا پر ۱۵۸۱ء میں
 شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے مولوی شجاع الدین ان کے والد حضرت یتیم اللہ اور ان کی بیگم
 گیتی آرا کے کتابت کی نقلیں شائع کی ہیں، ان کتابت کی تاریخی اہمیت نہایت ہی اہم ہے، گیتی آرا بیگم
 شاہ عالم بادشاہ کی نواسی تھیں اور مولوی شجاع الدین کے نکاح میں آئیں، مولوی شجاع الدین ان کے والد
 اور ان کی بیگم کے مزارات قصبہ چوڑہ ضلع مونگیر میں ہیں اور شیخ پورہ سے جوئی جانے والی سڑک کے دھن
 ایک احاطہ میں واقع ہیں، اب ان مزارات کے کتابت کی نقلیں پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا وحید عصر فرید زمانہ مولانا یتیم اللہ علیا رحمۃ

ہو اللہ الباقی

آنجناب از اولاد حضرت امام باقر از سادات ترمذاند..... علمائے روزگار واجلہ کبار بود در علم
 معقول و منقول و در علم فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، یگانہ زمانہ بود، ولادت آنحضرت در سال یک ہزار
 و یک صد و پنجاہ ہجری است، سی سال در تحصیل و تکمیل علوم ظاہری بدل ہمت نمودہ بہ تحقیق و تطبیق
 احادیث و اصول و فروع مذاہب و ادیان گوئے سبقت از امثال و اقربان بردہ بلکہ در کشف بعضے
 مسلمات مسائل کہ بہ افکار حکمائے سلف نہ کشود بحکم فضلنا بعنکم علی بعض منفرد گردیدہ و یک چند
 بدو در خواہش بادشاہ وقت معظمت خدمت سلطانی... تقریب سلطان زمان ماند و من بعد بہ تعقلے

طبیعت اصلی بغیضان صحبت بعضی مقتدیان طریقت به اکتساب معارف عقب یقینیہ و علوم
باطنیہ ترک و تجرید گزید و چهل سال به ریاضت و درس تفسیر و فقه بسر برد و در سال ۱۲۲۱ھ انتقال
نمود و این کتبہ و تقوید را شجاع الدین علی ابن آبختاب در دار الخلافت شاهیہاں آباد کہ عہدہ حکومت
عدالت آنجا با خدمت افتائے صدر داشت و در سال ۱۲۲۲ھ و در سال ۱۲۲۵ھ فصلی و در سال ۱۲۲۸ھ و در سال ۱۲۲۸ھ
سمت مرتب گردانیدہ و ہم دریں سال محمدیحی ولد آنحضرت کہ فاضل ذکی الطبع بصفتا حمیدہ بود و
خدمت عدالت غازی پور داشت وفات نموده بحوار مزار والد بنزد گوار مدفون شد انالله وانا الیه راجعون

(۲) مزار سراسر عبرت و اعتبار رسید شجاع الدین علی خاں رضوی

اے نازک خاک مرقد من	ہشدار دہیں راہ خطرناک
دیروز بہ عزت درس حکمت	می بود سرم باوج افلاک
امروز چنانکہ کس نداند	گننام فتادہ ام تہ خاک
فردا تو شوی غبار چوں من	اماں ازیں گریوہ خاک

این آثار صورت آل ہیولی و نشان مولائے آن صورت است کہ در نشان ظہور آن ساگاہ شجاع
الدین علی گفتند و گاہے خاک تیرہ و گاہے معدوم و گاہے عالم و گاہے معلوم می خوانند گاہے بصورت
انسان بہ حکیم و عالم مشہور و گاہے بخاک ظلمانی از چشم ظاہر مستور۔

اے از تو وجود ہمہ موجود	از بود تو هست این ہمہ بود
تا از تو جدا شدم فتادم	در کاہش رنج و محنت و غم
نامم شدہ کہ علی و کہ خاک	کہ زیر زمین گہ بر افلاک
کہ عالم دگاہ گشتہ معلوم	موجود گہ و گاہے معدوم
اندر طلبت خراب و خیرہ	این و ہم تباه و عقل تیرہ
جستیم ہر اجمہلہ ہستی	در ہر چہ بطن نقش بستی
در علم طبیعی و الہی	مصرف بدل شدم کما ہی
در مسئلہ و ثبت امکان	کردم بطریق فکر امکان

در بحث بقائے نفس، انساں
 بعد از عدم و خراب ابدان
 در علم کلام و بحث ادیاں
 در خوض باصل کفر و ایماں
 مقصود تفکر کم تو بودی
 سامان تحسیرم تو بودی
 کرم نظر بوسع امکان
 پائے نظم به اوج کیوان
 سی سال به فکر کوه کندی
 نمک شود بجهد فکر بندم
 این سوچ و کشیده ره ندیدم
 در خدمت صوفیان آفاق
 از مدرسه رخت بر کشیدم
 رفتیم به نیاز و صدق ایقان
 ارباب صفا و اهل اشراق
 دیدیم همه ساز خود بر فتنه
 مشغول شدم به کسب فیضان
 در بند خیال و دهم خود مست
 بر دهم و خیال و فکر بسته
 بعد از نظر کمال تدقیق
 نقصان و کمال شان آنست
 تا آنکه تشخص من و او دست
 بتوان به تخیلات امکان
 با جمله یقین شدم به تحقیق
 چون گشته چنین سقیم انجام
 بعد است هزار سال اندوشت
 بگذاشتم این تشخص کف و لیش
 رفتن به حریم جان جانان
 تاریخ وفات این مرد بزرگ ^{۲۲۷} ساله هجری است
 در ماه غنائے خود روم گام
 فاعتبروا یا اولی الالبصا

این مزار سراسر عت و اعتبار نواب گیتی آرا بیگم بنت نواب رفعت النساء بیگم بنت شاه عالم
 بادشاه هندوستان که در قلعہ سرخ پیدا و پرورش یافته و بسبب نکاح با سید شجاع الدین علی خاں
 بهادر رضوی دریں خاندان مدفون گردیده و تاریخ سال انتقال از مصرع آخر قطعه عبارت ظاهر
 بحساب ابجد برمی آید۔

قطعه

گیتی آرا بیگم شہزادی عالی نسب
چوں ازیں عالم بسوئے خلدِ اعلیٰ می رود
سالی تاریخش چو اول جستم ہاتھ بگفت
یک ہزار و دو صد و پچاہ و شش ہری برد

۱۲۵۶ ہجری

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم تاریخی و تحقیقی مضمون قلعہ رہتاس کی سرگذشت، رسالہ معاصر
پٹنہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بھی بلخی صاحب مرحوم نے اسلامی عہد کے کتبات کی نقلیں
پیش کی ہیں چنانچہ مثال کے طور پر ایک کتبہ کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

ساتی خاں کا مقبرہ ۹۸۶ھ

فغاں از گردش چرخ ستمگر کہ نبود با کس اورا مہربانی
خلف ساتی سلطان راست دل کہ گرد معجز با اسم فانی
قضا را آنچناں رنجور گردید کہ از صحت نبود اورا نشانی
بہ اد پیک اجل آمد بگفتا سفر کن در ازیں دنیائے فانی
سفر کرد اور ازیں عالم سکدم ایں باید کردگار لامکانی
بحسم از خرد تاریخ نوشت بگفتا در بہشت جاودانی

۹۸۶ھ

بلخی صاحب کا ایک اہم تحقیقی مضمون "امیر مینائی اور داغ دہوی کی قبریں" رسالہ "صبح لا"
سٹی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے امیر مینائی اور داغ دہوی کی قبروں
کے کتبات کی نقلیں شائع کی تھیں۔

قطعہ تاریخ رحلت مفتی امیر مینائی لکھنوی

امیر کشور معنی امیر مینائی خدا کے عاشق صادق نبی کے فقیر
گئے جو خلد بریں تو ان کی تربت پر جلیل نے یہ کھار و فہ جناب امیر

۱۸ ۱۳ھ

داغ دہلوی کی قبر کے کتبہ کی نقل

رفت از دہر چوں فصیح الملک	لرزہ افتاد در تہائی ہند
اوتاد نظم ام آصف جاہ	مور و لطف شاہ حامی ہند
راست بر قاتلش قبائے سخن	زمید وے خطاب حامی ہند
سلک نظمش لساں سلک گہر	جو ہر تہی سخن نظمائی ہند
شد وفاتش بشام یوم الحج	دفن شد روز عید سائی ہند
آہ از دل کشید سائل گفت	دفن پاک داغ نامی ہند

۲۲ ۱۳ ۲۲

بلخی صاحب مرحوم نے کافی تلاش و جستجو کے بعد کتبات کی نقلیں حاصل کیں۔ موصوف
جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے وہاں کی تاریخی عمارات کا ضرور معائنہ کرتے چنانچہ اگر انہیں کوئی
نامور تاریخی عمارت کا کتبہ نظر آتا تو وہ اس کا چربہ لے کر ضرور اس کی نقل حاصل کر لیتے، یوں تو صوبہ
بہار میں کئی ایسے محقق ہیں جو ہندوستان گیر شہرت کے حامل ہیں لیکن آج تک کسی محقق نے بھی عصری
تحقیقات کا انکشاف نہیں کیا چنانچہ بلخی صاحب مرحوم صوبہ بہار کے واحد محقق ہیں جنہوں نے
عصری تحقیقات کا انکشاف کیا اور یہ خوبی بلخی صاحب مرحوم کی ذات ہی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

پٹنہ یونیورسٹی اور بلخی صاحب مرحوم

بلخی صاحب مرحوم اپنی ملازمت سرائے کیلا اسٹیٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے
وطن عظیم آباد تشریف لائے۔ سید حسن عسکری اور ڈاکٹر کے۔ کے دتا کی سہی سے ان کی بحالی
بحیثیت ناظم شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی میں ہوئی چنانچہ اس شعبہ میں بلخی صاحب مرحوم کے بہ حیثیت
محقق کیا کارنامے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا جائزہ جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام کے
مضمون سے پٹنہ یونیورسٹی ریسرچ جرنل سے لیا جاتا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے سابق ناظم شعبہ
مخطوطات جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام بلخی صاحب کے تحقیقی کارناموں کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:
”عظیم آباد کے جن لوگوں نے ہندوستان اور بالخصوص صوبہ بہار کی تاریخ

اور ادب پر گہری نظر رکھی ہے ان میں پروفیسر عسکری، ڈاکٹر کے۔ کے دتا اور فصیح الدین بلخی مرحوم قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر حضرات کا سروکار پٹنہ یونیورسٹی سے تھا مگر بلخی صاحب مرحوم سرانے کیلا اسٹیٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آئے لہذا انہی حضرات نے بلخی صاحب کو پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک کرنے کی صورت نکالی، یہ زمانہ ۱۹۴۶-۴۷ء کا تھا، ہندوستان کے نقشہ پر خط نسخ کھینچا جا رہا تھا لوگ ایک نئے ملک کے قیام کے لئے کوشاں تھے۔ پٹنہ کے چند اہل علم ایک علمی مرکز کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے جو آج شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دو شاخ ہوئے، ایک فارسی عربی اردو اور دوسرا ہندی سنسکرت اور سیکھلی۔ آخر الذکر کا تعلق شاستری جی سے رہا جو بہار ریسرچ سوسائٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس سے منسلک کر دئے گئے تھے مگر شعبہ کی تمام ذمہ داریاں انہی کے سر فہمیں اور وہ ناظم شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی سمجھے جاتے تھے۔

ممدوح کو مخطوطات سے کیسا شغف تھا صرف وہی حضرات بیان کر سکتے ہیں جنہوں نے انہیں پرستہ کار دیکھا ہے۔

”کرسی بغرض روشنی کوئی کے قریب کر لی گئی ہے، ہاتھ میں ایک بڑا سنگین فان شیشہ ہے آنکھ شیشہ سے لگی ہوئی ہے اور شیشہ کتاب سے، یقین جانئے آنکھ شیشہ اور کتاب کے درمیان کوئی خاص فصل نہیں ہے، اس عالم انہماک میں اگر کوئی صاحب ذوق تشریف لائے تو خیر علمی گفتگو شروع ہوئی ورنہ صرف ایک سگریٹ دھونے پر انہیں واپس کر دیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی پٹنہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت ناظم شعبہ مخطوطات کیا ذمہ داریاں تھیں اس کے متعلق ڈاکٹر خواجہ افضل امام صاحب اپنے مقالہ میں یوں لکھتے ہیں۔

”ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں، ریسرچ اسکالرشپ کی ہر ممکن معاونت، مخطوطات

کی فراہمی ان کی فہرست کا کینٹلگ تیار کرنا، کسی تادم نسخہ کی طباعت، برٹش میوزیم انڈیا آفس کے کسی نسخہ کی حاصل کردگی وغیرہ سکشن کے قیام کے بعد تقریباً چھتے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو فارسی یا تاریخ میں ریسرچ ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلاشبہ بلخی صاحب کے مرہون منت ہیں، خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کر لیا جو بچ گئے وہ اب تک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں، مرحوم کا تعلق جتنا اردو فارسی عربی سے تھا اس سے کسی طرح کم تاریخ سے نہ تھا، تاریخ مگدوہ آج بھی کالجوں میں رائج ہے، یہاں وہ ہے کہ تاریخ کے طلبہ بھی اس خالقانہ سے فیضیاب ہوتے تھے، ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ڈاکٹر قیام الدین ہرمدی پرشاد اور لکشمی کانت چودھری کر سکتے ہیں۔

اس شعبہ سے ان کی وابستگی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۹ء تک رہی جس میں انہوں نے ساڑھے چودہ سو مخطوطات، فرامین، اسناد وغیرہ جمع کرائے، کتابوں کا معتد بہ حصہ حیدرآباد سے آیا جہاں بلخی صاحب اردو پرفیسر عسکری سید عبدالرحیم صاحب مدظلہ کے یہاں رہے۔ کتابوں کی تلاش اپنے صوبہ کے کسی شہر میں نہ لے گئی، کون سا خانوادہ تھا جہاں اس کی فکر اور جستجو میں سرگرداں نہ پھرے اور حتیٰ الوسع کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ بعض اسکولوں سے نقلی کتابیں لے کر وہاں مطبوعہ کتابیں بھیجا دیں جیسے کہ محمدن اسکول پٹنہ سیٹی وغیرہ۔

ڈاکٹر خاجہ فضل امام نے اپنے مضمون "فتح الدین بلخی مرحوم اور پٹنہ یونیورسٹی" میں بلخی صاحب کی جمع کردہ فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست پیش کی ہے جو سطور ذیل میں تصحیح کی جاتی ہے۔

تاریخ	عربی	فارسی	اردو
تذکرہ	۱۲	۵۷	۵
تاریخ	—	۶۰	۴

اردو	فارسی	عربی	
۱۰	۵	۱	سفرنامہ
—	۳	—	جغرافیہ
—	۱۸	—	النشأ
۱۸	۵۹	۱	دواوین
۹۲	۱۰۱	۱	منظومات
—	۱۱۲	۱۱	ادبیات
—	۳۳	۱	قواعد
—	۴۰	۶	فن فصاحت وغیرہ
—	۲۶	۳	نعت وغیرہ
—	۱۰۱	۴	نصروف
—	۲۸	۴	حساب
—	—	۸	منطق
—	۶	۱	ہندسہ
۳۷	۸۷	۶۱	فقہ و مذہب
—	۱۱۰	۲۱	متفرقات
—	۲۴۰	—	نقل خراہین داستان
—	—	۲	کیمیا

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران
لگ بھگ سارے چودہ سو کتابیں جمع کیں، راقم نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ خطوطات کے موجودہ ناظم
ڈاکٹر حسن امام سے ملاقات کی انہوں نے راقم کو بتایا کہ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی ملازمت کے دوران

۲۲ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۵ ستمبر ۱۹۶۰ء تک لگ بھگ ساڑھے چودہ سو عربی، فارسی اور اردو کی خطوط و مطبوعہ کتابیں جمع کیں چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کی اس شعبہ سے سبکدوشی کے بعد اس شعبہ کے کام میں مزید سست رفتاری آگئی یعنی ۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء تک اس شعبہ میں لگ بھگ ساڑھے تیس سو کتابیں جمع ہوئی ہیں جیسا کہ اس شعبہ کے کٹیلگ کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے یعنی اس طویل مدت کے دوران صرف ساڑھے نو سو کتابوں کو پٹنہ یونیورسٹی کے ناٹوں نے جمع کیں یہ طویل عرصہ لگ بھگ اٹھارہ (۱۸) سال کا ہوتا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم تحقیقی کاموں کے سلسلے میں چھپے ہوئے خزانوں کو حاصل کرنے کے لئے بقول شیخ سعدی "بسیار سفر باید" کے قائل تھے، ہندوستان کی شاید کوئی بھی لائبریری ان کی نظر سے بچ گئی ہو جہاں بلخی صاحب تشریف نہ لے گئے ہوں گے، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن)، رام پور کی لائبریری، کلکتہ کی مشہور و معروف امیر علی لائبریری، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، مرشد آباد، غزیکہ جگہ جگہ بلخی صاحب مرحوم تشریف لے گئے۔ صوبہ بہار میں دسٹہ کا کتب خانہ، گیا شہر میں منوال کی لائبریری، بہار شریف، استھانواں، مظفر پور، بھاگلپور، دربنگہ، پٹنہ، چمپارن، مونگیر وغیرہ جگہوں کی خانقاہوں، صوبہ بہار کے اندر خانقاہ عادیہ پٹنہ سیٹی، حضرت رکن الدین عشق کاکیک، میتن گھاٹ، پھلواڑی شریف، مونگیر، بھاگلپور، میر شریف وغیرہ خانقاہوں کی بھی سیر کی۔ صوبہ بہار کے نوابوں، اربیبوں اور اہل علم حضرات سے گزارش کر کے وہ چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈتے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم تحقیقی و جستجو کے سلسلہ میں جب بھی سفر میں روانہ ہوتے تھے تو ان کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ہم مشرب اور ریسرچ اسکالرز بھی ہوتے تھے، عسکری صاحب بار بار بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ سفروں میں شریک رہے۔ کئی مرتبہ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا صوبہ سے باہر ان کے ساتھ رہے۔ ریسرچ اسکالروں میں ڈاکٹر جانشکر جھا، ڈاکٹر قیام الدین احمد اور جیدو مہرا بھی ان سے قریب رہے۔

اس نوعیت کے دور دراز کے سفر سے بلخی صاحب اپنے وطن واپس آتے تھے تو ان کے

ساتھ بوروں میں بھرے ہوئے کاغذات نوچے کے ٹرنک میں بھرے ہوئے مخطوطات و قلمی کتابیں
اور پرائی مطبوعہ کتابی ہوتی تھیں۔ وہ صوبہ بہار سے باہر یا صوبہ کے اندر ہی اس کام کے لئے جاتے تو
ان کی نگاہ صرف وہاں کے کتب خانوں پر نہیں ہوتی، شہر میں گھوم گھوم کر لوگوں سے اپنے مطلب کی
چیزوں کو حاصل کرتے تھے۔ پتہ ملنے پر اس شخص کے گھر پر فوراً حاضر ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ
شہر کے مشہور کباری کے رنگائے ہوئے ڈھیروں میں گھس جاتے تھے اس عمل میں ان کا ہاتھ پاؤں
اور کپڑا گندہ ہو جاتا تھا کبھی ایسا ہوتا کہ دامنوں پر ان ساری چیزوں کو خرید لیتے اور بوروں میں
بھر کر ان چیزوں کو گھناتے اس کے بعد کام کی چیزیں بہاند کر لیتے اس کے بعد اپنے سفر کی
رپورٹیں لکھ کر دے دے اور اس کی رپورٹ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

تہذیب و تمدن کی تاریخ جلد چہارم

اس کتاب کے مصنف نے پندرہ سو سال سے دو محققین و سٹوڈنٹس و سٹوڈنٹس اور جناب
ایکسپریس نے دونوں حضرات نے تحقیق و جستجو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تاریخی اہمیت رکھنے
والے مادیات کے مختلف حصوں میں گھوم گھوم کر اس کا رہائے رہنے کی چھان بین شروع کی۔

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

ایکسپریس نے اپنی تحقیق کی چھان بین کا نتیجہ اس ملاحظہ فرمائیے

کار آمد تاریخی اور ادبی قدروں کی حامل تھیں۔ بلخی صاحب نے اسکول کی مجلس اختلاص سے کہا کہ ان کتابوں کی حفاظت ہونی چاہئے جو اسکول میں ممکن نہیں لہذا پٹنہ پونیو سیٹی کو یہ کتابیں دی جائیں اور اس کے عوض طلباء کے لئے کاسکد موجودہ علم کی کتابیں حاصل کر لینی چاہئے، فہرست نیچے ملاحظہ ہو۔

(۱) یوسف زلیخا (قلمی) رونڈا نادار شاہ راجہ جنگل کیشور بہ شجاع الدین خاں نوشہ پور۔

(۲) جہانگیر نامہ (قلمی) (۳) مکاتیب غلام ابو صمد افضل محمد کا طبع کیا ہوا (۴) مفتوی کلام (۵) شاہ عالم نامہ (شاہ عالم اول کی گدی نشینی سے لے کر وفات تک کی تاریخ (۶) مہا بھارت (فارسی زبان میں مہا بھارت کا ترجمہ) (۷) عجائب الابدان شیخ عذاری کی عربی فقہوں کا فارسی تشریح ترجمہ صفحہ چار کی تحریریں سب سے بہتہ چلتا ہے کہ اس کی نقل شہنشاہ فرخ میر کے عہد میں ہوئی اور اس کا مترجم حسن الحسینی نام کا کوئی شخص تھا (۸) ظفر نامہ تیموری تیمور کی فتوحات کا حال اس میں دلی مادر میرٹھ کی فتوحات کا حال درج ہے پوری جلد میں لگ بھگ ایک ہزار صفحات ہیں (۹) ظفر نامہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظفر نامہ کی تلخیص ہے (۱۰) فوائد صوفیہ۔ فارس کے صوفی خاندان کی تاریخ اس میں لگ بھگ تین سو برس کے حالات درج ہیں۔ اس مخطوطہ کی نقل ۱۲۱۱ھ میں ہوئی (۱۱) مجموعہ دیوان و قصائد فرحتہ دارٹھار ہوں صدی کا ایک مشہور اردو شاعر۔ اس قلمی نسخہ پر ۸ دسمبر ۱۷۹۲ء کی تاریخ درج ہے (۱۲) دیوان فدوی۔ یہ ایک نایاب قلمی نسخہ ہے (۱۳) دیوان سلطان جان اردھ کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صوبہ بہار میں غدر ۱۸۵۷ء سے ان کا تعلق تھا (۱۴) دیوان منشا مرزا۔ احمد منشا اپنے وقت کے مشہور اردو شاعر تھے اور اب ان کا کلام نایاب ہے (۱۵) شرح شیخ بوعلی (چھ سو برس) سے نامک قدیم قلمی نسخہ جس کی نقل ۱۷۵۳ء میں ہوئی، شیخ بوعلی کا شمار فلسفی اور طبیب میں ہے (۱۶) بیتال بچپسی۔ ہندی میں قصہ کہانی کی مشہور کتاب کا فارسی ترجمہ (۱۷) طوطا کہانی شاہ جہاں آباد (دہلی) کے حیدر بخش کی تصنیف (۱۸) مرآۃ الخیال ایک نایاب قلمی نسخہ جس کی نقل ۱۲۲۹ھ میں ہوئی اس میں چار سو چوک (۴۵۴) صفحات ہیں۔ یہ کتاب موسیقی اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے (۱۹) لطائف الطائف فارسی یہ مخطوطہ اب نایاب ہے (۲۰) تحفۃ السالکین۔ صوفیوں اور فقہروں کی سوانح پر

رہنی جس کی نقل ۱۱۲۱ھ میں ہوئی (۲۲) معجزات مرتضویہ پیغمبر اسلام کے جانشینوں کے معجزوں کا حال جس کے بارے میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ نایاب ہے (۲۳) مجمع الصناع ندی میں محمد سازی کے طریقہ پر ایک قلمی نسخہ یہ کتاب نظام الدین احمد بن صالح انجینی کی لکھی ہوئی ہے (۲۴) رسالہ صرف و نحو ترکی فارسی قرلباش اور دینی زبان لکھی ہوئی گرامر خستہ حالت میں ہے لیکن مفید اور نایاب ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں بلخی صاحب مرحوم نے گیا اور بھاگلپور کا بھی دورہ کیا اور کئی ایسے اشخاص سے بھی ملاقاتیں کیں جن کے پاس قلمی نسخے یا مخطوطے تھے اورنگ آباد سب ڈویژن میں انہیں معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کے پہلے گورنر برائے صوبہ بہار نواب داؤد خاں کے خاندان والوں کے پاس کچھ نہایت ہی اہم فرامین ہیں، بلخی صاحب مرحوم ان فرامین کی نقل لینے کامیاب ہو گئے، یہ فرامین مختلف ادوار سے تعلق رکھتے تھے جن کی مجموعی تعداد آٹھ تھی، اورنگ آباد سے گیارہ میل پچم کی طرف سری سانام کی جگہ میں ایک کتبہ ۱۰۷۰ھ کی نقل انہوں نے حاصل کی، یہ کتبہ درمیان دروازہ کی مسجد میں لگے ہوئے ایک پتھر پر ہے اور کہا جاتا ہے کہ نواب قمر خاں کی عملداری کے زمانہ میں اس کی تعمیر ہوئی تھی، بلخی صاحب مرحوم نے یہ دریافت کیا کہ ۱۰۷۰ھ سے تعلق رکھنے والا یہ کون سا حکم تھا، بلخی صاحب مرحوم نے کئی لوگوں سے ملاقات کی اور یہ پتہ چلا کہ قلمی نسخے بد قسمتی سے سب ضائع ہو گئے، رہولی کے ایک شاہ صاحب کے پاس یہ موجود تھے جو کوڑا مار گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا، مہینہ کے آخر تک بلخی صاحب مرحوم رہے، کئی لوگوں سے ملاقات کی شاہ محمد فائق نامی ایک شخص کے یہاں کچھ دنوں تک رہے لیکن کوئی فرمان یا مخطوطہ نہیں ملا، شاہ صاحب نے کچھ تحریریں اور صوفیوں کی دکھلائیں جن کے خاندان سے وہ تھے۔

درگاہ شہباز صاحب میں انہوں نے ایک کتبہ دیکھا جو بنگالہ کے حسین شاہ سے تعلق رکھتا تھا اور ۱۲ رجب ۱۰۹۵ھ کا تھا، یہ کتبہ درگاہ کے باہری دروازہ کی دہلیز پر ہے اس کے پڑھنے کے لئے ایک میٹر بھی کی ضرورت پڑی اور مزدوروں سے کتبہ کی صفائی کرائی، یہ درگاہ سلاچک میں ہے، بھاگلپور میں بلخی صاحب نے چند مثالی فرامین دیکھے۔ یہ فرامین محلہ خلیفہ باغ

کے جناب سید شاہ فخر عالم کے پاس تھے۔ سب سے پرانا صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والا فرمان
شہنشاہ اکبر کے وقت کا تھا اس پر خمان جہاں حسین قلی خاں کی مہر لگی ہوئی تھی جس نے بہار
اور بنگال کے خود سر بادشاہ داؤد قریشی کو قتل کیا تھا۔ فرمان پر تاریخ ۸۲۰ھ ۱۵۰۷ء لکھی
ہے، دوسرے فرمان پر اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کی مہر ہے، ایک دم سرے پر دوسو بیگیہ
زمین بطور امداد معاش سید امان اللہ عرف پیر دریا کو دیئے جاتے کا حکم ہے، اس پر ۱۰۹۲ھ
کی تاریخ ہے جو اورنگ زیب کی حکومت کا چوبیسواں برس تھا۔ تیسرا فرمان محمد شاہ کے وقت
کا ہے اس پر مہر عسکر خاں کی ہے ۱۱۳۱ھ کا یہ فرمان ہے۔ اس سنہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
ایک سید سلطان احمد نامی شخص نے فریاد کی تھی کہ دس برس کے اندر بارہ سو گھوڑے دو بیویوں کی
مالگداری کو بڑھا کر آٹھ ہزار کر دیا گیا ہے چنانچہ اسے گھاٹ کر بیالیں سو پچاس روپے کر دیئے
گئے۔

ستمبر کے مہینہ میں بلخی صاحب نے آہ سہرام کا دورہ کر کے محمد سید اطہار احسن آروی سے
ملاقات کی جنہوں نے ایک بہت پرانا مخطوطہ دکھایا، خستہ حالت میں یہ ایک ضخیم جلد تھی۔ شروع
اور آخر میں بہت ساری نظمیں اور کہانیاں تھیں، مخطوطہ کی مکمل چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ سچ کے
حصہ میں نظام الملک کا شہنشاہ محمد شاہ کے نام ایک خط تھا اور ساتھ ساتھ صوبہ داری بنگال کا
تقریری کا پرانہ ملازمت بھی تھا۔ کچھ حصے ضائع ہو چکے تھے ان پر سادہ کاغذات لگا دیئے گئے تھے
یہ ۱۱۳۰ھ کا ہے اس کی نقل مالک کی اجازت سے کر حاصل کر لی گئی ہے۔

سہرام میں بلخی صاحب مرحوم نے مولانا حکیم فخر احسن صاحب کے پاس ایک قلمی
دیوان بندت چند بھائی برہمن کا دیکھا یہ دیوان نامکمل تھا۔ اس لئے کہ ردیف ذہن کی
غزلیں اس میں تھیں اور ردیف 'ی' تک یہ دیوان نامکمل تھا، چند بھائی شاہ جہاں کے دربار میں
مستند تھا اور اس کا کام شاہی فرامین اور مسودوں کو جانچنا اور درست کرنا تھا، بلخی صاحب نے
مخطوطات کے اوراق پر لکھاں بھی دیکھے اور انہیں درست کرنے پر انہوں نے شاہ جہاں کے بیٹوں
میں گدی کے لئے خانہ جنگی کی تاریخ مرتب کی، بد قسمتی سے شروع کے ستر صفحات غائب تھے۔

ان چیزوں کے مالک نے گمشدہ اوراق کو تلاش کر کے دکھانے کا وعدہ کیا۔

دوسرے مخطوطات میں چھ سو سے پرانا مشکوٰۃ شریف کا ایک قلمی نسخہ ملا۔ عربی میں منطق پر بروائی کا ۱۰۳۳ھ کا مرتب کردہ نسخہ تھا یہ نسخہ اس اعتبار سے کام کا تھا کہ مشہور مصور شیخ عنایت اللہ کی بنائی ہوئی ۱۸۵۱ تصویریں تھیں، مغل آرٹ کے یہ اچھے نمونے تھے۔ اس کتاب کے مالک سید حبیب اللہ معرفت سید مبارک حسین ساکن پائی گلی پٹنہ سیما تھے۔ اس کے دوسرے صفحہ پر مصور عنایت اللہ لکھنا ہے کہ ۱۰۸۱ھ ۱۶۷۱ء میں فن مصوری شروع کیا، آخری ورق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۴۸ برسوں میں اس نے اس کام کو ختم کیا، اکتوبر ۱۹۲۷ء میں بلنجی صاحب اسلام پور ضلع پٹنہ لکھنیاں ضلع مونگیر اور داؤد نگر ضلع گیا تشریف لے گئے۔ لکھنیاں اور باری سلیا میں ذاتی کتب خانوں کو دیکھنے کا موقع ملا، پہلی جگہ انہیں مکاتیب غلامی ابوالفضل اور وقائع نعمت خاں اورنگ زیب کی تین برسوں کی دکنی مہم اور حکومت کا حال معیار ایک نہایت ہی وقیع مخطوطہ قرآن حکیم کا چھ سو برسوں کا پرانا ملا یہ مخطوطے پروفیسر کلیم الرحمن مرحوم کے کتب خانے میں ملے۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں وہ گیا تشریف لے گئے۔ وہاں سے انہوں نے آٹھ قیمتی خراہیں کی نقلیں حاصل کیں جو داؤد نگر کے نواب داد خاں کے وارث محمد صادق خاں کے پاس تھے، ان میں سے ایک فرمان ۱۰۶۷ھ کا شاہزادہ دارا شکوہ کا تھا دوسرا فرمان ۱۰۶۹ھ کا اورنگ زیب کا تھا، اورنگ زیب کی اڑتالیس برس کی حکومت کی نشاندہی کرتا تھا، چوتھا فرمان ۱۰۷۵ھ کا فرخ سیر کا تھا، پانچواں ۱۱۳۵ھ کا محمد شاہ کا تھا چھٹا بھی ۱۱۵۳ کا محمد شاہ کا تھا، ساتواں ۱۱۷۲ھ شاہ عالم ثانی کا تھا۔

نومبر کے اواخر میں بلنجی صاحب نے آرہ اور گیا کا دورہ کیا، یہ دورہ زیادہ امید افزا نہیں ثابت ہوا لیکن شاہ اظہار کے بھائی شاہ شرف الدین نے پٹنہ میں سمجھ پرائے کا غذات دکھانے کا بالکل وعدہ کیا۔

دسمبر کے مہینہ میں بلنجی صاحب مرحوم نے شیخپورہ، چوارہ، امرتھ اور جموں یعنی مونگیر ضلع کا دورہ کیا، حسین آباد کے نواب کے ذاتی کتب خانہ کی اجازت سید صابر حسین سے حاصل کی،

شیخپورہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر انہوں نے شاہ عالم کی نواسی گیتی آرہ کا مقبرہ دیکھا، اس قبر کے کتبہ کو پڑھا شاہ یتیم اللہ اور اس کے شوہر شجاع الدین رضوی کی قبر بھی دیکھی، تینوں کتبوں پر ۱۲۲۲ھ ۱۲۲۳ھ اور ۱۲۵۶ھ کی تاریخ ہے۔ وہاں ملنی صاحب نے ایک خاص کتب خانہ بھی دیکھا لیکن کوئی خاص کام کا حوالہ دستیاب نہیں ہوا، ایک طالب علم محمد علی احمد کی مدد سے انہوں نے اورنگ زیب کے عہد کے ایک فرمان کی نقل حاصل کی جس پر امین خاں بیگ بہادر کی ہر تھی، موضع امرتھ میں انہوں نے شاہ سید احمد غازی کی درگاہ بھی دیکھی، سید عبد المجیب ایک پٹن یافتہ پولس افسر اور گاؤں کے دوسرے لوگوں نے کہا کہ ان لوگوں کے پاس مخطوطات کافی تھے لیکن کیرٹوں نے چاٹ کر ختم کر دیا۔

جموں میں ملنی صاحب مرحوم کو یہ خبر ملی کہ تواریخی اسناد راجہ گدھور کے پاس کافی ہیں، مختصر یہ کہ دسمبر ۱۹۴۷ء تک چار ماہ تین ہفتوں کی جدوجہد میں انہوں نے سیکڑوں مخطوطات کا معائنہ کیا، پٹنہ، آرہ، مونگیر، بھاگلپور کے اضلاع میں کیا اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں قیمتی مخطوطات کو محفوظ کر لیا جائے تاکہ مختلف ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ چیز کارآمد ہو، درجنوں شاہی فرامین کی نقلیں، اسناد اور چار نہایت ہی اہم فارسی کے کتبات حاصل کئے۔

ملنی صاحب نے یونیورسٹی میں یہ بھی رپورٹ پیش کی کہ ان فرامین، اسناد، تلمی کتابوں اور دیگر مخطوطات کے علاوہ انہوں نے کافی تعداد میں کتبوں کا بھی معائنہ کیا ہے جن سے تیرہ صدی ہجری اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے شہنشاہوں، بادشاہوں اور صوبہ داروں کی واقفیت ہوتی ہے جن کا تعلق صوبہ بہار کی تاریخ کے مختلف عہدوں سے ہوتا ہے ان پر طویل مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔ بہار میں مسلمانوں کی چھ سو برسوں کی حکومت کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم ہوں گی۔

Annual report of the regional records

Survey Committee by Dr K.K. Dutta 1950-51

کی فائل دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملنی صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات

میں کتنی نادر اور نایاب کتابیں جمع تھیں، موصوف کی جمع شدہ کتابوں کو درج ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔
ملحق صاحب مرحوم کی حاصل شدہ فارسی مخطوطات یہ ہیں :

(۱) مجموعۃ الانشا مصنفہ منشی محمد صادق بن مظفر حسین، مصنف رحمت خاں ناظم بنگال کے
یہاں لگ بھگ بیس سال دیوان رہا، شاہی فرمان کو لکھا کرتا تھا، اس کتاب میں بہت سی نادر کتابوں
اور تاریخی حوالے بھی درج کئے ہیں ساتھ ہی ساتھ تاریخی مقاموں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نے رحمت
خاں ناظم بنگال کی وفات ۱۲۴۷ھ کے بعد لاہور بود و باش اختیار کیا جہاں اس نے یہ کتاب لکھنی شروع
کی۔

(۲) مخطوطات حکیم قاسم الدین - حکیم قاسم الدین نے دیوان راج کمار سنگھ کے یہاں لگ بھگ
۲۰ سال کی ملازمت کی۔ ان کے آباد اجداد ہندوستان میں مسلمانوں کے ادا مل حکومت کے درمیان آئے
جہاں ڈبیا نامی گاؤں ضلع پٹنہ میں بود و باش اختیار کر لی۔

(۳) مکتوبات مرزا قلیل تلمیذ خواجہ (۴) مکتوبات عبدالرحیم
خانخانا شہنشاہ اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اس مکتوبات میں گورکھپور کے نظامت حکومت کا
حال ملتا ہے۔

(۵) تاریخ مرآۃ العام مصنفہ بختیار خاں۔ اس تاریخی کتاب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی
ادامل حکومت سے لے کر شہنشاہ اورنگ زیب تک کے حالات ملتے ہیں۔

(۶) خلاصۃ التواریخ مصنفہ سجن سنگھ۔ اس تصنیف میں ہندوستان کے ابتدائی تاریخی حالات
سے لے کر شہنشاہ شاہجہاں کی زندگی کے آخری حالات اور اس کے فرزندوں کے مابین گدی کی جنگ
تک کے حالات ملتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے نادر تاریخی حالات ملتے ہیں۔

*Annual report of the regional survey committee
by K. K. Dutta 1951-52*

کی رپورٹ کے مطابق ملحق صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسٹی شعبہ مخطوطات میں مندرجہ ذیل کتابیں جمع
کیں۔ ڈاکٹر کے کہتا لکھتے ہیں کہ میں بہت شکر گزار ہوں کہ جناب ایف بی اور جناب پروفیسر

سیاحین عسکری کی کوششوں سے مندرجہ ذیل فارسی کے مخطوطات شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی میں درج ہوئے۔

(۱) قاسم میخ: تذکرہ نیموی بزبان فارسی مصنفہ شہنشاہ تیمور ترجمہ بزبان ترکی، تاریخ نوشتہ درج نہیں، خط نستعلیق کی تحریر ہے سائز ۱۰ × ۱۶ - ۳۷۸ صفحات پر مشتمل ہے موضوع اس تاریخ میں شہنشاہ تیمور کے حالات ملتے ہیں۔

(۲) قاسم میخ: تذکرہ السلاطین جلد دوم بزبان فارسی، تاریخ نوشتہ درج نہیں، خط نستعلیق میں لکھی ہوئی سائز ۱۰ × ۱۶ - ۵۲۱ صفحات، موضوع اس کتاب میں شہنشاہ شاہجہاں اور شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت کے حالات ملتے ہیں۔

(۳) قاسم میخ: خلاصۃ الاحوال بزبان فارسی مصنفہ منشی آثر م سید احمد علی لکھی گئی، خط نستعلیق کی تحریر ہے سائز ۵ ۱/۲ × ۹ ۱/۲ - ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے، موضوع اس کتاب میں ہندوستان کی ابتدائی تاریخی حالات سے لے کر شاہ عالم ثانی تک کے حالات ملتے ہیں۔

(۴) تاریخ عماد السعادات بزبان فارسی مصنفہ غلام علی نقوی ۱۲۶۹ھ میں لکھی گئی ہے خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہے سائز ۱۰ × ۷ - ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، موضوع اس کتاب میں اودھ کے نواب سعادت خاں کی حکومت کے حالات ملتے ہیں۔

(۵) تاریخ عالم آرائے عباسی جلد دوم بزبان فارسی، تاریخ تحریر درج نہیں، خط نستعلیق کا بہتر نمونہ ہے، سائز ۱۲ × ۸ - ۴۰۳ صفحات، اس کتاب میں فارسی شہنشاہ عباسی کے دور کے حکومت کے حالات اور کارنامے اور فارس کے ہمسایہ ممالک کے بھی حالات ملتے ہیں (۶) تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ششم بزبان فارسی، تاریخ تحریر درج نہیں، سائز ۱۲ × ۸ - ۴۶۸ صفحات خط نستعلیق میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں بھی مذکورہ بالا حالات ملتے ہیں (۷) مکتوبات خلاصۃ الانشاء بزبان فارسی مصنفہ لکھی رام پنڈت دیدی سکاٹ لاء میں مکمل ہوئی، خط نستعلیق میں لکھی گئی، سائز ۱۰ ۱/۲ × ۱۰ ۱/۲ - ۷۰ صفحات، کتاب کا پہلا صفحہ تلف شدہ ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے ۱۲۵۵ھ - ۱۲۵۶ھ کے زمانہ میں ۲۲۵ یعنی لک بھگ ڈھائی سونادر

مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں جمع کیں، چند نادر مخطوطات بھی ذیل میں ہیں:

- (۱) تحفۃ الانشاء مصنف عبدالحسن ۱۰۴۶ھ۔ دکنی اردو کا ایک نادر نمونہ ہے۔
- (۲) سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم بزبان اردو ۱۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے جس پر علامہ شبلی نعمانی کا مقدمہ ہے یہ کتاب عربی زبان سے موازنہ اور تصحیح کے بعد مرتب کی گئی ہے (۳) دیوان ولی دکنی مرقومہ ۱۱۴۶ھ یہ دیوان ولی دکنی کا سب سے پرانا نسخہ ہے (۴) طوطا کہانی مصنف حیدر بخش حیدری مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۵) قصہ گل بکاؤلی مصنف نہال چند مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۶) بہشت بہشت مصنف محمد باقر آغا الاری مرقومہ ۱۲۶۲ھ، یہ مخطوطہ حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ سے بھی بہتر نسخہ ہے
- (۷) اخوان الصوفی کا غیر مطبوعہ ترجمہ مرقومہ ۱۲۸۱ھ (۸) سلاست الرسل مرقومہ ۱۲۸۳ھ اس کتاب میں علم رسل کے موضوع پر بحث کی گئی ہے (۹) تکمیل الایمان مصنف عبدالحق دہلوی مرقومہ ۱۲۹۸ھ
- اس کتاب میں ہندوستان میں تحریک دیوبند کے مفصل حالات ملتے ہیں (۱۰) طوطی نامہ مصنف ضیاء نقشبندی (۱۱) شہادت المرجان مصنف آزاد بلگرامی مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۱۲) خطوط ٹیپو سلطان اس مکتوبات کے مجموعہ میں ٹیپو سلطان کے اہم تاریخی خطوط میں جو مورخوں کے لئے بہت ہی کارآمد ہیں (۱۳) طبقات اکبری مصنف نظام الدین احمد یہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں لکھی جانے والی ایک اہم اور مشہور تاریخی کتاب ہے (۱۴) آصف الشرف مصنف نصیر الدین طوسی (۱۵) فرخ سپہر (۱۶) مشنوی جو ہر ذات مرقومہ ۱۲۶۱ھ عطار کی مشنوی کا ایک مشہور اور قدیم نسخہ (۱۷) ملفوظات مختیار کاکی مرقومہ ۱۱۹۴ھ (۱۸) کلیات النوری (۱۹) روزنامہ سفر سالار جنگ مرقومہ ۱۲۹۳ھ بزبان فارسی (۲۰) کیمیائے بنالیق عربی زبان میں فن کیمیا کے موضوع پر ایک نادر مخطوطہ (۲۱) معرفت النظم عربی زبان میں نظام شمسی کے موضوع پر ایک نادر مخطوطہ۔
- بلخی صاحب مرحوم کو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۵۶ء میں تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں نیاپال بھیجا۔ اس سفر میں بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ کئی حضرات گئے، پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے اس خط کی نقل کو پیش کیا جاتا ہے جس کو انہوں نے بلخی صاحب مرحوم کے نام لکھا تھا۔

122

From

Sri J. Sahay M.A.T.D (London)
Registrar Patna University
PATNA-5

(1) To

Dr. K. K. Dutta

Dean Faculty of Arts

Patna University, PATNA

(2) Dr. A. S. Altekar

Head of the Depts of
Ancient Indian History
and Culture Patna University

PATNA

No. G/18845-46 Patna

Dated 5th October 1956

Subject: Sending of research party to
Nepal.

Sir,

With reference to your letter No(1)183 dated
20th of August 1956 (2) 445 ALHLC dated the 11th
of August 1956 on the subject noted above. I am
directed to send herewith a scheme for sending
of a research party to Nepal as approved by the

syndicate at its meeting held on 22nd of September 1956.

I have to request you kindly to draw up accordingly a programme for sending the party to Nepal in consultation with Dr. A. S. Altekor / Dr K. K. Dutta and send the same to me immediately for taking necessary action in the matter so that the party may proceed during the Puja vacation.

A copy of this letter is being sent to the other members of the research party for their present information.

Yours faithfully
Sd/ J. Sahay
Registrar.

Memo No G/18847-53

Patna the 5th October 1956

Copy along with Copy of the enclosure forwarded to:-

- (1) D. Dr. B. P. Sinha Head of Dept. of Ancient Indian History and Culture, Patna University Patna
- (2) Prof. S. H. Askary Patna College.

(3) Dr. R. S. Sharma Dept. of History Patna University.

(4) Dr. V. P. Upadhyay Asst. Director of Sanskrit
Education, Patna.

(5) Pandit V. L. Shastri Research Asst. Patna University.

(6) Shri F. Balkhi Research Asst. Patna University Patna.

(7) The Budget Account Officer Patna University
in duplicate for information and necessary
action.

Encl

R.H.S. 1 10/56

J. Sahay
Registrar.

ملک نیپال اپنے تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ہندوستان سے مماثلت رکھتا ہے۔
پٹنہ یونیورسٹی کے حکم کے مطابق بلخی صاحب مرحوم نے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں ۸ نومبر ۱۹۵۳ء کو
نیپال کا دورہ کیا، پٹنہ یونیورسٹی کی یہ پہلی ٹیم جو اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں نیپال گئی اس گروپ
کے شرکار میں پروفیسر مدین عسکری، ڈاکٹر آر. اس. شرما، شری جگدیو شرما اور بلخی صاحب مرحوم نے
ملک نیپال کے موجودہ دارالسلطنت کا ٹھمنڈو بلکہ مضافات، قصبات پائن اور بڑہ گاؤں کا بھی دورہ کیا۔
بلخی صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کے لئے لگ بھگ ۲۰۰ درجن عربی،
فارسی اور اردو کے نادر مخطوطات فراہم کئے۔

نیپال کی بیہ لائبریری اور کیسیر لائبریری میں اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات دستیاب
نہیں ہوئے لیکن نیپالی میوزیم میں عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات پائے گئے جو علم نجوم و رن اور
دیگر ادبی موضوعات پر تھے اور آخری الذکر کا تعلق فارسی کی تصنیفات سے تھا اور آدھے کا تعلق
دیوناگری رسم الخط سے ہے۔ اردو میں ترجمہ ادبیہ ساری کتابوں کا معائنہ میوزیم کے اعلیٰ حکام کی اجازت کے

بعد کیا گیا۔

آخر کار بانی صاحب مرحوم نے نیپالی مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا جو کثیر سی نزاد تھے جن کے سعی سے لگ بھگ ایک درجن مخطوطات کا معائنہ کتب خانہ دارالمطالعوں میں کیا جو اندھا چوک کے پاس ہے اور اٹھارہ عدد مخطوطات جناب خواجہ حسن شاہ کے دولتکدہ بارغ بازار میں۔ بانی صاحب مرحوم کو یہ بھی خبر ملی کہ نیپالی مسلمانوں کے پاس کافی تعداد میں فارسی کے مخطوطات ان کے ذاتی گھر میں موجود ہیں جن کو حکیم حسن شاہ نے اپنی نزادوں سے دیکھا۔ فارسی کے مختلف مخطوطات جن کو بانی صاحب مرحوم نے معائنہ کیا ان کی تفصیل یہ ہے :

مخطوطات دارالمطالعوں اندھا چوک جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہے

- (۱) قواعد التاریخ مصنف طفیل اللہ (۲) مفتاح العلم مصنف محمد حیات ان مخطوطات کے اواخر میں اردو میں اہم جنسیات کی اطلاع ملتی ہے (۳) نزک تیموری مصنف شاہ تیمور مرقوم ۱۲۲۲ھ (۴) مکانیب علامہ ابو الفضل علی ہشتیجا عبد الصمد افضل سال مرقوم درج نہیں لیکن یہ لگ بھگ دو سو سال پرانا نسخہ ہے (۵) مراقب المجاہدین مرقوم ۱۲۲۲ھ اس مخطوط کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس کتاب میں اسلامی فلسفہ سے بحث کی گئی ہے (۶) تاریخ بنگالہ مرقوم ۸۱۲ھ اس تاریخ میں شہنشاہ اورنگ زیب سے لے کر نواب علی قلی خان ناظم بنگالہ اور سراج الدولہ کی شہادت کے حالات ملتے ہیں، یہ ایک نادر نسخہ ہے، اس مخطوط کے چند ہی نسخے موجود ہیں جن میں برٹش میوزیم اور حیدرآباد اسٹیٹ لائبریری قابل ذکر ہیں اس کے مصنف سلیم اللہ ہیں، موجودہ نسخہ کے نقل نویس راج محل کے گویال لال ہیں جو باشندہ ہنگلی کے ہیں (۷) بادشاہ نامہ اس تاریخ میں شہنشاہ شاہ جہاں کے دور حکومت ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۷ء تک کے حالات ملتے ہیں اس کا پہلا اور آخری صفحہ غائب ہے (۸) جواہر التفسیر قرآن حکیم کی تفسیر ہے یہ نہایت ہی قدیم اور اہم مخطوط ہے اور پرانی نسخہ کی جہر بھی ہے۔ اس نسخہ کی نمائش پانچ موقعوں پر ہندوستان کے سلاطین کے سامنے کی گئی اور یہ مخطوط ۱۷۹۷ء میں شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں مکمل ہوا (۹) دیوان شوکت فارسی اویس کے مشہور شاعر شوکت کے مختلف اصناف شاعری پر مشتمل ہے اس کے مرتب التفات خان ہیں جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھے یہ نسخہ ۱۱۸۲ھ میں مرتب ہوا (۱۰) سکندر نامہ مصنف نظامی گنجوی مرقوم ۱۲۵۹ھ

جناب حکیم حسن شاہ محلہ باغ بازار کا ٹھنڈو کے ذاتی کتب خانہ میں فراہم شدہ مخطوطات

(۱) انیس ابیہ شقین ایک پرانا اور نادر مخطوطہ جس میں تصوف کے رموز و نکات پر بحث کی گئی ہے۔

یہ مخطوطہ ۱۰۲۵ھ میں مرتب ہوا جو شہنشاہ جہانگیر کا آخری عہد حکومت تھا (۲) شرح خلاصۃ النسخ مرتبہ عبدالعزیز ظاہر ایک قدیم مخطوطہ اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ (۳) بیاض و اثاق مرقومہ ۱۲۱۵ھ ایک نادر مخطوطہ جس میں شاعر کے فارسی اور اردو کے کلام ہیں۔ اس کے علاوہ ٹھکریاں، سوجھان اور کلاسیکی گیت ہیں جو ہندی اور اردو میں ہیں۔ (۴)

(۵) ایک نادر مخطوطہ جس میں لکھنؤ کے طریقی بتائے گئے ہیں جس کے اول اور آخر کے صفحات غائب ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خستہ حالت میں موجود ہے (۶) کنز الدقیق مرتبہ شمس الدین محمد بن حمید یہ مخطوطہ شہنشاہ اورنگ زیب کے بیست سالہ عہد حکومت میں مرتب ہوا اس میں مذہبی فلسفہ کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، مؤلف نے سلطنت منلیہ کے مختلف شہنشاہوں کے عہد حکومت کے حالات لکھے ہیں (۷) اصل المعرفت مرقومہ ۱۲۱۱ھ ایک نادر مخطوطہ ہے جس کا پہلا صفحہ غائب ہے اس مخطوطہ میں کئی دیگر مخطوطات بھی شامل ہیں جن میں قنات و عشرت مارینی جو مختلف تاریخی واقعات کو ظاہر کرتے ہیں اور مطالبہ رشیدی جس میں صوفی طریقت شاہ شہاب تراب علی ابن محمد کاظم قلندر کے ہیں (۸) شرح شری مولانا اردم از پیرینہ اللہ ابن عبدالفتح حسین ایک مشہور صوفی کی تالیف ہے جو مکمل مفصل اور قابل تحسین ہے (۹) سلامۃ الذیاب مرقومہ ایک قدیم مخطوطہ جس میں اسلامی فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے (۱۰) انشاز فائز مکتوبات تحریر کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں اس کو ثواب میر قاسم نے اپنے بچے کی تعلیم کے لئے سنہ ۱۰۹۳ھ میں لکھا تھا (۱۱) بیاض منجمیہ یا مخطوطات خواجہ سید عظیم الدین بدخشان، اس بیاض پر جیس قدر ابن آخری تاجدار اور دودا جد علی شاہ نے اپنی جائداد کو جو بیجا ہے اس کی تین مختلف روداؤں اس میں ملتی ہیں (۱۲) تاریخ حسن عبدالرسول غرہوا جلد اول، یہ کشمیر کی تاریخ ہے جس میں فصل حالات ملتے ہیں یہ فارسی زبان میں ہے جو سنہ ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہوا، مؤلف نے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں مختلف ذرائع کا سہارا لیا ہے جس میں لگ بھگ ۳۰ کتابوں کے حوالے ہیں (۱۳) شرح سولے یک بحر کہ مؤلف قاضی شہاب الدین مخطوطہ مرقومہ ۱۲۱۶ھ اس میں اسلامی تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے (۱۴) رسالہ وحیہ الحفظ مرتبہ لطف اللہ مخطوطہ مرقومہ ۱۲۲۲ھ

(۱۵) کتاب ادا کے عبادت کی۔

چنانچہ مذکورہ بالا کتابوں کی جو تحقیق بلخی صاحب مرحوم نے کی وہ عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات تھے جن کا معائنہ بلخی صاحب نے کاٹمنڈو نیپال میں کیا جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جیسے مکتوبات فلسفہ، تصوف، شاعری، مذہب، عام موضوع، سوانح اور مخطوطات وغیرہ۔

بلخی صاحب مرحوم ۱۹۵۸ء میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر قیام الدین کے ہمراہ بھاگلپور تحقیقی کاموں کے سلسلے میں تشریف لے گئے جہاں انہوں نے چند نادریہ مخطوطات اور سکوں کا معائنہ کیا۔ اس کے علاوہ بھاگلپور کے مضافات کے بھی مکتوبات کا دورہ کیا جہاں انہیں اپنے کام کی چیزیں دریافت ہوئیں، طوالت کے پیش نظر اس کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن کا انیسواں سالانہ اجلاس پٹنہ میں ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوا تھا چنانچہ ادارہ کی طرف سے مخطوطات اور سکوں کی نمائش بھی ہوئی تھی چنانچہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات سے چند نادریہ فارسی اور عربی کے مخطوطات کی نمائش کی تفصیل یہ ہے :

- (۱) مشنری گوہر جوہری مصنفہ شاہ آیت اللہ جوہری۔ واحد نادریہ قلمی نسخہ مرقومہ ۱۱۶۱ھ (۲) تاریخ مہابت جنگ مصنفہ یوسف علی (علی وردی) کے عہد حکومت کے حالات ہیں اس کے چند ہی قلمی نسخے موجود ہیں۔
- (۳) مظفر نامہ مصنفہ کرم علی خاں صوبہ بہار، بنگال، بہار اور اڑیسہ کی نگار تاریخ ہے۔ اس مخطوطہ میں اٹھارہویں صدی کے آخری چوتھائی کے حالات ملتے ہیں اس کے بھی چند ہی نسخے موجود ہیں (۴) تذکرہ گلزار ابراہیم مصنفہ ذاب علی ابراہیم خاں خلیل اس میں اٹھارہویں صدی تک کے شعرا کے حالات ملتے ہیں (۵) دیوان شاد آں حیدر آباد کے راجہ چند دلال شاد آں کی شعری تخلیق ہے (۶) سفر نامہ ابن بطوطہ جلد ۲ کا اردو ترجمہ سنہ ۱۱۶۱ھ بالکل صحیح ترجمہ ہے (۷) شرح دیوان حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ (۸) مشنری تحفہ النساء مرقومہ سنہ ۱۱۶۱ھ مولویں صدی کے دکنی اردو کا ایک نادر نسخہ (۹) مہشت بہشت مصنفہ محمد باقر آغا باسنندہ مرقومہ کمال نسخہ ہے۔ اس کے سہرے حاشیے پر کچھ نوٹس ہیں (۱۰) احوال نادر شاہ کی رضا مصنفہ راجہ جنگل کتور یہ شجاع الدین محمد خاں نوشیہ نادر شاہ کے دکنی پر عمل کے دوران میں شاید میں (۱۱) مراد الملک مصنفہ تاج الدین غوثی (۱۲) شرح رُخ صادق مرقومہ ۹۵۵ھ

علم نجوم کے موضوع پر فارسی زبان میں نادر کتاب ہے (۱۳) دیباچہ ربیعان حافظ مصنف غلام کشمیر از
 (۱۴) کیمیائے بسلیقہ ایک قیم مخطوطہ علم کیمیا کے موضوع پر ہے (۱۵) معرفت اطل عربی زبان میں ایک
 نادر نسخہ ہے جس میں زحل شمسی اور نظام قمری کا ذکر ہے (۱۶) شمس العلوم و لطیف العارفین عربی زبان میں
 نادر نسخہ ہے (۱۷) الاشہدی و نصیف العارف ایک نادر مخطوطہ (۱۸) حاشیہ کتاب حیات قاضی رومی نادر
 مخطوطہ (۱۹) روزۃ المشبہ مصنفہ ولی مرقومہ ۱۱۳۰ھ یہ شاعر اردو کے مشہور شاعر ولی دکنی کے عصر
 کا ہے۔

مذکورہ بالا اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات جن کی نمائش انڈین ہسٹوریکل سائنسز کے
 سیشنوں اجلاس میں کی گئی یہ سب بلخی صاحب مرحوم کی سعی کی بدولت حاصل کی گئیں۔
 مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کی جب ہم تحقیق نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ بلخی
 صاحب نے فن تحقیق کا ایمانداری سے ثبوت پیش کیا ہے اور یہی خوبی اردو کے محققوں میں ڈاکٹر
 عبدالحی محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی ادیب اور قاضی عبدالودود جیسے مشہور محققوں کے
 یہاں نظر آتی ہے یہ اور بات ہے کہ صوبہ بہار میں رہنے کے سبب ان کی شہرت زیادہ نہ ہو سکی جس کے
 مستحق تھے۔

باب ہفتم

فصح الدین بلخی مرحوم بہ حیثیت تذکرہ نگار

اُردو ادب میں تذکرہ نگاری کی ابتدا فارسی تذکروں کی تقلید میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے اردو کے قدیم تذکروں کی زبان فارسی تھی یہاں تک کہ اردو کا سب سے مشہور اور مستند تذکرہ نکات الشعراء بھی فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اس کا عظیم ثبوت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کے تذکرہ "آب حیات" سے قبل جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان کی زبان فارسی ہے۔

فارسی ادب میں تذکرہ نگاری کی ابتدا آغاز اسلام کے کسی سو سال بعد ہوئی۔ معاویہؓ اہل بیت الصدوق و آیت السرد کے بیان کے مطابق چھٹی صدی ہجری کے وسط میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر شعرا کے کلام کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، تذکرے کی حیثیت سے جس تذکرہ کا نام لیا جاسکتا ہے وہ نذر الدین محمد عونی کا لباب الالباب ہے، لباب الالباب سے قبل بھی بعض ایسی تصنیفات ہیں جن میں فارسی شاعری اور فارسی شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) مناقب الشعراء

(۲) مجمع التوارد

باب الالباب ہی فارسی کا پہلا تذکرہ ہے اور اردو تذکرہ برادکن۔ نہ صحیح لکھا ہے عزت اس کتاب باب الالباب دریں است کہ دریں فن تقریباً یادگار و حید است فارسی کا پہلا تذکرہ لباب الالباب ۹۱۸ھ اور ۱۸۱۸ء کے درمیان تکمیل کو پہنچا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے فارسی تذکروں از زبان کی اہمیت کو دو خاص گروہ میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) عام تذکرے یعنی ایسے تذکرے جن میں فارسی شاعری کے آغاز سے لے کر معاصرین تک کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً تذکرۃ الشعراء خلاصہ اشعار، خزینہ گنج الہی، مرآۃ الخیال، سفینہ خوشگو، اریاض الشعراء، ید مبیضا اور عنرات العاشقین وغیرہ۔

(۲) خاص تذکرے یعنی وہ تذکرے جن میں کسی خاص عہد یا دور یا صرف معاصر شعرا کا ذکر آیا ہے مثلاً مجالس النفاس، کلمات الشعراء، تذکرہ نصر آبادی۔

اردو شعرا کے تذکروں کا آغاز اور پہلا تذکرہ

اڈونک زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ دلیسی راجہ نوابوں اور بعد انگریز کے ہاتھوں منتقل ہو گیا، اس سیاسی تبدیلی نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں زبان و ادب پر بھی گہرا اثر پڑا، فارسی زبان جو کئی صدیوں سے سرکاری زبان تھی اب اس کی جگہ اردو نے لے لی اردو شاعری کی طرف ذرا دیر میں توجہ دی گئی یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ فارسی زبان میں لکھے گئے۔

تذکرہ گلشن ہند مولفہ مرزا الطاف علی جو تذکرہ گلزار اقبالیم کا آئندہ ترجمہ ہے، سارے کے سارے تذکرے فارسی زبان میں ہیں۔ اب حیات کی سنہ تالیف ۱۸۸۸ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

شعراے اردو کا پہلا تذکرہ میر کا نکات الشعراء ہے، سوال یہ ہے کہ اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر اکبر الوداد کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا اور بعض معاصرین محمد یار خاں خاکسار، رفیع الدین سودا اور سراج الدین خاں آزاد اور سید امام الدین نے بھی اردو شعرا کے تذکرے ترتیب کئے تھے لیکن دست زمانہ سے

محفوظ نہ رہ سکے اور آج یہ تذکرے ناپید اور نایاب ہیں، اردو کے قدیم تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

از میر تقی میر مؤلف ۱۱۶۵ھ	(۱) نکات الشعراء
از حمید اور رنگ آبادی مؤلف ۱۱۶۵ھ	(۲) گلشن گفتار
از افضل بیگ قاشقال مؤلف ۱۱۶۵ھ	(۳) تحفۃ الشعراء
از فتح علی گردیزی مؤلف ۱۱۶۶ھ	(۴) رختہ گویاں
از قیام الدین قیام مؤلف ۱۱۶۸ھ	(۵) مخزن نکات

اردو تذکروں کی تقسیم: فارسی تذکروں کی طرح اردو تذکروں میں بڑی رنگارنگی بحیثیت مجموعی ان کا تنقیدی اسلوب اور تحسین لب و لہجہ یکساں ہے لیکن مؤلف کا مزاج تحریر علاقہ ماحول اور انفرادی رنگ ان تذکروں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کی ہئیت اور موضوع کو مد نظر رکھ کر ہمارے ناقدین نے مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

نحی الدین قادری زور نے مصنف کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر تین خاص قسمیں کی ہیں:

۱۔ وہ جو کسی بڑے شاعر کے نتیجہ فکر ہیں۔

۲۔ وہ جن کے مصنف خود بڑے شاعر ہیں۔

۳۔ وہ جن کے مصنفین کو سخن گو نہیں بلکہ جن فہم کہنا چاہئے۔

نگار ساں دما سی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور شمس اللہ قادری نے ان تذکروں کو ان کے اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) عام تذکرے جن میں ابتدا سے لے کر معاصرین تک کے حالات ردیف وار بلحاظ ادوار میں جمع کئے جلتے ہیں۔

(ب) فارسی تذکرے جن میں کسی خاص عہد کے شعراء یا خاص مصنف شعرا یا کسی خاص علاقوں کے شعراء کا ذکر آیا ہو۔

بعض ناقدین نے تذکروں کے مختلف خصوصیات کے اعتبار سے سات قسمیں تقسیم کی ہیں۔

اول : وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کئے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

دوم : وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کا تذکرہ موجود ہے۔

سوم : وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرا کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب کرنا ہے۔ ان تذکروں میں شعرا کی بیاضیں اور مجموعے داخل ہیں۔

چہارم : وہ تذکرے جن میں شاعروں کو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقاء دکھانا ہے۔

پنجم : وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔

ششم : وہ تذکرے جو کسی وطن یا کسی ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

ہفتم : وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے۔

اردو کے تذکروں کو ہم صرف دو طبقات میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔

طبقہ اول : قدیم طرز کے تذکرے۔

طبقہ دوم : جدید طرز کے تذکرے۔

قدیم طرز کے تذکرے نکات الشعرا کے تتبع میں لکھے گئے ہیں، مندرجہ ذیل تذکرے تتبع کی

مثال ہیں :

(۱) تذکرہ ریختہ گویاں۔ فتح علی گریز کا (۲) مخزن نکات قائم چاند پوری (۳) تذکرہ میر حسن

(۴) تذکرہ مصحفی۔

مؤخر الذکر قبیلہ کے تذکرہ میں میاں الشعرا ذکا، مجموعہ تقریر قدرت اللہ قاسم، گلشن

بے خار لڑاب مصطفیٰ خاں شینقتہ۔ گلستان بے خراں۔ باطن۔

جدید طرز کے تذکرے جو جدید اثرات کے تحت لکھے گئے ہیں ان میں سوانح کا رنگ

غالب ہے۔ شعرا کے حالات اور واقعات جو ان کے ساتھ مستند تاریخوں کے ساتھ درج ہیں۔

(الف) گلزار ابراہیم مصنفہ لڑاب ابراہیم خاں گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف۔

(ب) طبقات الشعراء ہند مولوی کریم الدین - تاریخ ادبیات ہندوستانی گارماں داسی -
 نکات اشعار کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔
 اس کی دوسری خوبی اس کی خوبصورت اور سچی سیرت نگاری ہے۔

تذکرہ ریختہ گویاں ۱۱۶۲ھ فتح علی حسینی گردیزی اس میں اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے میر
 کے تذکرہ کا کوئی ذکر نہیں لیکن بہر حال میر کے تذکرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں صرف انٹھانڈے
 شعراء کے حالات ملتے ہیں، گردیزی ان انٹھانڈے میں ہے۔ انسٹھ پر ایک آدھ سطر سے زیادہ
 نہیں لکھ سکے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا یہ خیال ہے کہ کسی بھی جودت طبع کا ثبوت نہیں ملتا تاہم یہ تذکرہ سوانحی اور
 تاریخی حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ گردیزی کا بیان اپنے معاصر شعراء کے بیان کے
 سلسلے میں شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) مخزن نکات - ۱۱۶۸ھ قیام الدین قائم - قائم نے اس تذکرے کو تین ادوار میں تقسیم کیا
 ہے۔ طبقہ اول میں متقدمین کا طبقہ دوم میں متوسطین کا اور طبقہ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے اس
 میں دکن کے شعراء پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

(۳) تذکرہ حیرت ۱۱۷۴ھ

(۴) تذکرہ شورش ۱۱۹۳ھ

(۵) تذکرہ خاکسار معشوق علی چیل سالہ محیار عرف کلن یا کلو۔

(۶) چمنستان شعراء ۱۱۷۵ھ شفیق اوزنگ آبادی

(۷) مجموعہ نغز ۱۱۳۱ھ - نکات الشعراء کی ضد میں لکھا گیا۔

عیار الشعراء عمدہ منتخبہ کے بعد قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب
 ”آب حیات“ کا ماخذ اصل یہ ہے۔ بقول محمود شیرانی، ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

(۸) تذکرہ میر حسن ۱۱۸۸ھ ۱۱۹۲ھ یہ تذکرہ تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ

اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ میر حسن نے نہ کسی کی بے حد تعریف کی ہے یا کسی کی تنقیص کی ہے لیکن کلام

کے انتخاب میں انہوں نے بڑی خوش ذوقی اور سخن شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جو نئے طرز کے تذکرے لکھے گئے ہیں انہیں ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور: تاریخی اور تحقیقی رجحانات کے حامل تذکرے۔

دوسرا دور: سانی تحقیقی اور اصناف سخن کے ارتقاء کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کے تنقید پر محمول تذکرے۔

تیسرا دور: تذکرہ نویسی کو ادبی تاریخ کے قالب میں ڈھالنے کا رجحان رکھنے والے تذکرے۔ پہلے دور کے تذکروں میں گلزار ابراہیم مرتبہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی، موصوف ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اسپرنگر نے گلزار ابراہیم کی درج ذیل خصوصیت بتائی ہے۔

(۱) شعرا کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخوں کا تعین۔

(۲) خط و کتاب کے ذریعہ واقعات کی فراہمی۔

دس معاصرین کے حالات ہیں ان کے خطوط کے اقتباسات۔

(۴) کلام کے مفصل نمونے۔

ماسوا اس کے شعرا کے ذکر میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔

علی ابراہیم خاں خود پاکیزہ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے، غرض یہ کہ یہ تذکرہ کسی معیشت سے اہمیت کا حامل ہے۔ نگاشن مہندہ تذکرہ گلزار ابراہیم ایک ترقی یافتہ شکل میں ترجمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا علی لطف نے نہ صرف ترجمہ کا خیال رکھا ہے بلکہ بہت سے اضافے بھی کئے ہیں۔ ایک طرف اردو کے قدیم اسلوب کا نمونہ ملتا ہے تو دوسری طرف شعر و ادب اور تاریخی سوانح کے متعلق مزید معلومات ملتی ہیں۔ جو اس تذکرے کے علاوہ کسی دوسرے تذکرے میں نہیں آتی ہیں۔

دوسرے دور کے تذکروں میں گاماں دما سی اور صہبائی کے تذکرے ملتے ہیں، شیخ امام بخش

صہبائی نے ۱۸۴۳ء میں دلی، اردو، سودا، میر حیات، نصیر حسن، ممنون، ناسخ، منشی موتی چند،

ذوق، سوس کے کلام کا انتخاب کیا ہے، اس انتخاب میں انہوں نے تمام اصناف سخن کو ملحوظ رکھا ہے۔
گارساں داسی کی تاریخ ادب ہندوستانی ۱۸۳۹ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی اس کی
خصوصیات درج ذیل ہیں۔

- (۱) یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس کے مقدمہ میں اردو تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔
- (۲) ادب کی تاریخ اور تذکروں پر تنقید کا رجحان داسی کے بعد تذکروں میں متعینہ طور پر عام ہو گیا۔

۱۰

فرانسیسی خاتون لیلیان نذرانے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں تنقیدی حواشی و مقدمہ
کے ساتھ ان تین جلدوں کا ترجمہ کر کے Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔

تذکرہ کریم الدین "طبقات الشعراء" ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا، کریم الدین اور فلین صاحب
نے ۱۸۴۸ء میں گارساں داسی کے تذکرہ کا اردو میں ترجمہ کیا، کریم الدین کا دیباچہ اور مقدمہ جس میں
اردو زبان کی پیدائش و قدامت اور رسم الخط کی بحث ہے تذکرہ کریم الدین اردو شاعری کی تاریخ کی باقاعدہ
تدوین کا پہلا قدم ہے۔

تیسرے دور کے تذکروں میں "آب حیات" سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آناؤ نے یہ
تذکرہ ۱۸۸۰ء میں سیر و قلم کیا۔ "آب حیات" کی اشاعت کے بعد اردو تذکروں میں ایک انقلاب آیا۔
بقول پروفیسر شیرانی اردو کیا ناری میں بھی اس پایہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

۱۱۔ آب حیات کے بعد اردو شعرا کے متعدد تذکرے لکھے گئے وہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ آثار الشعراء ہندو مولفہ دی پرشاد ہندو

۲۔ جلوہ خضر مولفہ صغیر بلگرامی۔

۳۔ یادگار ضیغم مولفہ ضیغم

۴۔ آثار الشعراء مولفہ ممتاز علی

۵۔ آب بقا مؤلف عبدالرؤف عشرت

۶۔ تذکرہ شعراء دکن مولانا عبد الجبار خاں ملکاپوری

۷۔ گل رعنا مؤلف مولوی عبدالحی

۸۔ بہار سخن زریں مؤلف شیاام پرشاد سندرلال

۹۔ انتخاب زریں مؤلف سید راس مسعود

۱۰۔ قاموس المشائیر مؤلف نظامی بابا پوری

۱۱۔ تذکرہ خندہ گل مؤلف عبدالہاری آسی

۱۲۔ تذکرہ شاعرات مؤلف عبدالباری آسی

۱۳۔ شعر الہند مؤلف عبدالسلام ندوی

۱۴۔ تذکرہ ریختی مؤلف تمکین کالپی

۱۵۔ ہندو شعراء مؤلف عبدالرؤف عشرت

۱۶۔ خم خانہ جاوید مؤلف لالہ سری رام

۱۷۔ جوہر سخن مؤلف محمد مہین کبھی چڑیا کوٹی

۱۸۔ کاشف الحائق مؤلف امداد امام اثر

اس کے علاوہ بہت سے ایسے تذکرے بھی ہیں جن کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

اردو کے مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف ”اردو تنقید پر ایک نظر“ میں اردو

تذکرہ نگاری پر سخت اعتراض کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

”اردو میں تذکرے تو بہت ہیں قدیم و جدید ابھی تک اردو تنقید تذکرہ نگاروں کے قدم سے باہر

قدم نہیں رکھتی۔ قدامت سے سادے طریقے سے نسبتاً خموشی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے

موجودہ زمانہ میں ظاہری صورت مختلف ہے، زور شور سے نگار طغیانی کی کثرت ہے لیکن اندر خلاء

ہی خلا ہے.....“

تذکروں میں مختلف شعرا کا ذکر بہ اعتبار حروف تہجی ہوتا ہے اس لئے پراگندگی لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح غزل میں انتشار ہوتا ہے اور متفرق خیالات و جذبات بے ترتیبی کے ساتھ اکٹھا کر دیئے جاتے ہیں اسی طرح ان تذکروں میں بھی مختلف زمانہ، مختلف رنگ، مختلف پایہ کے شعراء ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

بہارِ اوردو تذکرہ نگاری

قبل اس کے کہ ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لیں ہم بہار میں اردو تذکرہ نگاری کا ایک ہکا سا خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔

تذکرہ شورش : شعراء دو کا یہ پہلا تذکرہ نکلتا شعرا ہے، یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں قلمبند کیا گیا۔ چنانچہ شورش نے بھی اپنا تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں لکھا، شورش کا نام سید غلام حسین عرف بھیا، ان کا آبائی وطن عظیم آباد ہے۔ شورش کے حالات دیگر تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً تذکرہ مسرت افزا، گلشن بے خار، تذکرہ عشقی اور طبقات الشعراء میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

شورش کے معاصر ابوالحسن کے مسرت افزا سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مدت سے شعراء کا کلام اکٹھا کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کا نام ”یادگار دوستان روزگار رکھا اور تاریخ تالیف میں یہ مصرعہ دیا۔ ”یادگار دوستان روزگار“۔ اس مصرعے سے تذکرہ کے مکملہ کا سال ۱۱۹۳ھ نکلتا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بڈلین لاہری آکسفورڈ میں موجود ہے۔ بیٹن یونیورسٹی نے اس کی عکسی نقل حاصل کی تھی اور کلیم الدین احمد کی سعی سے اس تذکرے کو ”تذکرہ عشقی“ کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں شائع کر لیا لیکن اس میں حرف ’س‘ تک شعراء شامل ہیں۔

تذکرہ ناری زبان میں ہے۔ حالات زندگی زیادہ مفصل نہیں پھر بھی مولف نے شاعر کا نام تخلص، وطن، مولدیت، مشغلہ، تاریخ پیدائش درج کی ہے، شورش نے قدام سے لے کر معاصر تک ذکر کیا ہے۔ ترتیب میں حروف تہجی کا خیال رکھا گیا ہے۔

تذکرہ مسرت افزا : تذکرہ مسرت افزا کے مصنف ابوالحسن ہیں، موصوف کا آبائی وطن

الہ آباد تھا لیکن بعد کو وہ عظیم آباد میں مقیم ہوئے، یہ تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں مکمل ہوا، گارہاں دنا سی کے خیال میں مسٹر ڈبلو اوسلے کے پاس موجود تھا غالباً وہی نسخہ آکسفورڈ میں موجود ہے، یہ تذکرہ ابو الحسن نے عظیم آباد سے لکھنؤ جاتے وقت لکھا، لکھنؤ کے قیام کے دوران انہوں نے مزید ترمیم و اضافہ کیا، تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔

تذکرہ عشقی: عشقی کا اصل نام شیخ محمد وجیہ الدین شیخ غلام حسین مجرم کے بیٹے تھے ان کے والد فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے، عشقی خود بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔

عشقی نے اپنا مشہور تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں مکمل کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ اور ایک قاضی عبدالودود کے کتب خانہ میں موجود ہے، کلیم الدین احمد نے اس تذکرہ کو تذکرہ شورش کے ساتھ دو تذکرے کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں شائع کر دیا لیکن مطبوعہ نسخہ مکمل نہیں۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ حالات زندگی بہت مختصر ہیں، تذکرہ شورش کی طرح اس میں اشعار کی کثرت نہیں ہے۔

گلزار ابراہیم: مصنف علی ابراہیم خاں خلیل، خلیل عظیم آباد کے باشندہ تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ گلزار ابراہیم کے علاوہ فارسی کے دو تذکرے۔

۱۔ خلاصۃ الکلام

۲۔ صحف ابراہیم

یہ تذکرہ ۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا، جان گلکرسٹ کی فرمائش پر مرزا علی لطف نے اس کا نسخہ ۱۸۸۰ء میں ترجمہ کیا لیکن مرزا لطف نے ترمیم و اضافہ کیا۔ گلزار ابراہیم کو ۱۹۰۶ء میں گلشن ہند کے ساتھ عبداللہ خاں نے حیدر آباد سے شائع کیا، مولوی عبدالحق اور محی الدین زور دونوں کے مقدمے شامل ہیں، مولوی عبدالحق کا مقدمہ گلشن ہند میں اور ڈاکٹر زور کا مقدمہ گلزار ابراہیم میں ہے، ڈاکٹر زور کا یہ خیال ہے۔

۳۔ "گلزار ابراہیم" اردو شاعری کے ان تذکروں میں سے ہے جو مصلوبات اور دست

۴۔ مقدمہ گلزار ابراہیم، بحوالہ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۱۲۱

اور صحت کے لحاظ سے درجہ اول کے تذکرے کہے جاسکتے ہیں۔

گلزار ابراہیم کی زبان فارسی ہے اس میں تین سو بیس شعرا کا ذکر آیا ہے، اس تذکرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں احوال سے کام لیا گیا ہے، اس میں نہ کسی کی بے حد تعریف کی گئی ہے اور نہ ہی تنقید۔ انہوں نے کسی شاعر کے حالات درج کرنے میں نہ صرف سخی سنائی ہوئی باتوں پر بھروسہ کیا ہے بلکہ چھان بین کے بعد معتبر ذرائع سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، مزید انہوں نے حوالات بھی دیئے ہیں، غرض یہ تذکرہ کئی اعتبار سے دوسرے تذکرے پر فوقیت رکھتا ہے۔

جلوۂ خضر: مصنف صفیر بلگرامی، جلوۂ خضر دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۱۸۸۵ء

میں شائع ہوئی، دوسری جلد ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ صفیر بلگرامی کے پوتے وصی بلگرامی کا خیال ہے کہ باقی جلدوں کے چھپنے کی ذمہ داری نہیں آئی اور کاغذات تلف ہو گئے، صفیر بلگرامی کی بے وقت موت نے جلد سوم کی ترتیب و تکمیل کا موقع نہیں دیا۔

جلوۂ خضر ایک ایسا تذکرہ ہے جس پر اعتراضات ہوئے ہیں، صفیر بلگرامی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ جلوۂ خضر کی ترتیب میں انہوں نے آب حیات کی تقلید کی ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے کہ آزاد کے بعد مصنفوں میں جلوۂ خضر کے مصنف صفیر بلگرامی نے آزاد کے سرچشمہ سے الکتساب کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ شعرا ہند کے مؤلف عبدالسلام ندوی نے مترذکات کے سلسلہ میں صرف جلوۂ خضر پر اکتفا کر لیا، وہ کہتے ہیں ”شعرا در الفاظ و محاورات کے تغیر و تبدل کے متعلق بھی بہت کچھ جلوۂ خضر مؤلف صفیر بلگرامی سے ماخوذ ہے۔“

صفیر بلگرامی کا سب سے پہلا تقلیدی اقدام جلوۂ خضر کی ترتیب میں ملتا ہے۔ آزاد نے اپنے تذکرہ کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا ہے اور صفیر نے اسی کے بجائے اپنے تذکرے میں کمیٹیاں قائم کی ہیں جلوۂ خضر میں پانچ جلد ہیں اور پانچوں جلدوں میں آٹھ کمیٹیاں بن جاتی ہیں۔ سبھی کمیٹیوں کے چیرمین ولی دکنی بتائے جاتے ہیں۔

آزاد نے زبان اردو کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اردو زبان بھاشا سے نکلی ہے۔ آزاد کا یہ خیال گمراہ کن ہے، صغیر نے اس نظریہ کی تردید کی ہے وہ کہتے ہیں :

”اردو وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے الفاظ عربی، فارسی اور ترکی کے ملنے سے خود بہ خود پیدا ہو گئی۔“

صغیر کے تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمیں آب حیات ہی کی طرح صرف مشاہیر شعرا سے واقفیت نہیں ہوتی بلکہ معروف یا غیر معروف کا امتیاز نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس میں مزید سے مزید شعرا کو جگہ دی گئی ہے۔

صغیر بلگرامی نے مشاہیر شعرا کے شاگردوں کی فہرست تیار کرنے میں سخت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے ان میں بعض مشاہیر شعرا کی فہرست اس طرح ہے۔

سودا	۲۱ شاگرداں	ناسخ	۴۷ شاگرداں
میر	۱۱	میر درد	۱۰
مصطفیٰ	۴۷	جرات	۳۳
ذوق	۲۵	زنگین	۳
آتش	۲۸	شاہ نصیر	۴۱
ابیر	۲۳	مومن	۲۰

مختصر یہ کہ جلوہ خضر صغیر کا ایک ایسا تذکرہ جس کو اردو ادب کی تاریخ کبھی بھی فراموش

نہیں کر سکتی۔

سخن شعرا : تذکرہ سخن شعرا کے مصنف مولوی عبدالغفور نساخ ہیں۔ سخن شعرا تاریخی نام ہے اس کا سال تصنیف ۱۸۶۳-۶۴ء لکھا ہے۔ سخن شعرا ۱۲۹۱ھ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا یہ تذکرہ ۵۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۷ یہ تذکرہ اردو میں ہے۔ اس میں قدما سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک کے تقریباً

۱۸ جلوہ خضر تلخیص و تنقید مرتبہ ڈاکٹر ظفر ادگانوی ۳۷

سارے شعرا کا ذکر ہے۔ آخری دس صفحات شاعرات کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ۲۵ شاعرات کے حالات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی نے اپنے تحقیقی مقالے میں اپنی لائبریری کے بنا پر سخن شعرا کے ضمن میں یوں لکھا ہے :

”عبد الغفور نے یہ ضخیم تذکرہ سخن شعرا کے نام سے لکھا ہے جس میں اس دور کے تقریباً سبھی شعرا کو شامل کر لیا ساتھ ہی خواتین شعراء کا بھی ذکر کیا جو اس سے پہلے کسی تذکرہ میں موجود نہ تھا حالانکہ مصنف نے سب سے قبل تذکرہ ہندی پانچ خواتین شاعرات کے حالات درج کئے ہیں۔“

ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی کتاب ”انیسویں صدی میں بنگال کا ادب“ میں سخن شعرا کے ضمن میں

یوں اظہار خیال کیا ہے :

”نساخ کا یہ تذکرہ تشنہ ہے نساخ نے شاعروں کا مختصر حال اور چند اشعار نوشتا درج کئے ہیں۔ بلاشبہ نساخ کا یہ تذکرہ تشنہ سہی لیکن ادبی دنیا ہندوستان بھر کے شعراء سے متعارف ہوتی ہے خصوصی طور پر اردو کے چند گناہ شعراء کے بھی حالات اس تذکرے میں ہمیں ملتے ہیں۔“

نساخ کا آبائی وطن ضلع فرید پور میں راجہ پور نامی بستج تھا۔ مگر ان کے والد قاضی محمد فقیر کلکتہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ نساخ ۱۲۴۱ھ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے، نساخ کے چاندوں بھائیوں میں نواب عبداللطیف ہی صرف مشہور ہوئے۔ اپنی ملازمت کے سبب نساخ صوبہ بہار کے مختلف ضلع پٹنہ اور بھاگلپور میں مقیم رہے۔ نساخ کے نام اور فرزند شمس کلکتوی مقام بانکے حضانات بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔

کاشف الخصال - مصنفہ سید امداد امام اثر۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس میں مشرق اور مغرب کے فلسفہ، باہت مع تاریخ بیان کئے گئے ہیں، تذکرے کو مستند بنانے کے لئے عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں۔ تجارت تصنیف سے پاک ہے۔ عربی و فارسی کی

کی اصطلاحیں کثرت سے ملتی ہیں۔

تاریخ شعرا بہار : مؤلف سید عزیز الدین بلخی راز۔ تاریخ ادوار کے بنا پر لکھی گئی ۱۱۵۰ھ سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک کے بہاری شعرا کی تاریخ ہے، ہر پچاس سال کا ایک دور متعین کیا گیا ہے، حالات و نمونہ کلام میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اس کی دوسری جلد جو ۱۳۵۰ھ سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک ہے ہونہر طباعت و اشاعت سے محروم ہے۔ غالباً اس کا مخطوطہ ان کے سچھ صاحبزادے سید منظر احمد بلخی مقیم ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے پاس موجود ہو۔ دوسری جلد پریس میں گئی تھی کہ موصوف کا انتقال ہو گیا، فیض الدین بلخی مرحوم نے ناز بلخی مرحوم سے متعلق رسالہ اشارہ پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء میں اپنا ایک مقالہ پیر و قلم کیا۔ انہوں نے اس مقالے میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ انہیں ۱۹۴۹ء میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا، عبدالقادر مرحوم نے جلد اول و دوم غیر مطبوعہ کو یکجا کر کے شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن سیاسی فسادات اور تقسیم ملک کے بنا پر یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

بہار اوار دو شاعری : مصنفہ پروفیسر معین الدین وردائی۔ یہ ایک کتابچہ ہے جس میں صوبہ بہار کے قدیم و جدید شعرا کے حالات اور کلام نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ کتابچہ مختصر ہے۔ علامہ سید علی محمد شاد کی تصنیف نوائے وطن اور حیات فرما دے، حیات فرما دے جناب سید شاہ الفت حسین فرما دے استاد شاد کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں تصانیف میں ضمناً دوسرے بہار کے شعرا کے حالات ملتے ہیں۔

یادگار وطن : علامہ شوق نیوی عظیم آبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں اپنے حالات تفصیل سے اور اپنے چند تلامذہ کے حالات اور ہر ایک کے چند اشعار ضمناً لکھے گئے ہیں۔

مرقع فیض : مصنف سلطان عظیم آبادی، اس میں حضرت صفیر بلگرامی آردی کے تلامذہ کا ذکر ہے۔ **فروع بزم :** معروف بہ تذکرہ شعرا، صوبہ بہار مؤلفہ جناب جگیش پر شاد طش گپادی تلمیذ خواجہ عشرت مکتوی۔ یہ تذکرہ نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ضلع عظیم آباد کے سوا تمام اضلاع بہار کے اردو شعرا کا تذکرہ ہے، یہ تذکرہ اردو زبان میں لکھا گیا اور شعرا کے تخلص کے حرف تہجی پر مرتب کیا گیا اور صوبہ بہار کے ضلع واری شعرا کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا ہے۔ حالات قدرے تفصیل

سے لکھے گئے ہیں۔

گلشن حیات : مصطفیٰ مدین الدین قیس تلمیذ حضرت شاد عظیم آبادی، اس میں قیس مرحوم نے حضرت شاد کے تلامذہ کے حالات اور کلام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ اور آخر میں حضرت شاد کی سوانح حیات اور کلام کو درج کیا ہے۔ یہ کتاب سلسلہ میں سلیمانی پریس شاہ کی اعلیٰ پٹنہ سے شائع ہوئی۔

تذکرہ مسلم شعرائے بہار : مؤلف حکیم سید احمد اللہ ندوی، یہ تذکرہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے، جلد اول حرف الف سے ح تک، جلد دوم خ سے ش تک، جلد سوم ص سے ف تک، جلد چہارم ق سے م تک، جلد پنجم ن سے ی تک مشتمل ہے۔ جلد ششم ایک مستقل ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تذکرہ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ تذکرہ نگار نے تذکرہ کی ترتیب کے سلسلہ میں حدود درجہ طوالت سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر لگ بھگ بارہ سو شعرا کے نمونہ کلام اور حالات اس میں ملتے ہیں پھر بھی موصوف نے کافی محنت اور چھان بین کے بعد یہ تذکرہ لکھا ہے، یہ تذکرہ موصوف کی لگ بھگ ۳۰ سال کی محنت کا ثمرہ ہے اور تذکرہ نگار کا اپنے وطن خصوصی طور پر صوبہ بہار پر ایک عظیم احسان ہے، عزیز الدین بلخی مرحوم کی تصنیف تاریخ شعرا بہار کے بعد یہ ایک نادر تذکرہ وجود میں آیا، تنقیدی حیثیت سے اس تذکرہ کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں لیکن موصوف کی بے جا صلاحیت کی وجہ سے اس تذکرہ میں صوبہ بہار کی اردو شاعری کی کوئی ارتقائی کیفیت نہیں ملتی پھر بھی یہ کتاب مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے جلد اول میں صوبہ بہار کی اردو شاعری کا ارتقائی جائزہ لیا ہے، جلد ششم کے دیباچہ میں تذکرہ نگار نے اس امر کا اعتراف کیا ہے "ابھی صوبہ بہار کے بہت سے اردو شعرا کے حالات پردہ خفایں پرے ہیں اور ان کو ڈھونڈ نکالنا اور منظر عام پر لانا ان نوجوان محققوں کا کام ہے جو اس مادری زبان سے شغف رکھتے ہیں، تاکہ جب کبھی اردو زبان کی جامع تاریخ لکھی جائے تو بہاری شعرا کے کلام کا کافی ذخیرہ بھی موجود ہو۔"

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے گرانقدر تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو نثر نگاری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک" میں جہاں انہوں نے اس دور کی اردو تذکرہ نگاری کا جائزہ لیا ہے ان کی تعداد۔

تیرہ^۳ بتائی ہے۔ چنانچہ اس باب میں موصوف نے صرف دو ادبی تذکرہ اول الذکر کاشف المحققین کا نام بتایا ہے اور دوم ایک تذکرہ جس کا نام ”نوائم البناتین فی تراجم النواتین“ ہے اس کے علاوہ ایسے تذکروں پر روشنی ڈالی ہے جن کی خالص نوعیت مذہبی ہے۔ ایسے تذکروں میں بزرگانِ دین یا صوفیائے کرام کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ان تذکروں پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ حالاتِ سلاسلِ صوفیہ مولفہ قاضی محمد اسماعیل عظیم آبادی، مکتوبہ ۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۰ء قاضی سعید مرحوم نے لکھا ہے کہ حالاتِ سلاسلِ صوفیہ کے سلسلے میں ایک مختصراً رسالہ ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ قاضی عبدالودود صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

۲۔ عناصر الشہادتین: مولفہ حکیم ناصر علی غیاث پوری مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب کا جو موضوع رکھا گیا ہے اس میں شہیدانِ کربلا خلفائے راشدین اور اصحابِ کرام کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ شجرۃ الیقین فی جنت النعیم فسح باسم ربک العظیم مولفہ شاہ رضا حسین مطبوعہ ۱۸۸۳ء کتاب کا نام تاریخی ہے۔ پہلے حصہ کا نام شجرۃ الیقین فی جنت النعیم ہے اور دوسرے حصہ کا نام فسح باسم ربک العظیم ہے۔ پوری کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ اس طرح پوری کتاب ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۔ تذکرہ الکرام مع تکملہ تذکرہ اولاد و خلفاء حضرت شیخ العارفین مخدوم شاہ محمد نعمت اللہ قادری پھلواری مولفہ و مترجمہ ایوب قادری پھلواری شریف کے بزرگوں کا تذکرہ موسوم بہ تذکرہ الکرام بہ زبان فارسی، مصنفہ محمد ابوالحیات قدس سرہ کا اردو ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مترجم نے شاہ محمد نعمت اللہ قادری مجلسی پھلواری کی اولاد و خلفاء کا تذکرہ لکھ کر شائع کی۔

۵۔ نسائم الباتین فی تراجم النواتین مولفہ ابو محمد احمد احسن صدیقی۔ اس تذکرہ کا واحد قلمی نسخہ ابوالبقا واقع موضع پورنی بھاگلپور کے پاس محفوظ ہے۔ اس تذکرہ کے دو حصے ہیں پہلے حصہ کا نام طبقاتِ بیگیات ہے اور دوسرے کا طبقاتِ شاعرات ہے۔ تذکرے کو مستند بنانے کے لئے مولف نے مآخذ کا سہارا لیا ہے۔

۶۔ نعمتِ عظمیٰ سہ جلد مترجمہ عبدالغنی استخوانوی مطبوعہ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۱ء صوفیا اور اولیاء کے احوال پر مشہور عالمِ امام عبد الوہاب شیرانی کی مشہور مستند کتاب طبقات الکبریٰ عربی کا واحد ترجمہ ہے۔

طبقات اکبری دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور نعمت عظمیٰ کے نام سے چار جلدوں میں شائع کرانے کا ارادہ کیا ہے لیکن اس کی صرف ۳ جلدیں منظر عام پر آسکیں۔

۷۔ مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین۔ جلد مؤلفہ عبدالستار بیگ سہرانی مرتومہ ۱۹۰۶ء۔ یہ کتاب تین بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تالیف ۱۹۰۵ء میں عمل میں آئی لیکن جلد سوم کی اشاعت مؤلف کے انتقال کے بعد عمل میں آئی۔

۸۔ تاریخ اسلام۔ اس کتاب میں تصوف اور مختلف سلاسل کے صوفیاء کی تاریخ کے علاوہ ناعہد عباسیہ بیان کیا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کے انواع سے زیادہ اخلاقی و تمدنی حالات پیش کئے گئے ہیں مؤلف نے باتوں کو مستند بنانے کے لئے مختلف کتابوں سے حوالے دیئے ہیں۔ زبان میں صفائی و سادگی ہے۔

۹۔ گنجینہ سیدی المعروف بہ آئینہ مبارک مؤلفہ سید حسن بہاری مطبوعہ ۱۹۰۸ء۔ یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ یہ سلسلہ قادریہ مجددیہ آبادانیہ علمیہ و فریدیہ کے بزرگوں کا تذکرہ ہے سان حفرات کے احوال کے علاوہ رسول کریم صلعم و اصحاب کے احوال بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے ماخذ کا حوالہ بھی دیا۔

۱۰۔ تذکرہ بزرگان پھلواری: مؤلفہ شاہ سلیمان پھلواری شاہ صاحب موصوف کے ایک معتقد منظور الحق حکیم قادری نے ۱۹۲۱ء میں آپ کے فارسی و عربی اور اردو کلام کا ایک مجموعہ اعظمت سلیمانی معروف بہ نسخہ حاذق کے نام سے شائع کیا، اس میں آپ کی چند تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے۔

۱۱۔ تاریخ محدثین ہند مؤلفہ عبدالغفور دانا پوری، مصنف کی ایک دوسری کتاب جغرافیہ صوبہ بہار مطبوعہ ۱۹۰۶ء کے سرورق پر اس کتاب کا اشتہار چھپا۔

۱۲۔ گلشن ابرار مؤلفہ عبدالغفور دانا پوری، جغرافیہ صوبہ بہار کے سرورق پر اس کتاب کا نام ملتا ہے۔

۱۳۔ نجات اکبری معروف بہ نذر محبوب مؤلفہ اکبر دانا پوری، یہ ابوالعلائی سلسلہ کے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔

ذیل میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لے رہے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کی

تذکرہ نگاری کے ضمن میں ان کی دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔ اول تذکرہ نسوان ہند اور دوم تذکرہ ہندو شعرا بہار۔ اول الذکر کی تصنیف موصوف کی زندگی میں شائع ہوئی اور آخر الذکر ان کی وفات کے بعد۔ تذکرہ نسوان ہند: یہ تصنیف جولائی ۱۹۵۶ء میں شمسی پریس پٹنہ سیٹی سے شائع ہوئی کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہندوستان کی نامور خواتین کے حالات اور کارنامے درج کئے گئے ہیں پوری کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے نیز اول تا آخر ہر حصہ کی الگ الگ سرخی قائم کی گئی ہے، اول حصے میں شاعرات کے تذکرے ہیں اس میں ۲۸۶ شاعرات کے ذکر ہیں۔ حصہ دوم میں جس کی سرخی مصنفات ہے، اس حصہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جن کا رگاد تصنیف و تالیف سے ہے اس میں ۵۴ خواتین کا ذکر ہے۔ تیسرا حصہ جس کی سرخی کالمات ہے ۱۶ خواتین کے حالات درج ہیں، چوتھا حصہ جس کی سرخی سیشہرات ہے ایک تو ایک خواتین کے حالات درج کئے گئے ہیں۔

اس طرح مجموعی طور پر اس کتاب میں لگ بھگ ۵۰۰ خواتین کے حالات درج اور کارناموں کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں کتاب کا مقدمہ ہے جس کو صاحب کتاب نے خود ہی سپرد قلم کیا ہے۔ اس مقدمہ کو پڑھنے سے پہلے تو مشہور خواتین کے حالات زندگی سے صاحب کتاب کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مرتب کتاب کا بہت گہرا مطالعہ ہے چنانچہ مقدمہ کے اس اقتباس سے اس کا احساس ہوگا۔

”لے“ ممالک یورپ میں بھی اس قسم کی پابندیاں نہ ہونے کے باوجود عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل نہ تھا، انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انگلینڈ یورپ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا تھا مگر وہاں بھی عورتوں کو بہت سے ضروری حقوق حاصل نہ تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اول لڈن یونیورسٹی نے عورتوں کو امتحان میں شرکت کی اجازت دی اور اس کے دو برس کے بعد عورتوں کو میونسپل ممبری کی اجازت دی گئی ۱۸۷۱ء کے قبل تک شادی شدہ عورتوں کو ذاتی جائیداد رکھنے کے حقوق حاصل نہ تھے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف ”تذکرہ نسوانِ ہند“ میں اپنی تصنیف کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

”کسی ملک کے باشندوں کو علمی و ادبی، فنی و سیاسی، تمدنی اور اخلاقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ معلوم کرنے کے لئے مردوں کے علاوہ عورتوں کے حالات کی واقفیت بھی ضروری ہے“ مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے عموماً مردوں کے حالات شد و مد کے ساتھ لکھے ہیں۔

تذکرہ نگار کو اپنے ملک اور وطن کی عظمت کا احساس ہوتا ہے چنانچہ اس نے یہ محسوس کیا کہ ”لیکن تمام قیود اور پابندیوں کے باوجود ملک ہند کی خواتین کے صفات اور کارنامے اس قدر اہم عظیم الشان اور حیرت انگیز ہیں کہ ان کی مثالیں کسی اور ملک کی تاریخ میں کمتر پائی جاتی ہیں۔“

یہ کتاب بلخی صاحب کی ۲۵ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے کتاب کے مقدمہ میں یوں فرمایا ہے۔

”اب سے کوئی ۲۵ سال قبل راقم کو شاہیر کا ایک تبصرہ مرتب کرنے کا خیال ہوا جس کا ذکر راقم نے تاریخ گدھ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ اس زمانے سے متفرق طور پر شاہیر کے حالات ظلم بند کرنا شروع کیا تھا۔ حال میں بعض عزیزوں کے اصرار سے تمام اوراق پریش کا جائزہ لیا تو ظاہر ہوا کہ قدیم زمانے سے وہ حاضر تک تقریباً ایک ہزار اشخاص کے حالات جمع ہو گئے ہیں جن میں بایں سو خواتین کے حالات ہیں۔“

تذکرہ نسوانِ ہند ایک مستند اور جامع تذکرہ ہے اس تذکرہ کی ترتیب میں لگ بھگ ۳۵ مستند فارسی اور اردو کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کا مقدمہ بھی بہت ہی جامع ہے۔ اس تصنیف کے پانچ حصوں کا جہاں تک تعلق ہے، حصہ اول کی سرخی شاعرات ہے۔ لگ بھگ

۱۔ مقدمہ تذکرہ نسوانِ ہند

۲۔ ” ” ” ”

۳۔ ” ” ” ”

۲۸۶ شاعرات کے حالات ملتے ہیں کیونکہ جہاں تک کہ شاعرات کا تعلق ہے تذکرہ نگار کے پیش نظر اصل معیار ہے خواہ وہ شاعر کوئی مغل شہزادی، کوئی پردہ نشیں عورت ہو یا کوئی رفاہیہ کوئی زن خانگی۔

مختصر یہ کہ انہوں نے طبقہ سے تعلق رکھنے والی شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر بلخی صاحب مرحوم نے اپنے تذکرے میں مغل شہزادی گل بدن بیگم یا نصیب النساء بیگم کا اگر ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ دہلی کی ایک زن خانگی بنو کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایسی بھی شاعرات کا ذکر کیا ہے جنہیں فن شاعری میں عبور تھا۔ مثال کے طور پر جمیلہ کا ذکر ص ۱۳ پر جنہوں نے ۸ دواہیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ دوسرے حصہ کی سرفخی مصنفات ہے اس میں ۵۴ خواتین کے حالات ملتے ہیں۔ اس حصہ میں ان

خواتین کا ذکر ہے جن کا لگاؤ تصنیف و تالیف سے ہے خواہ وہ نائیں افسانہ نگار ہوں یا ناول نگار یا مضمون نگار۔ یا صحافت، افسانہ نگار کے ضمن میں ملک کی مشہور خواتین عصمت چغتائی ص ۱۱ ناول نگار کے سلسلے میں رشید النساء عظیم آبادی ص ۱۱ انہوں نے مرآۃ العروس کے طرز پر ایک اصلاح النساء اپنا ناول، موتی بیگم کا بھی نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے جس نے راجپوتانہ گزٹ کی ایڈیٹری بحسن و خوبی انجام دی۔ حصہ سوم جس کی سرفخی کمالات ہے اس میں ۱۶ خواتین کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے کسی خاص

فن میں کمال حاصل کیا، فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ حصہ قابل ذکر ہے۔ بلخی صاحب مرحوم فن کار کی تہہ دل سے قدر کرتے تھے خصوصاً طور پر اس حصہ میں انہوں نے سریندر کور ص ۱۴ میں جو پنجابی گیتوں کو گانے میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ تانگیشکر کا بھی ذکر فاضل تذکرہ نگار نے کیا ہے۔ تانگیشکر عہد حاضر کی مشہور گانے والی ہے اور کلاسیکی فن موسیقی میں جہارت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بلخی صاحب نے گوہر کا بھی ذکر کیا ہے جس کے گانے کی شہرت یورپ تک پہنچی، بلخی صاحب نے گوہر کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔
”اس کے گانے کی شہرت یورپ تک پہنچ چکی تھی۔“

حصہ چہارم جس کی سرفخی شہرات ہے اس میں ایک سو ایک خواتین کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے تاریخی، سیاسی، تمدنی یا اخلاقی کارناموں کے سبب شہرت حاصل کی۔ تاریخی شہرت رکھنے والی عورتوں میں رانی داہر ص ۱، پدمنی ص ۱، تمدنی شہرت رکھنے والی خاتون میں درگافنی ص ۱۹ اور اخلاقی شہرت رکھنے والی خواتین میں پنا ص ۱۱، پرتمال ص ۸۴، کرشن کمار ص ۱۵ اور زوجہ داؤد خاں ص ۱۴ کا نام

خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

خصیہ پنجم جس کی سرخی مقدسات ہے لگ بھگ ۴۱ خواتین کے حالات ملتے ہیں جن کو مذہبی تقدس حاصل ہے۔ اس حصے میں انہوں نے بلا تفریق مذہب و ملت سبھی خواتین کا ذکر لکھا جنہیں تقدس حاصل ہے ساتھ ہی ساتھ سبھوں کا احترام بھی کیا مثال کے طور پر ہندوؤں کی مقدس عورت سیتا جی کے ضمن میں بٹنی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

اے مہاراجہ رام چندر جی کی زوجہ تھیں اور ان کے صفات کے بیان سے رامائن کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ان کا صبر و استقلال، شوہر پرستی اور وفاداری بے عدیل و بے نظیر ہے، بارہ برس شوہر کی معیت میں جنگوں میں بسر کی اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن شوہر کی محبت میں کمی آنے نہ دی، انہوں نے بڑی پاکدامنی کے ساتھ رادھ کے ظلم اور سنگدل حملوں کا مقابلہ کیا۔

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد بٹنی صاحب مرحوم کی وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔
تذکرہ نسوان ہند ایک ایسی کتاب ہے جو ہر مذاق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ مصنف کی فراخ دلی اور وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ عورتوں کے حالات جمع کرنے کے سلسلے میں ان کے کارناموں کو مقدم سمجھا گیا ہے، اس تذکرہ کو مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک تمام مشہور خواتین خواہ وہ کسی فن میں بھی ماہر ہوں سبھوں کو یکساں نظر سے دیکھا گیا ہے۔

سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے مکرّم قدر مقالہ "نصیح الدین بٹنی کی عظیم شخصیت" میں تذکرہ نسوان ہند کے ضمن میں اپنی یوں رائے پیش کی ہے۔
اے نسوان ہند کے تذکرے کی ترتیب و تالیف کی طرف پیش رد اور بھی مؤلفین نے

اے تذکرہ نسوان ہند حقہ مقدسات میں
اے نصیح الدین بٹنی کی عظیم شخصیت معذرت

بھی کبھی توجہ کی تھی مگر کسی نے ایسا جامع اور کامل تذکرہ ترتیب نہیں دیا ہے۔ ہندوستان کی دنیاؤسی سوسائٹی میں اس جنس لطیف کو جیسی قدر و منزلت تھی وہ معلوم ہے لہذا سوسائٹی کے مذاق میں انقلاب پیدا کرنے اور زاویہ نگاہ بدلنے کی خاطر آج سے بیسوں سال پہلے انہوں نے اس کی طرف توجہ کی، بلا قید مذہب و ملت کے باکمال خواتین کے تذکرے کی تجسس و تلاش کی طرف متوجہ ہوئے نیز ملک و سلطنت کے انقلاب کے ساتھ سوسائٹی کے مذاق میں انقلاب پیدا ہوا مگر غلط روی کے ساتھ، بہر کیف آپ نے تذکرہ نسوان ہند ترتیب دے کر ایک طرف گمنامی کے پردہ سے انہیں نکال کر انہیں نکال کر لوگوں کی نظروں کے سامنے لا کر دکھایا تو دوسری طرف ہندوستانی سوسائٹی میں باکمال خواتین کے وقار کو بڑھا دیا۔“

جناب قیوم خضر اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان ”مرحوم بلخی صاحب“ میں تذکرہ نسوان ہند کے متعلق اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں :

”۱۔“ تذکرہ نسوان ہند سے متعلق میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس قدر جامع کتاب اردو میں کوئی دوسری نہیں لکھی گئی ہے، یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔“
 ”ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبہ اردو ڈی۔ این۔ بی کالج بھاکپور نسوان ہند کے ضمن میں اپنی قیمتی رائے یوں پیش کرتے ہیں :

”۲۔“ تذکرہ نسوان ہند اردو زبان میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد تذکرہ ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کی تمام مایہ ناز اردو و فارسی خواتین کا ذکر ملتا ہے۔“
 یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان کی دنیاؤسی سوسائٹی میں ملک ہند کی خواتین کے کارنامے لوگوں کے سامنے پوشیدہ تھے حالانکہ ملک ہند کی مستورات کے کارنامے اس قدر دلچسپ ہیں جو دنیا کے کسی بھی ملک

مرحوم بلخی صاحب، مقالہ قیوم خضر مخطوطہ
 ۱۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

میں نہیں پائے جاتے خواہ وہ کسی بھی حیثیت سے ہوں لیکن اس کی حقیقت ہے کہ اپنے ملک کی قابل
خواتین کے کارناموں اور حالات سے یکسر نا آشنا تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب میو (Meow) نے
بدنام زمانہ کتاب مدر انڈیا (Mother India) لکھی اور ہندوستان کی خواتین کے کارناموں کو
دنیا کی نظر میں گرانے کی کوشش کی تو ہم اس کا کوئی مناسب جواب نہ دے سکے، یہ صحیح ہے کہ لالہ لاجپت
رائے نے اس کے جواب میں فادر انڈیا (Father India) کے نام سے ایک تصنیف قلمبند کی
لیکن یہ کوئی مناسب اور سنجیدہ جواب نہ تھا، ڈاکٹر مظفر اقبال کا یہ خیال ہے کہ تذکرہ نسوان ہند مدر انڈیا
(Mother India) کا مناسب اور سنجیدہ جواب ہے۔ موصوف (ڈاکٹر مظفر اقبال) یوں لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ نسوان ہند مدر انڈیا کا نہایت ہی مناسب اور سنجیدہ اور وزن دار

جواب ہے۔“

اپنے ملک کی خواتین کی تعلیم و تربیت سے بے توجہی برتی گئی ساتھ ہی ساتھ ان کے کارناموں اور
حالات کو منظر عام پر لانے میں بے اعتنائی کا سلوک کیا گیا، اول مصحفی نے اپنے تذکرہ ”شعراء ہند“ کے
آخر میں بطور ضمیمہ صرف پانچ شاعرات دولہن بیگم، حسینہ بیگم، گنا بیگم، زرینہ اور موتی کا ذکر کیا، مصحفی نے
اپنا یہ تذکرہ ۱۲۰۹ھ میں لکھا، عبدالغفور خاں نسار نے سخن شعراء مصحفی کی تقلید کی۔ انہوں نے ۱۳۸
شاعرات کے حالات اپنے تذکرے میں قلمبند کئے، انیسویں صدی کے آخر ربع میں شاعرات کے تذکرے
قلمبند کئے جانے لگے۔ شاعرات کے تذکرے کی اشاعت کا سلسلہ ”شمیم سخن“ مولفہ عبدالحی بدایونی سے
ہوتا ہے، یہ تذکرہ ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا، یہ تذکرہ اردو میں ہے فصل اول میں باناری عورتوں کا ذکر ہے
فصل دوم میں پردہ نشین اور با عصمت خواتین کا حال ہے۔ ۱۲۴ اشعارات کے ذکر ملتے ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں
نصیح الدین میرٹھی نے اپنا تذکرہ ”بہارستان ناز“ لکھا اس میں لگ بھگ ۱۷۲ اشعارات کے حالات
ملتے ہیں۔ ”تذکرہ نادر“ مولفہ درگاہ شاد نادر اور مولوی عبدالباری آسی نے ”تذکرہ الخواتین“
لکھا لیکن یہ سب شاعرات کے تذکرے ہیں۔

۱۔ نصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ”ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ“

عورتوں کا عام تذکرہ جس میں شہزادوں کے علاوہ مختلف خواتین کے حالات درج کئے گئے ہیں
 ۱۹۰۱ء میں مولوی عباس نے "مشاہیر نسواں" کے عنوان سے ایک تذکرہ قلمبند کیا۔ اس میں
 ہندوستان، ایران اور عرب کے علاوہ یورپ کی مشہور خواتین کے حالات لکھے گئے ہیں جس میں مختلف
 طبقات کی خواتین کے حالات پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ مولوی عباس کا یہ تذکرہ ایک ضخیم اور معلوماتی سہ ہے،
 بے شک اس تذکرے کے مؤلف نے کافی عرق ریزی کے بعد یہ تذکرہ لکھا۔ تذکرہ "مشاہیر نسواں" ٹائٹل
 ۶۵۶ صفحات پر محیط ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کی بنیاد پر لکھا گیا ہے چنانچہ ہر طبقہ کی خواتین کو یکجا کر دیا گیا
 ہے۔

مؤلف تذکرہ نسواں کے پیش نظر اپنے ملک کی خواتین کے کارناموں اور ان کی خدمات سے
 لہذا تذکرہ نگار نے اس تذکرہ کو پانچ حصوں میں منقسم کر کے قلمبند کیا، ہر طبقہ کی عورتوں کو ساتھ ہی
 ساتھ سبھوں کو ایک نظر سے دیکھا چنانچہ مصنف کی فراخ دلی اور وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس کا
 بھی کہ عورتوں کے حالات جمع کرنے کے سلسلے میں ان کی صلاحیتوں اور کارناموں کو مقدم سمجھا گیا ہے۔ یہی نہیں
 صرف ان کے ذاتی کرداروں کو مد نظر رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی طوائف بھی کسی فن کی ماہر ہے یا کسی خاص
 اعتبار سے قابل ذکر ہے تو اسے بھی اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مقدس مسطورات کے
 بھی حالات درج کئے گئے ہیں، اس تصنیف کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر عہد
 حاضر تک تمام مشہور خواتین خواہ وہ کسی بھی فن میں ماہر ہوں سبھوں کو ایک نظر سے دیکھا گیا ہے یعنی اس کتاب
 میں اگر ہاجرہ مسرور کا حال ہے تو اس کے ساتھ ساتھ لٹا منگیشکر کا بھی، اگر بی بی کمال کا ذکر ہے تو
 اس کے ساتھ درگاہ بانی کا بھی۔

یہ تذکرہ بلخی صاحب مرحوم کا باضابطہ تحقیقی کارنامہ ہے، تحقیق و جستجو سے مصنف کو کتنی دلچسپی
 تھی اس کا اندازہ کتاب کی ترتیب کے بعد اگر کوئی نئی بات انہیں معلوم ہوتی تو پریس (Press) میں
 جاتے جاتے مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے۔ مثال کے طور پر چند ماہ لقا جس کا ذکر حصہ اول کے
 صفحہ ۲ پر درج ہے اس کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اس شاعر کا دیوان لندن میں ہے اور صفحہ ۲۳ میں
 لکھا گیا ہے کہ اس دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہو سکی لیکن اتفاقاً اپنی دونوں بلخی صاحب مرحوم کو

حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور کتب خانہ آصفیہ میں اس دیوان کا ایک نسخہ ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ملا۔ چنانچہ موصوف نے اس کا بھی ذکر کر دیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں مرحوم نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ بعض خواتین ایسی بھی ہیں جن سے متعلق مزید تحقیقی ریسرچ اسکالروں کے لئے اچھے خاصے مواد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً جمیلہ جنہوں نے ۸ دوا دین یادگار چھوڑے۔ یعنی اگر کوئی ریسرچ اسکالراپنے تھیسس (Thesis) کا سبکٹ بنائے تو اس کی طرف بھی گویا بلنی صاحبہ نے اشارہ کر دیا ہے۔

فصیح الدین بلنی مرحوم کی تصنیف تذکرہ نسوان ہند ایک خالص تذکرہ ہے۔ لیکن بلنی صاحب کا تنقیدی شعور اس تذکرے میں ملتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ آئندہ باب میں لیا جائے گا جہاں بلنی صاحب کی تنقید نگاری سے متعلق مفصل بحث کی جائے گی یہاں پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کی مشہور شاعرہ چندا کی شاعری کے متعلق بلنی صاحب نے تذکرہ نسوان ہند حصہ شاعرات ص ۱۳ میں اپنی یوں رائے کا اظہار کیا ہے۔

”چندا کی شاعری اس کے ذاتی جذبات و اردات کی ترجمان ہے، طرز بیان میں سادگی اور زبان میں سلاست پائی جاتی ہے۔“

چندا کی شاعری کے متعلق بلنی صاحب مرحوم نے کتنی مدلل اور ناقدانہ رائے پیش کی۔

تذکرہ نسوان ہند صرف ایک تذکرہ ہی نہیں بلکہ اس میں تاریخی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے بلنی صاحب مرحوم نے ان خواتین کے ذکر کے ضمن میں بعض غیر تاریخی واقعات کے پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر چوڑے راجہ رتن سنگھ کی بیوی پدمنی کے متعلق جو قصہ عوام میں مشہور ہے وہ قطعی طور پر غلط ہے۔ یہ قصہ ملک محمد علی کتاب پرمات میں شدومد کے ساتھ مشہور ہے، بلنی صاحب مرحوم نے ان بے بنیاد واقعات کو کس دلیل کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے (بحوالہ خزانہ المفتوح مصنف امیر خسرو)

اے تاریخوں میں علامہ الدین کا چھوڑ پر چڑھائی کرنا مذکور ہے لیکن عوام میں جو فسانہ مشہور ہے اس کا کوئی ذکر نہیں، یہ قصہ ملک محمد کی کتاب پیدائش میں شد و مد کے ساتھ مذکور ہے، پیدائش سن ۱۱۵۴ھ کے قریب یعنی علامہ الدین خلجی کے دو سو برس بعد لکھی گئی، امیر خسرو سلطان علامہ الدین خلجی کے ساتھ فتح چوڑ کے وقت موجود تھے لیکن انہوں نے خزان الفتوح میں پدمی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے، لہذا زمانہ حال کے مورخ پدمی کے عشق کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم تذکرہ نسوان ہند کی روشنی میں صرف ایک تذکرہ نگار ہی نظر نہیں آتے بلکہ ایک مورخ، محقق اور ناقد بھی نظر آتے ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار:

ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم کی دوسری تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے، یہ تذکرہ ان کی وفات کے لگ بھگ سات ماہ کے بعد نیشنل بک سنٹر ڈالٹن کالج (National Book Centre) سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اردو فارسی کے ہندو شعرائے حالات اور نمونہ کلام، ادوار کو مد نظر رکھ کر قلمبند کئے گئے ہیں، کتاب کا مقدمہ چار صفحات پر تذکرہ نگار کا سپرد قلم کیا ہوا ہے اور جس کے آخر میں مصنف کا کتاب کے نام کے ساتھ پتہ ماہ، تاریخ اور سن دیا ہوا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے اپنے انتقال سے لگ بھگ ساڑھے سات ماہ قبل یعنی ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو سپرد قلم کیا تھا، مقدمہ سے قبل احوال ضروری کے عنوان سے نادم بلخی کی نوشتہ بلخی صاحب مرحوم کی مختصر سوانح حیات مع مرحوم کی مطبوعہ تصنیفات کا ذکر ہے۔

یہ تذکرہ تین ادوار میں منقسم ہے یعنی پہلے دور کے شعرائے متقدمین ہندو شعرا کا ذکر ہے جو سن ۱۲۰۰ھ تک سخن طرازی کرتے تھے۔ اس دور کے شعرائے فارسی یا ربختہ میں مشق سخن کرنے والوں

کا ذکر ہے۔ اس دور کے شعراء میں نند لال گویا، راجہ رام نرائن موزوں اور اجاگر چند الفت کا نام خصوصی طور پر لیا جاسکتا ہے، متقدمین دور میں ۲۰ شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا دور متوسطین شعراء کا ہے، یہ دور ۱۲۰۱ھ سے لے کر ۱۳۰۱ھ تک کے وہ شعراء ہیں جو مشق سخن کرتے تھے۔ اس دور میں لگ بھگ ۶۱ شعراء کے حالات ملتے ہیں، اس دور کے ممتاز شعراء میں راجہ پیارے لال الفتحی، کنور سنگھ، راجہ بہادر رحمتی اور رائے بیجناقد پرشاد غنیمت کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

تیسرا دور ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کا ہے، ظاہر یہ دور دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، دور کے آخر کے شعراء کے ضمن میں ایک انگلیس مہرچی دور حاضر کے عنوان سے دی گئی ہے۔ دور آخر کے شعراء میں بابو جگیش پرشاد خلش، اودھ کشور کشتہ گیادی اور کامتا پرشاد ہوش کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تذکرہ میں جتنے بھی ہندو شعراء کا ذکر ہے وہ یا تو فارسی زبان کے ہیں یا اردو زبان کے یا دونوں زبانوں میں مشق سخن کرنے والے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں ان ہندو شعراء کا ذکر ہے جو فارسی یا اردو کے علاوہ کسی اور زبان یعنی سلتھلی اور ہندی کے شاعر ہیں۔ اس تذکرے کو ترتیب دینے کا مقصد خود تذکرہ نگار نے اپنی کتاب کے مقدمے کے آخر میں لکھا ہے :

”اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ صرف بہار میں فارسی اور اردو زبان کی شاعری کی ترقی میں ہندوؤں نے کس کشادہ دلی سے حصہ لیا ہے اور اب تک لے رہے ہیں۔“

اور مقدمہ کے آخر میں مقدمہ نگار نے راسخ عظیم آبادی کا یہ شعر درج کیا ہے :

محو کیا نقش محبت ہو کہ ارباب وفا

جتنے ملتے گئے اتنے ہی نمودار ہوئے

اردو زبان و ادب اس دور میں کس کس پر سی میں مبتلا ہے مرحوم سے بھی تا دمِ مرگ یہ حقیقت پوشیدہ

نہیں رہی۔ شاید اس جذبہ کے تحت بلخی صاحب مرحوم سے یہ راسخ کا شعر لکھوا دیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں سب سے پہلے بلخی صاحب مرحوم نے بہار کے ہندوؤں کی علم دوستی اور

ادب لٹریچر کو سراہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ علمی و ادبی حیثیتوں سے صوبہ بہار شروع ہی سے ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی ممتاز رہا ہے۔

”چندر گپت کے زمانے میں کوشلیا ایک بڑا مقلق اور مدبر گذرا ہے جس کو ہندوستان کا ارسطو کہا جاتا ہے اس کی مشہور تصنیف ارتھ شاستر موریہ خاندان کے راجاؤں دستور العمل رہی اور آج تک مورخ اس کو بڑی اہم کتاب جانتے ہیں، پاٹلی پترا کا ایک باشندہ پانیلنی جس کو دو ہزار برس سے زیادہ گزرے زبان کے اصول و قواعد کو منضبط کرنے کا موجد سمجھا جاتا ہے اور اس کی کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے دنیا میں پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے، اس طرح ملک کے مشہور مہندس، منجم آریہ بھٹ نانی نے علم مہندس اور نجوم پر ایک کتاب تصنیف کی جو اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔“

پاٹلی پترا کے راجاؤں میں مندر گپتا ۳۳۰ء تا ۳۵۰ء فن سپہ گری کے علاوہ شاعری اور موسیقی میں کمال رکھتا تھا۔

”۳۵۰ء کے قریب قصبہ بہار شریف سے پانچ کوس دکن نالندہ کی مشہور دانش گاہ قائم ہوئی جو ہندوستان سے لے کر چین تک مرکز تھا۔“

بلخی صاحب کا یہ مقدمہ نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہے اور اردو دشمنوں کے منہ پر طمانچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حد درجہ کدوکاوش اور تحقیق و جستجو کے ساتھ بلخی صاحب جوم کی وسیع النظری اور گہری علمیت نیز اپنے خاص وطن بہار سے ان کی انتہائی محبت کے نتیجے میں یہ تذکرہ وجود پذیر ہوا بلخی صاحب مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

”۱۷۰۰ء“ بارہویں صدی ہجری میں جب فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو صوبوں کے ہندوؤں نے اردو ہی میں سخن طرازی کی اور ہندو شعرا اور رؤسا اپنے دولت کدوں میں دھوم دھام سے مشاعرہ منقذ کرتے تھے۔ ان میں رائے بیچنا تھ پرشاد غنیمت اور کنور سکھراج بہادر رستمی

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو پڑھنے کے بعد اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ بہار زبان و ادب کے سلسلے میں ہمیشہ عصبیت سے بالکل پاک رہا ہے کیونکہ اس تذکرے میں مجموعی طور پر ۱۲۹ شعرائے محاربات اور کثرۂ کلام کو پیش کیا گیا ہے، خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ہندو شعرا کا ایک تذکرہ قلمبند کیا، اس تصنیف میں سارے ہندوستان کے ہندو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ فیض الدین بلخی مرحوم نے ۱۲۹ شعرا بہار کے حالات و کلام مرتب کر دیے ہیں، ماسوا اس کے صاحب کتاب ایک مورخ اور تذکرہ نویس ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کا محقق اور ناقد بھی ہے چنانچہ اس میں صرف حالات و کلام ہی کو درج کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ہندو شعرا جن کی شاعری کے معاملے میں خصوصی حیثیت ہے، مثال کے طور پر مندلال گویا سے متعلقہ ۲ پر صاحب کتاب نے اپنی ناقدانہ رائے پیش کی ہے۔

”سارادیوان غارناتہ کلام سے ملو نظر آتا ہے اور اشعار کی زبان بھی ایسی سلیس ہے

کہ حافظ شیرازی کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔“

محقق کی حیثیت سے فیض الدین بلخی مرحوم نے کس قدر جستجو سے اس تذکرہ کی ترتیب میں ایمانداری سے کام لیا ہے اس کا اندازہ خصوصی طور پر قارئین کو پہلے باب میں ہوگا جس میں اجاگر چند الفتن مسک تا صلا راجہ رام نرائن موزوں، مندلال گویا صلا تا صلا میں زیر بحث اور تحقیق طلب مسئلے کو کس طرح پیش کیا ہے اس کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہوتا ہے ہر جگہ ماخذ اور حوالے دیئے گئے ہیں۔

اس تصنیف کو پڑھنے کے بعد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مرحوم مزید مواد سے نوازا جا چلتے تھے لیکن خرابی صحت اور موت کے مرض نے انہیں اس کی مہلت نہ دی یہاں تک کہ پوری کتاب کا مسودہ ادراقی پر سلسلہ دار کیجا گیا چنانچہ کتاب شائع ہوئی۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ مسلم شعرائے بہار مرتبہ حکیم سیاحمد اللہ ندوی جو کراچی (پاکستان) سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی اور تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو یکجا کر دیا جائے تو عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک دونوں کتابیں مل کر صوبہ بہار کی فارسی اور اردو شاعری کی مکمل

تاریخ ہو جائے گی بشرطیکہ تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو بھی ٹھیک اسی طرح ادوار پر منقسم کر دیا جائے۔
جس طرح فصیح الدین بلخی نے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو تین ادوار میں منقسم کر کے لکھا۔ لہذا اردو ادب
کتابیں ایسی ہیں جو ہر محقق کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار سے قبل خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ایک تذکرہ اردو کے ہندو شعرائے
لکھا یہ تذکرہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا، ظاہر ہے کہ مولف کے پیش نظر ان ہندو شعراء کے کلام کو پیش
کرنا ہے جو اردو شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ یہ تصنیف ۲۰۶۳ کے سائز پر لگ بھگ ۱۰ صفحات
پر محیط ہے جس میں فاضل تذکرہ نگار نے غیر منقسم ہندوستان کے ہندو شعراء کا حال لکھا ہے، اس تذکرہ
میں شعراء کے حالات زندگی بہت ہی مختصر ہیں، جا بجا شعراء کے ایک یا دو اشعار کو نمونہ کے طور پر پیش کیا
گیا ہے۔ تذکرہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے، اس تذکرہ میں لگ بھگ ۱۰۰ شعراء کے حالات
دئے گئے ہیں لہذا اس تذکرہ کی خامی یہ ہے کہ اس سے اس امر کا انکشاف نہیں ہوتا کہ کون سا شاعر کا تعلق کس
دور سے ہے۔ اس کے برعکس بلخی صاحب مرقوم نے اپنے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو تین ادوار میں منقسم
کر کے لکھا ہے، یہ تذکرہ بہ نسبت خواجہ صاحب کے تذکرہ سے زیادہ معلوماتی ہے، خواجہ صاحب سے
اپنا تذکرہ ۱۹۳۱ء میں غیر منقسم ہندوستان میں لکھا تھا لیکن ایک اردو زبان و ادب کے سلسلے میں وہ یہ بہار
کتنا ملاقاتی عصیت سے پاک ہے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت نے اپنی تصنیف "ہندو شعراء" کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ سماجوں کے
دوش بدوش ہندو بھی اردو زبان کی ترویج و ترقی میں نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں، "دشوں نے لکھا ہے،
سنہ" آج جس قدر اردو زبان کی خدمت ہندو شعراء اور ہندو نثر نگار مستقل طور سے
کر رہے ہیں وہ قابلِ شکر گزاری ہے، تیسرا سودا کے دوش بدوش ہندو شعراء اردو زبان
میں اپنے اپنے جوہر کمالات دکھاتے آئے ہیں اور اپنی مذہبی کتابوں کو اردو زبان میں نظم
کر کے اردو کو ہر و لغز بنانے کی کوشش کی ہے۔ نثر نگاروں نے نثر میں دامن دی

ناموں نے نظم میں گہر نشانی کی، کیا ہم لالہ ٹیک چند بہار، پنڈت دیاشکر نسیم پنڈت
 رتن ناتھ سرشار، پنڈت بشن نرائی ورد، منشی طوطا رام شایان، لالہ سری رام مصنف
 نمٹانہ جاوید، منشی جالپا پرشاد سابق اڈیٹر اردو اخبار، مسٹر برج نرائن چکبست، منشی
 نوبت رائے نظر، منشی سرور جہاں آبادی اور موجودہ دور میں راجہ راجایان، مہاراجہ
 بہادر کرشن پرشاد وزیراعظم دکن، مسٹر تیج بہادر سپرو، ایم۔ اے۔ رائے بہادر پنڈت
 شیونرائن شمیم، پنڈت برجھوین داترہ کیفی، مسٹر منوہر لال زشتی، پرنسپل ٹریننگ کالج
 کھنوا، مسٹر منوہر لال ام۔ اے وزیر تعلیم پنجاب، سردار بھگوان سنگھ ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم
 پیٹالہ وغیرہ کے احسانات سے سجدہ پیش ہو سکتے ہیں جنہوں نے نظم و نثر اردو میں چار چاند
 لگائے اور مختلف زبان کے تراجم سے اردو میں وسعت پیدا کی اور بہت کچھ احسان اردو پر
 مدیران رسائل کا ہے جو درج ذیل ہے۔

(۱) مسٹر دیانرائن نگم بی۔ اے اڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور

(۲) مسٹر چندا منی گھوش، سابق اڈیٹر رسالہ ادیب الہ آباد

(۳) منشی دیوان سنگھ مفتو، اڈیٹر اخبار ریاست، دہلی

(۴) مسٹر جگت سنگھ، پرنسپل مسٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

(۵) ڈاکٹر پورن سنگھ ہنر اڈیٹر رسالہ جہن امرتسر

(۶) مسٹر کنھیا لال ایم۔ اے اڈیٹر رسالہ چاند الہ آباد

(۷) مسٹر مانک چند ناڈ اڈیٹر پرتاپ لاہور

ناسپاسی ہوگی اگر عرصہ بارے میں منشی نول کشور بکینٹہ ہاشی کا نام ذرا موش کر جائیں جو نے
 اردو زبان میں تمام علوم کے ترجمے شائع کر کے اردو کو علمی زبان بنایا، آج تک کسی انجمن کسی پریس، کسی
 ریاست نے اردو کی اس قدر خدمت نہیں کی۔

فیض الدین بلخی مرحوم نے جس وقت اس تذکرہ کو ترتیب دینے کا خیال کیا ہوگا شاید ان کا
 ذہن خواجہ عبدالرؤف عشرت کی طرف مائل ہوگا کیونکہ دونوں تذکرہ نگار کا بنیادی موقع ایک ہی ہے۔

میں اہم مقام کا مستحق ہو جاتا ہے بالخصوص صوبہ بہار میں لکھے گئے تذکروں میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ”ہند و شعرائے بہار“ ایک اہم اہمیت کا حامل ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کے دونوں تذکروں (تذکرہ نسوان ہند اور تذکرہ ہند و شعرائے بہار) کا جائزہ لینے کے بعد اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ موصوف فن تذکرہ نگاری سے بخوبی واقف تھے چنانچہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے تذکرہ نگار پورے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔



باب ہشتم

فصح الدین بلخی بحیثیت ناقد

فصح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں کا جہاں تک تعلق ہے اس ضمن میں ان کے مشہور کتابچہ ”انشاد شاد“ کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، بحیثیت ناقد بلخی صاحب نے کون سی روش اختیار کی، انہوں نے نو کلاسیکی تنقید کی طرف توجہ کی جس کی داغ بیل آزاد، حالی اور شبلی نے اپنی تصانیف میں بنیادی طور پر زیادہ زور دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرقی تنقیدی اصولوں کو مغرب سے زیادہ قریب تر لانے کی کوشش کی گئی تنقید کے اس دور کو نو کلاسیکی کہا جا سکتا ہے، اس گروہ میں مولوی عبدالحق، علامہ سلیمان ندوی، چکبست، حافظ محمود شیرانی، عبدالقادر سروری، حامد حسن قادری وغیرہ جیسے ناقد ہیں، مغربی تنقید اور ادب کے مطالعہ کے باوجود مشرقی حدود کا خیال رکھا، دوسری طرف کچھ ایسے بھی ناقد ہیں جن کی تنقید کچھ حد تک تاثراتی دائرے میں رکھی جاسکتی ہے لیکن اپنے انفرادی نقطہ نظر کی وجہ سے وہ تنقید کو کسی مخصوص روایات سے منسلک نہیں کرتے، نقادوں کے اس گروہ میں سلیم پانی پتی، امداد امام اثر، جعفر علی خاں اثر، مسعود حسن رضوی ادیب، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری، اختر میرٹھی، اختر علی تلہری وغیرہ شامل ہیں، نو کلاسیکی نقادوں کے گروہ میں بعض نے تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دی لہذا ان کے تنقیدی خیالات یا نظریات کوئی امتیازی رنگ اختیار نہ کر سکے۔ فصح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی شعور کے ضمن میں ڈاکٹر مظفر اقبال کی یوں رائے ہے۔

۱۔ انہیں تنقید سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اردو کے تنقیدی ادب سے انہیں مکمل واقفیت تھی۔ وہ قدیم طرز تنقید کے دلدادہ تھے چنانچہ ان کے تنقیدی رسالہ ”انشاد شاد“ میں بھی تنقید کا قدیم انداز ملتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ ”ہماری شاعری“ کو ”اردو شاعری پر اک نظر“ پر ترجیح دیتے تھے۔“

جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے فصیح الدین بلخی کی ناقدانہ صلاحیتوں کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

۲۔ ”نقد شعرو سخن کا انداز آپ کے کتابچہ ”انشاد شاد“ سے ہو سکتا ہے کہ اختاد اشعار شاد عظیم آبادی کی ظاہری و باطنی، لفظی و معنوی، معائب و محاسن کی جزوی گرفت کی گئی ہے ان کے معیار پر اساتذہ سخن کے کلام بھی نہیں اترتے تھے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں میں انشاد شاد کا نام سرفہرست ہے۔ یہ کتابچہ ۲۲ صفحات کا ہے اور $\frac{20 \times 30}{14}$ کی تقطیع پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۹ء میں یہ کتابچہ قومی پریس، بانکپور پٹنہ سے شائع ہوا۔

اس رسالہ میں بلخی صاحب نے شاد کے کلام پر اصولی تنقیدی اور حقیقی تبصرہ کیا ہے اور شاد کے چیدہ اشعار کو زبان و فن کے معیار سے جانچ کر حقیقت کھول دی گئی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاد ایک ممتاز اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کا لوہا منوالیا تھا اور ان کی شاعری کی دھوم سارے ملک میں مچ رہی تھی، خود بلخی صاحب مرحوم کا اعتراف ہے۔

۳۔ خاں بہادر سید محمد علی شاد نہ صرف صوبہ بہار کے بلکہ تمام ہندوستان کے شعرائیں شہرت

۱۔ فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ
 ۲۔ فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت مقالہ سید عبدالرؤف ندوی مخطوطہ
 ۳۔ ملاحظہ ہو انشاد شاد ص ۱

رکھتے تھے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ زبان و بیان کی خامیاں شاد کے کلام میں بھری پڑی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاد کی زندگی میں ان کے نکتہ چینیوں نے ان خامیوں کو خوب اُچھالا، اس ضمن میں شاد اور اپنی لکچ کے جھگڑوں کا نام قابل ذکر ہے۔ شاد کی وفات کے بعد جب یہ رسالہ شائع ہوا تو لوگوں نے شاد کے مخالفوں میں بلخی صاحب کا نام بھی درج کر لیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کو شاد کی ذات سے کوئی کد نہیں تھی۔ ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں :

”شاد کے انتقال کے بعد یہ رسالہ جب شائع ہوا تو لوگوں نے شاد کے مخالفوں میں ایک نام محترمی نصیح الدین بلخی مرحوم کا بھی درج کر لیا۔ حالانکہ اس کو صداقت سے دور کا بھی تعلق نہیں، مرحوم کو شاد عظیم آبادی سے کسی قسم کی کد نہیں تھی اور نہ ہی رسالہ انشاد شاد اس جذبہ کے تحت لکھا گیا۔“

بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”سہ“ یہاں شاد کے کلام پر حقیقی تنقید و تبصرہ منظور ہے، میں نہ ان کا حریف نہ حامی نہ مخالف اور نہ ان کے ذاتی حالات سے بحث کا سروکار رکھتا ہوں۔

کفر است در شریعت ما کینہ داشتن : آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

دوسری جگہ تحریر فرمایا ہے :

”سہ“ اس تحریر سے کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے وطن کو زبان کی صحت و فصاحت کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے لکھا ہے۔ شاد اب زندہ نہیں اور حقیقتاً ان کے کلام سے کوئی بحث نہیں تھی لیکن غلط زبان کو میرا نہیں کی زبان کہہ کر تحسین و

”سہ“ ملاحظہ ہو نصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

”سہ“ رسالہ انشاد شاد ص ۲۴

”سہ“ ”سورہ بھی خوش ہے“ مقالہ پروفیسر عبدالغنی مخطوطہ

د آفریں کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے اور مشہور اہل زبان اور سائنس دان کے کلام کے مقابلہ میں شاد کے کلام کو پیش کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی شاد کو نہیں پہنچا۔

اردو کے مشہور ناقد پروفیسر عبدالغنی کے مقالہ ”سو وہ بھی خموش ہے“ سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم شاد کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے ساتھ ہی ساتھ موصوف کی تنقیدی روحان کا بھی پتہ چلتا ہے وہ کہتے ہیں :

”بلخی صاحب مرحوم کی ذات بہار خصوصاً عظیم آباد میں ہونے والے ہر علمی کام کا مرجع تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ بلخی صاحب ایک زمانہ میں شاد کی علمی مخالفت کے سربراہوں میں رہ چکے ہیں چنانچہ فن شاعری میں شاد کے نقائص کو ایک رسالہ ”انشاد شاد“ میں بیان کر چکے ہیں، اس پس منظر میں میرا گمان تھا شاید وہ مجھ سے تعاون نہ کریں لیکن اس دور کے عظیم آباد میں شاد کے معاملات کی واقفیت بلخی صاحب سے زیادہ کبھی کو حاصل نہ تھی لہذا ۱۹۵۹ء میں شاد کے رہگذر کا سراغ لگانے کے لئے بلخی صاحب کے در پر ہزار بار جانا پڑا..... میرے سلام کرنے کے بعد دعا پوچھا اس کے بعد بغیر کسی تامل اور تکلف کے گھنٹے بھر اس ولولے سے باتیں کرتے رہے جیسے یوم شاد کا انعقاد انہیں کی تجویز پر ہو رہا ہے آپ سمجھتے ہوں کہ شاد کے متعلق ان کے خیالات بدل گئے ہوں لیکن آپ کو سب کے حیرت ہرانی چاہیے کہ یوم شاد کے متعلق مذکورہ تمام کرم فرمایوں کے ساتھ بلخی صاحب نے ساتھ اہتمام کے مجھے اپنا کتابچہ ”انشاد شاد“ اس تہیہ کے ساتھ دیا کہ شاد کی شاعرانہ عظمت مسلم لیکن ان کے نقائص کو بھی پیش کرنا چاہئے تاکہ ان کی پوری شخصیت دیانتداری کے ساتھ سامنے آئے ورنہ علم و تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔“

اس طویل اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی کی شاعری سے بلخی صاحب سرے سے منکر نہیں تھے اور ان کی شاعری کی جو خوبیاں تھیں اس کے وہ قائل تھے۔

اس رسالہ کی تصنیف کے وقت بلخی صاحب کے پیش نظر کلام شاد مطبوعہ ۱۹۲۳ء اور
 میخانۃ الہام مطبوعہ ۱۹۲۹ء اور وہ اشعار تھے جو شاد کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز شاگرد نے
 رسالہ "ندیم" کیا میں شائع کرائے تھے۔ "کلام شاد" شاد کی زندگی میں شائع ہوا تھا اس میں رسالہ
 "الناظر" اگست ۱۹۲۳ء کا تبصرہ موجود تھا بلخی صاحب مرحوم نے انشاد شاد کے ابتدائی اوراق میں اس
 گراف قدر تبصرہ کا ذکر کیا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

سے "چونکہ اس دیوان پر ایک اہل زبان کی تنقید موجود ہے اس لئے فی الحال نئی تنقید لکھنا
 فضول سمجھ کر سابق تنقید کے اعادہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس کتابچہ میں حسب ذیل عنوانات کو پیش کر کے شاد کے اشعار کے نقائص کا جائزہ لیا گیا ہے۔
 عامیانه مذاق، سوقیانہ انداز بیان، زبان و محاورات کی غلطیاں، تناقص، شتر گریہ،
 حشو و زوائد، ردیف کا چسپاں نہ ہونا، زبان و فن سے نا آشنا ہونا، سرقہ کلام، عروج کے عوض ہبوط،
 اصلاح و ترمیم۔

رسالہ "انشاد شاد" کی اشاعت کے بعد شاد کے ایک عزیز شاگرد جناب حمید عظیم آبادی نے
 اپنے استاد کے کلام کے اعتراض کے جواب میں اپنا ایک کتابچہ "کھلا چیلنج" لکھا، راقم نے عصر صبح الدین
 بلخی میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، رسالہ "کھلا چیلنج" "انشاد شاد" کا معقول اور موثر جواب نہیں۔
 بلخی صاحب مرحوم کے جو اعتراضات کلام شاد پر رسالہ "انشاد شاد" میں ملتے ہیں وہ اپنی جگہ مناسب اور
 درست ہیں۔

رسالہ "کھلا چیلنج" میں حمید صاحب نے بلخی صاحب کے اعتراضات کو صرف الفاظ کی اُلٹ پھیر میں
 گم کر دیا ہے بلکہ اس میں طعن و تشنیع ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رسالہ کی ابتدا میں حمید صاحب نے یہ لکھا ہے کہ
 بلخی صاحب اس رسالہ کی صرف ترتیب دینے والوں میں ہیں، حمید صاحب نے لکھا ہے۔

۱؎ ”جب رسالہ فصیح صاحب کے نام سے شائع ہوا تو اس میں نقاب پوش کی شرکت کس دلیل کی بنا پر سمجھی گئی۔ مرتب کا لفظ بتا رہا ہے کہ فصیح صاحب صرف ترتیب دینے والوں میں ہیں اور اس رسالہ کا مصنف یا مؤلف کوئی اور ہی ہے۔“

حمید صاحب نے اپنے رسالہ ”کھلا چیلنج“ میں یہ لکھا ہے کہ بلخی صاحب اردو زبان سے ناواقف ہیں، نیز فن عروض کا انہیں ذرا بھی علم نہ تھا، انہوں نے لکھا ہے۔
 ۲؎ آپ کیا جانیں اردو کیا ہے، عروض کس چڑیا کا نام ہے
 اس طرح رسالہ ”کھلا چیلنج“ جا بہ جا طعن و تشنیع کے الفاظ موجود ہیں۔
 بلخی صاحب نے ”انشاد شاد“ میں لکھا ہے۔

۳؎ میں فن کے معیار سے جانچ کر دکھانا چاہتا ہوں کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیسا ہے۔
 بلخی صاحب نے کلام شاد کے نقائص کی کئی سرخیاں قائم کی ہیں۔ انہوں نے حسب ذیل میں عامیانہ مذاق اور سوقیانہ انداز بیان کے نقائص کو ظاہر کیا ہے۔

شاد کا شعر : ۴؎ حیرت زدہ ہوں کیوں نہ جوانی سے چھوٹ کے
 سب نفت مال لے گئی کجخت لوٹ کے

تبصرہ : مصرع ثانی میں ابتذال کا اشتباہ ہے ایسے مصرعے صاحب قراں (مکھنوکے فحش گو شاعر) کے دیوان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

شاد کا شعر : ۵؎ خرام ناز میں کہتا ہے دُورا ان کی گردن کا
 نہیں اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ گردن کا

۱؎ ”کھلا چیلنج“ ص ۲ تا ۳

۲؎ نقاب پوش سے مراد اکبر مبارک عظیم آبادی کی ذات ہے۔

۳؎ بلخی صاحب کا خود نوشتہ ”انشاد شاد“ آج بھی محفوظ ہے۔ م۔ ب

۴؎ انشاد شاد ص ۵

تبصرہ: لکھنؤ میں جب ذوق شاعری بہت ہوا تو شعرا ایسے ہی شعر کہنے لگے تھے۔
زبان و محاورات کی غلطیاں

شاد کا شعر: لکھے ہیں سخت کلامی کے نرم نرم جواب
 قلم کی نوک سے ہم نے پہاڑ ٹیلے ہیں
 تبصرہ: ٹیلے صحیح نہیں ٹالنے کے عوض ٹیلنا کہہ دیا اور اکیلے اور جھیلے کا قافیہ قرار دیا ہے۔
 شاد کا شعر: نکل کے روح ڈنوا ڈول ہو بجائے کہیں
 ہزار حیف نہ دنیا کے ہیں نہ دبیہ کے ہم
 فصحا کی زبان سے ڈنوا ڈول البتہ سنا گیا ہے، ڈنوا ڈول بجذف اول الف نظر سے نہیں
 گذرا شاید عالم تذبذب میں نظم ہو گیا ہے "بھٹکتی تم بھی ڈنواں ڈول نیت اپنی رہنے دو" (داغ)
 شاد کا شعر: ترے فراق کے صدمے جو بڑھنے لگتے ہیں
 نیا خیال نیا دھیان گڑھنے لگتے ہیں
 تبصرہ: بڑھنے کا قافیہ گڑھنے غیر فصیح ہے اہل زبان گھڑنا بولتے ہیں اس کا قافیہ لڑنا
 اور پڑنا وغیرہ آتا ہے۔ علاوہ اس کے بات گڑھنا بولتے ہیں۔ خیال اور دھیان گڑھنا مہمل اور
 خلاف محاورہ ہے۔

۱۰ تناقص

تناقص کی سرخی کے تحت ملحق صاحب نے لکھا۔
 زبان کی خامی اور طرزِ ادا کی خرابی سے بعض اشار کے مضامین میں تناقص کی کیفیت پیدا
 ہو گئی ہے۔

شاد کا شعر: بہت سے جام تھے پیرمناں کے پیش نگاہ
 کسی کو نیست کیا اور کسی کو ہست کیا

تبصرہ: نیست کرنا فنا کرنے کے معنی اور ہست کرنا وجود میں لانے کے معنی میں بولتے ہیں لیکن جو شے پیش نگاہ ہو اس کا وجود ثابت ہے اس کے لئے ہست کرنا صحیح نہیں کیونکہ ایک ہی شے کو بیک وقت موجود اور معدوم نہیں کہہ سکتے۔

شتر گریہ

اس عنوان کے تحت بلخی صاحب نے شاد کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔

تبصرہ: ضمائر کی عدم مطابقت کا حال کلام شاد کے تبصرہ میں مذکور ہو چکا ہے۔ میخانہ الہام کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں۔

مرے یاران رفتہ کھو گئے اے شاد کچھ ایسے کہ اب ان ٹٹے فالوں کی ہمیں تربت نہیں ملتی
جھی کو اک نہیں سائے جہاں کو ہے یہ گلہ کہ تیرے ہوتے غم بیشمار ہم دیکھیں
پہلے شعر میں مرے اور ہمیں اور دوسرے شعر میں جھی کو اور ہم کیوں ہے؟ اور جھی کو اک نہیں کی جگہ
اک جھی کو نہیں فصیح ہوتا۔

۱۰ حشو و زوائد

حشو و زوائد سے مصرع کا وزن پورا کرنا قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے، اہل فن کا اس پر اتفاق ہے کہ شاعر کامل کے کلام میں حشو قبیح نہیں ہوتا، شاد کے ہاں یہ عیب کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ذیل کے اشارے بطور مشق نمونہ از خردارے پیش کئے جاتے ہیں، ان میں نشان دادہ الفاظ محض حشو ہیں بلکہ بعض شعر میں حشو الفاظ سے معنی میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔

شاد کا شعر: مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے

آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاد اب میں ہم

تبصرہ: ایسے میں اور ابھی دونوں فرمایا ہے ان میں سے ایک حشو ہے۔

۱۱ " الشاد شاد " ص ۱۱

۱۲ " " " ص ۱۲

۱۔ ردیف کا چسپاں نہ ہونا

ایک خوشگوشاعر اپنی ردیف کو اس طرح چمکاتا ہے کہ شعریں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شاد اپنی ردیف کو سنبھال نہیں سکتے۔ کہیں ردیف محض بیکار ہے کہیں غلط ہے کہیں کمزور ہے اور کہیں چسپاں نہیں۔

شاد کا شعر: آئے تھے دم نزع وہ اے روز قیامت

اس روز زیارت ہوئی یا آج کی تاریخ

تبصرہ: کی تاریخ حشو قبیح ہے اس سے مصرعہ ثانی مہل ہو گیا۔

شاد کا شعر: اسی کے واسطے چنتا پھروں تنکے زمانے میں

کرکتی گر پڑے بجلی الہی آشیانے میں

تبصرہ: مصرعہ ثانی کی ردیف غلط ہے آشیانے پر بجلی گر پڑے کہنا چاہئے تھا

روز مرہ جاننے والا بھی ایسی غلطی نہیں کرتا۔

شاد کا شعر: کیوں کر مٹے گی دل سے کدورت بتائیے

مانا کہ بخشہ دیں وہ ہمارے قصور تک

تبصرہ: ردیف تک حشو کے طور پر ہے یا نہایت کمزور ہے۔

۲۔ زبان و فن سے نا آشنا ہونا

بلخی صاحب کا خیال ہے کہ شاد کے کلام میں زبان و فن کی بے شمار غلطیاں ہیں، انہوں نے

لکھا ہے کہ ان کو زبان کی صفائی کی طرف کوئی رجحان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کے کلام سے

فصاحت کو سوں دور نظر آتی ہے۔

شاد کا شعر: کھلا ہے بام پر جوڑا کسی کے جعد سکیں کا

کہ مجھ تک بوئے گیسو کا رواں درکارواں پہنچی

تبصرہ: بام پر جوڑا وجعد و گیسو، کارواں درکارواں محض الفاظ ہیں، الفاظ میں حقیقتاً

شاعر نے وحید الہ آبادی کے شعر کو غارت کیا ہے، قادر الکلام شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی کے

ساتھ نظم کیا ہے، مقابلہ کرنے سے ناقص و کامل کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

۵ معطر ہے اسی کوچہ کی صورت اپنا صحرا بھی

کہاں کھولی ہیں زلفیں یا رنج و شہد کہاں تک ہے

شاد کا شعر: آنکھوں سے سو جھنا بھی گیا انتظار میں

شیشے خراب ہو گئے اس دور میں کے

تبصرہ: آنکھوں سے سو جھنا بھی گیا کہنے سے بعد اپن ظاہر ہوتا ہے کسی مشاق شاعر نے

مصرع اول کو سکر یوں اصلاح دی۔

۵ پتھر گئی ہیں آنکھیں مری انتظار میں

شیشے خراب ہو گئے اس دور میں کے

شاد کا شعر: رہے ہر حال میں جو مطلق جینا اسی کا ہے

پلائے جس کو خود پیرمغاں پینا اسی کا ہے

تبصرہ: مطلع کے دونوں مصرعے دو لخت ہیں ان میں جو ربط ہونا چاہئے وہ مفقود ہے۔

۱۷ سرقہ کلام

سرقہ کلام کے ضمن میں بلخی صاحب کا خیال ہے کہ شاد کے یہاں یہ عیب نمایاں طور پر ہے،

ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو (شاد)

اتنی سی زیست پر اللہ مصیبت یہ ہے موت کی قید لگا دی ہے غنیمت یہ ہے (دیر تقی میر)

غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا زمین کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا (شاد)

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے زمین سخت ہے آسماں دور ہے (مثنوی شوق)

تبصرہ: معنوں اڑا لینے پر بھی شعر بھل ہو گیا، فلک تو دور ہے اس کے لئے ہو جانا کیا ؟

۷ جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا سنا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا (شاد)
 ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا پیٹھ پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ ترا
 (شاد نور الحق متیاں)

۸ عروج کے عوض ہبوط

شاد کے کلام میں جہاں تک زبان کا تعلق ہے بعض ایسے نونے بھی ملتے ہیں جو ان کے زمانے سے بہت پہلے متروک ہو چکے تھے۔ اس کے متعلق الناظر نے لکھا ہے کہ کہیں کہیں حیدر آباد کی قدیم اردو کا بھی لطف مل جاتا ہے لہذا دیوان میخانۃ الہام میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔

بار جن کلیوں پہ تھیں پر چھائیاں اے صبا پہلے وہی مرتجباتیاں
 شاد بیماروں کا بچنا ہے محال ہجر کی راتیں جو ابکے آئیاں

اصلاح و ترمیم

شاد کے ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں کہ شاد مرحوم اپنے دیوان کی غزلیات کی ترتیب و تدوین میں عمر بھر منہمک رہے۔ ہر غزل پر بار بار نظر ثانی فرماتے اور ہر ہر شعر پر وقتاً فوقتاً اصلاح و ترمیم کرتے رہتے تھے۔

اس تحریر کا جواب ملجنی صاحب نے یوں دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

۸ اصلاح و ترمیم ہر ایک شاعر کا کام نہیں اس کے لئے استاد فن کا ہونا ضروری ہے اور جس شاعر کے کلام میں زبان کی خامی، بندش کی سستی، روزمرہ اور محاورات کی غلطیاں اور ہر قسم کے عیوب موجود ہوں اس کو استاد فن نہیں کہہ سکتے۔ شاد نے اپنے کلام کی جو اصلاح و ترمیم کی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادتاً اکثر یا غلط کہا کرتے تھے، بعض اصلاح و ترمیم کے متعلق تلامذہ بھی معترف

ہیں کہ ان سے شعر میں کوئی ترقی نہ ہوئی دلی صاحب نے اپنے استاد کے شعر پر جو اصلاح دی ہے یقیناً قابل داد ہے۔

شاد کا اصل شعر: بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں پھینک آیا میں کہاں کس کو دیا
اصلاح: دل کی پروا تک نہیں ہے بے خودی کیا کیا پھینکا کہاں کس کو دیا
ترتیب: بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں کیا کیا پھینکا کہاں کس کو دیا
تبصرہ: غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرعہ اول "شب سے" کہنے کی کوئی حاجت نہیں تھی، یہ ٹکڑا وزن پورا کرنے کے لئے کھٹونس دیا گیا ہے اور اصلاح شدہ مصرعہ آخر میں جہل کاف کے قاعدے سے چھ کاف کا التزام ہے جس سے لفظ میں گرائی پیدا ہو گئی ہے، شاد کو مصمون کی جھلک نظر آئی لیکن طبیعت رو بہ راہ نہ تھی، اور زبان پر قدرت نہ تھی، زبان اُلجھ کر رہ گئی، دیکھئے اسی قسم کے مصمون کو کہنے والا کس صفائی سے نظم کرتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو دیر سے انتظار ہے اپنا (دیر)
کس نے یہ ہمیں بھٹلا دیا ہے معلوم نہیں کدھر گئے ہم (خواجہ درد)
کچھ بھی یاد ہے کہاں ہوا گم کس سے پوچھیں سراغ دل کا
(عشق عظیم آبادی)

اس رسالہ کی آخری تین سرخیاں "اول سرخی" شاعری کا اشتہار اور شاگردوں کی پکار "دوم" "شاد کا اختراع و تصنیف" سوم "مقدمہ نگار کی تلاش" ہے۔
شاعری کا اشتہار اور شاگردوں کی پکار
اول الذکر سرخی کے تحت بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

شاگردوں کا پروگینڈہ کسی شاعر کو شاعر کامل یا استاد فن نہیں بنا سکتا اس کے برعکس شاد عظیم آبادی نے حلقہ تلامذہ کو وسیع بنانے کی انتھک کوشش کی یہاں تک کہ شاد غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں کو مشاعرے میں پڑھنے کے لئے دیتے تھے جس کا اعتراف حمید صاحب اور دلی کا کوی نے بھی کیا ہے، بعض خود دار اشخاص جو وقتی اثر کے تحت حلقہ تلمذ میں داخل ہوتے تھے اصلاحوں کو دیکھ کر

ہمیشہ کے لئے منحرف ہو جاتے۔ شائق، سوج، اور واعظ کا نام سرفہرست ہے۔ مولوی واعظ الدین عرف پلٹو میاں کے متعلق یہ شعر مشہور ہے۔

سہ دفتر سے شاعری کے تیرا نام کٹ گیا شاگرد ہو کے شاد کا پلٹو پلٹ گیا
شاد کا اختراع و تصرف

شاد کے کلام میں زبان و فن کی بے شمار غلطیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں ان پر سخت اعتراض ہوئے، ان کی وفات کے بعد بھی ان کے شاگردان جواب دینے سے عاجز رہتے تھے۔ چنانچہ شاد کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے شاد کی متروکات کی جائزہ الاستعمال کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی۔ بلخی صاحب کا یہ خیال ہے کہ شاد کو اختراع و تصرف کا کوئی حق حاصل نہ تھا، اردو کا رواج عظیم آباد کے ایک محلہ یا حلقہ تلامذہ شاد تک محدود نہیں یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ میں بولی جاتی ہے۔ اختراع و تصرف ایسے اہل زبان کو زیب دیتا ہے جس کی زبان سارے ملک میں مستند تسلیم کر لی گئی ہو۔ ہر کس و ناکس کا اپنے آپ کو اہل زبان اور زبان کا محقق تصور کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔

مقدمہ نگار کی تلاش

میخانۃ الہام کے مرتب جناب حمید عظیم آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے گزارش کی۔ لیکن انہوں نے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ پھر سلیمان ندوی سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے بھی دھیان نہ دیا۔ آخر میں نیاز فتحپوری سے میخانۃ الہام کا مقدمہ سپرد قلم کرنے کی استدعا کی گئی لیکن انہوں نے اس سفارش کو التوائیں ڈال دیا۔

اس رسالہ کے اختتام میں بلخی صاحب نے شاد کی شاعری کے متعلق اپنی رائے یوں پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

”شاد ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشوق شاعر تھے۔ ان کو استاد فن اور میر انیس کا ہمسرہ نہنا بلاغت میں غالب سے برتر اور سلاست زبان میں داغ سے بہتر قرار دینا سراسر لغو و مضحکہ خیز بات ہے۔“

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاد کے کلام میں زبان و فن کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ بلخی صاحب کے اعتراضات اپنی جگہ پر بالکل درست ہیں کیونکہ عام نگاہوں سے یہ نقائص پوشیدہ تھے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں۔

”بلخی صاحب مرحوم کو شرف نگاہی اور نکتہ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی باریک بین نگاہ سے یہ عیوب پوشیدہ نہ رہ سکے۔“

اس کے برعکس پروفیسر ابو ذر عثمانی کے خیالات رسالہ انشاد شاد کے متعلق اچھے نہیں،

ان کا یہ خیال ہے۔

”بلخی صاحب نے کوشش کی ہے کہ وہ شاد کے کلام کو فن کے معیار سے جانچیں اور

یہ دکھائیں کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے معیار فن کو اس قدر

محدود کر لیا ہے کہ نہ تو وہ شاد کے کلام کی روح تک پہنچ سکے نہ اس کے محاسن کو ہی دیکھ

پائے، ان کی نظر صرف چند الفاظ و محاورات کے دام میں الجھ کر رہ گئی ہے۔“

عثمانی صاحب رسالہ ”انشاد شاد“ کی اہمیت کو کچھ حد تک ضرور دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

”یہ کتاب اگرچہ بلخی صاحب کا کوئی دقیق کارنامہ نہیں لیکن ایک بے لاگ پیشکش ضرور

ہے اور اس لحاظ سے قابل داد ہے۔“

مختصر یہ کہ شاد کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ساتھ ہی شاد کا صحیح مقام تعین

کرنے کے لئے ”انشاد شاد“ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بحیثیت ناقد بلخی صاحب کا تعلق اردو تنقید

کے قدیم دبستان سے تھا وہ نو کلاسیکی تنقید کے پیرو اور مداح تھے۔

۱۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مخطوط

۲۔ بہار میں اردو تنقید کا ارتقاء رسالہ ص ۸۴ بہار ہنر

۳۔ ” ” ” ” ” ” ” ”

فیض الدین بلخی مرحوم کی دیگر تصنیفوں میں "تذکرہ نسوانِ ہند" اور "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" کا نام سرفہرست ہے، ان دونوں تصنیفوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ بلخی صاحب کا ایک خالص تحقیقی کارنامہ ہے لیکن ان کی تنقید کا تاثراتی انداز ہر جگہ موجود ہے "تذکرہ نسوانِ ہند" میں جہاں بلخی صاحب نے کسی معروف شاعرہ کی شاعری کا ذکر کیا ہے وہاں ان کے تنقیدی جملے مل جاتے ہیں، مثال کے طور پر دکن کی مشہور شاعرہ چندا بہ لقا کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

لے "چندا کی شاعری اس کے ذاتی جذبات و واردات کی ترجمانی ہے، طرز بیان میں سادگی اور انداز بیان میں سلاست پائی جاتی ہے۔"

بہار کی مشہور شاعرہ جمیلہ کی شاعری کے ضمن میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

لے "پُرگوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سات دیوان مرتب کر کے یادگار چھوڑا۔ شاعرات کا لکھا ذکر، شاعروں میں بھی کم ایسے ہیں جنہ کے کلام کی تعداد اس حد تک پہنچی ہو..... ان کے اشعار کی زبان سلیس اور ابتذال سے بالکل پاک ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کا تنقیدی معیار کیا تھا۔ ان کی تنقید میں نہ کسی کی تضحیک ملتی ہے اور نہ کسی کی تعریف، تنقید کا اصل معیار پرکھنا ہوتا ہے اور وہ اپنی تنقید میں تاثراتی انداز ہر جگہ برقرار رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید جدید سے بالکل مطمئن نہ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ تنقید کو کسی دبستان سے منسلک کرنے کے بھی قائل نہ تھے۔

فیض الدین بلخی مرحوم کا دوسرا تذکرہ "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے اس میں فاضل تذکرہ نگار نے تاثراتی تنقید کو برقرار رکھا ہے، جس شاعر کے کلام سے بحث کی گئی ہے وہاں تنقیدی جملے یا فقرے ہمیں مل جاتے ہیں، مثال کے طور پر فارسی زبان کے مشہور شاعر مندلال گویا کی شاعری کے

متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”ساراد یوان عارفانہ کلام سے ملو نظر آتا ہے اور اشعار کی زبان ایسی سلیس ہے کہ حافظ شیرازی کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔“

فیض الدین بلخی مرحوم کا نثری میدان مقالہ نویسی یا مضمون نگاری بھی ہے۔ اس کی تفصیلی بحث آئندہ کے ابواب میں کی جائے گی۔ سر درست ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی مقالہ نویسی میں بھی تنقیدی عنان بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مقالوں میں تنقیدی جملے مل جاتے ہیں، راسخ عظیم آبادی کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”ابتدال مضامین سے ان کا کلام بالکل پاک ہے، سنگھی، چوٹی، بوس و کنار اور اس قسم کے بھڑکے مضامین سے ان کا کلام بالکل پاک ہے بلکہ حق یہ ہے کہ کلام کی پاکیزگی میں راسخ اپنے استاد قمر سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔“

علامہ شوق نیوی عظیم آبادی کی شاعری کے ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کے یہ تاثرات ہیں۔

”شوق نیوی کی شاعری میں لکھنؤ کا رنگ غالب تھا۔ وہ شاعر سے زیادہ استاد فن تھے، کلام ہر طرح بے غیب اور نازک پلک سے درست ہوتا تھا اور اس کی طرف ان کی توجہ زیادہ مبذول رہتی تھی۔ شعر میں جذبات کم ہوتے تھے اور خود بھی ان کو احساس تھا۔“

ضیاء عظیم آبادی کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے اپنا خیال یوں پیش کیا ہے۔

”ان کا کلام ذاتی جذبات و قلبی واردات کا آئینہ دار ہے۔“

راز بلخی کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب کے یہ تاثرات ہیں۔

”تذکرہ ہندو شعرائے بہار ص ۳۱“

”راسخ عظیم آبادی مقالہ فیض الدین مرحوم رسالہ صنم بہار نمبر ۱۱“

”شوق نیوی ” ” ” رسالہ اشارہ پٹنہ

”عظیم آباد کا ایک جوان مرگ شاعر رسالہ تہذیب پٹنہ

”اردو میں مشکل زمین ایجاد کرتے تھے اور طبع آزمائی کرتے تھے۔“

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملجی صاحب مرحوم کا شمار نوکلا سکی نقادوں میں ہو سکتا ہے جس کی داغ بیل مالتی، شبلی اور آزاد نے ڈالی تھی، صوبہ بہار کے نقادوں کے اس گروہ میں امداد امام اشرف، عبدالغفور شہباز، علامہ شوق نمبر، سید سلیمان ندوی، عزیز الدین ملجی مرحوم اور فصیح الدین ملجی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔



باب نم

فصیح الدین بلخی مرحوم حقیقت مضمون نگار

فصیح الدین بلخی مرحوم نے مضمون نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ چنانچہ ان کے مضامین ہندوپاک کے مشہور جرائد میں اکثر شائع ہوتے تھے، بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں :

”بلخی صاحب مضمون نگاری کے مقابلہ میں کتب نویسی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ایسی بات نہیں کہ انھوں نے مضامین یا مقالے نہیں لکھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے کافی تعداد میں مقالے لکھے ہیں جو ہندوستان کے موثر ادبی جرائد میں شائع ہوئے ہیں لیکن وہ باتوں کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کے قائل تھے اس لئے کسی موضوع پر مکمل کتاب لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔“

راقم کی تحقیق کے مطابق بلخی صاحب کا پہلا مضمون ”منیر دہار میں مسلمانوں کی آمد“ رسالہ ”ندیم“ بہار منبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، اس مضمون کی اشاعت کے بعد بلخی صاحب مرحوم ہندوستان کے طول و عرض میں مورخ مشہور ہوئے۔ اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالے سے لکھا تھا۔ اس مضمون کی اہمیت کے سلسلہ میں سہیل عظیم آبادی مرحوم نے اپنے مقالہ

”فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ“

”بلخی صاحب یوں لکھا ہے۔

”اے“ بین سید بلخی صاحب مرحوم کے نام سے اس وقت آشنا ہوا جب ندیم کا پہلا بہار نمبر شائع ہوا۔ ندیم کا یہ بہار نمبر بہت سے بہاری بالکمالوں کو متعارف کرائے کا سبب بنا۔ مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالوں سے یہ مضمون لکھا تھا۔ مجھے مضمون بے حد پسند آیا۔ میں نے انجم صاحب کو خط لکھا تو اس مضمون کا سب سے پہلے ذکر کیا، اس مضمون میں بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

”اے“ منیر کے محذوم زلموں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۴۶ھ ۵۸۰ھ میں حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا۔ اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں پچیس آدمیوں کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں اور فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے۔

یافت چوں برہ راجہ منیر ظہر
داد امام از دیں جہانے را نوی
ہست منقول از بزرگان سلف
سال آن دین محمد شد قوی

یہ مضمون اس نوعیت کے اعتبار سے خالص تاریخی ہے، مورخین اس مضمون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، نیز صوبہ بہار کے کئی محققین نے بھی اپنے تحقیقی مقالے کی ترتیب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کا دوسرا تاریخی مضمون ”قلعہ ہتاس کی تاریخ“ رسالہ معاصر پٹنہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے تاریخی حوالوں اور کتبوں کے حوالے سے لکھا

”اے“ فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں، مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوط
”اے“ ”بلخی صاحب“ مقالہ سہیل عظیم آبادی۔

ہے۔ یہ ایک کافی ضخیم اور معلوماتی مضمون ہے، عہد قدیم سے لے کر اسلامی سلطنت تک کے واقعات
پتہ چلتا ہے۔ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

”لے“ روایتوں کے مطابق اس قلعہ کا بانی ریتا سوا بیر چندر یا خود راجہ ہریش چندر تھا لیکن
اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں، اس میں شک نہیں کہ قلعہ ہندوؤں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا لیکن موجودہ قلعہ
اور عمارتیں مسلمانوں کے عہد کی بنی ہوئی ہیں، ہندوؤں کے عہد کے متعلق چند کتبے چٹانوں اور پتھروں پر
پائے گئے ہیں جس کا ذکر ڈسٹرکٹ گزیٹیر اور بیکائین کی رپورٹ میں مذکور ہے۔“

آگے چل کر بلخی صاحب نے مسلمانوں کے عہد کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے :

”طبقات اکبری اور دوسری تاریخوں کے مطابق ۱۵۳۹ء میں جب ہمایوں قلعہ چنار فتح
کر کے جگال کی طرف روانہ ہوا۔ شیر خاں بنگالہ کا خزانہ لیکر چنار کھنڈ یعنی چھوٹا ناگپور کی راہ
سے راہ بنگالہ کی طرف آیا اور چنتا من اس قلعہ کو ایک برہمن کے ذریعہ حرم دلا کر خزانہ اور
عورتوں کو قلعہ میں رکھنے کے لئے ڈولیوں میں پٹا پیوں کو بیچ کر اچانک اس قلعہ پر قبضہ کر لیا۔“
بلخی صاحب مرحوم نے اس تاریخی مضمون میں مسلم عہد کے دو کتبوں کی نقلیں بھی پیش کی ہیں۔ آخری الذکر کتبے
کی نقل یوں ہے۔

ساقی خاں کا مقبرہ ۹۸۶ھ

جیش خاں کی مسجد سے کچھ دور پورب ایک احاطہ کے اندر ساقی کی قبر ہے جس کے قریب ایک
چبوترہ قناتی مسجد کے طور پر ہے محراب کے اوپر دو فٹ لابی اور بیس اونچ پوڑی لوح میں یہ اشعار کندہ ہیں۔

فناں از گردش پرنج ستمگر	کہ نمود با کس اورا مہربانی
خلف ساقی سلطان و دول	کہ گردد مفتخر باسم قانی
قضا را آنچنان رنجور گردید	کہ از صحت نبود اورا نشانی
باو یک اجل آمد بگفتا	سفر کن زود ازیں دینائے قانی

”بلخی صاحب“ مقبرہ سہیل عظیم آبادی

سفر کرد ادا ازین عالم سبکدم
بجستم از خرد تاریخ فوشتش
این باید کردگار لامکانی
بگفتا در بہشت جاودانی

۹۸۶ھ

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اور تاریخی مضمون ”پلاموں کی تاریخی سرگزشت“ رسالہ ”کوئل“ ڈاکٹر گنج میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بلخی صاحب مرحوم کی وفات سے چند ماہ قبل ’کوئل‘ کے اوّل شمارہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب نے پلاموں کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے یوں لکھا ہے:

”ہے پلاموں کی وجہ تسمیہ تین طور پر بیان کی جاتی ہے، اول یہ کہ یہ لفظ پلانا سے ماخوذ ہے جس کے معنی استقامت نہ کرنے کی جگہ ہے، دوم یہ کہ پل۔ ام۔ او سے ماخوذ ہے جس کے معنی دانت والے قلعہ کے ہیں۔ اس لئے کہ چیر و قوم نے جو قلعہ ندی کے کنارے بنایا اس ندی میں پتھر بڑے دانتوں کی طرح شکل میں نمایاں ہیں، شاید یہ لفظ ڈراویدین زبان سے ماخوذ ہے، سوم یہ کہ یہ نام پلاسوس سے ماخوذ ہے جس کے معنی ٹھنڈا کمارا ہوا، ان میں سے کوئی نسبت صحیح ہے معلوم نہیں۔“

ڈاکٹر منظر اقبال نے لکھا ہے کہ بلخی صاحب کے مضامین ہندوستان کے جرائد میں شائع ہوئے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام دینے کی ترتیب دی تو یونیورسٹی نے ملاعلام بھٹی منیری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات آپ ہی سے لکھوائے، جناب ہجور شمس مرحوم نے اپنے مقدمہ نامہ بلخی کے پہلے مجموعہ کلام ”آغاز سحر میں یوں لکھا ہے۔

”ہے حکومت پاکستان کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

نے پلاموں کی تاریخی سرگزشت مطبوعہ رسالہ کوئل ڈاکٹر گنج ستمبر ۱۹۶۱ء
لکھ آغاز سحر مجموعہ کلام پروفیسر نامہ بلخی مقدمہ ہجور شمس مرحوم

ترتیب دی ہے۔ اس میں ملا غلام یحییٰ بہاری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات آپ ہی سے لکھوائے
ہیں۔ جناب احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد سوم میں جناب بہجور شمس کے مقدمہ کا حوالہ
دیا ہے، وہ یوں لکھتے ہیں۔

”حکومت پاکستان کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام
ترتیب دیا ہے اس میں ملا غلام یحییٰ بہاری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات یونیورسٹی
نے آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔“

ملی صاحب مرحوم سے حکومت پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایک عرصہ دراز تک
خط و کتابت کا سلسلہ رہا، اس کے چیر میں جناب محمد شفیع نے ملی صاحب کو کئی خطوط لکھے اور ملی صاحب
نے بھی ان خطوط کا جواب دیا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب کے سلسلے میں دو مقالے یونیورسٹی کے
ارکان کو لکھ کر ارسال کئے۔ ان خطوط کی نقلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

Universit of Panjab

Department of Urdu Encyclopaedia of Islam

University Library Buildings.

Lahore 19/7/1955

K.B.M. Mohammad Shafi

M.A (P.B) M.A. Cantab D.C.L

Chairman Editorial Board

Urdu Encyclopaedia of Islam

University of the Panjab, Lahore

Ref No. 1212/ Contr

”مسلم شعرائے بہار مؤلف حکیم سید احمد اللہ ندوی جلد سوم

کرمی

سلام منون، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ صوبہ بہار کے بزرگوں پر اردو دائرہ معارف اسلام کے لئے
(جس کو پنجاب یونیورسٹی لاہور مرتب کر رہی ہے) مقالے لکھ سکتے ہیں، مخدوم الملک شرف الدین احمد المنیری۔
..... صاحب لکھ رہے ہیں، ان کے علاوہ اگر آپ صوبہ بہار کے چند نام آور ادیب تاریخی بزرگوں اور
تاریخی مقامات کی ایک ایسی فہرست بنا کر بھیج سکیں جن کے تراجم دائرہ معارف میں آنے چاہئیں تو باعث
ممنونیت ہوگا، اس فہرست میں جن مقالوں کو آپ خود لکھ سکیں ازراہ کرم ان پر نشان لگاویں، اگر ممکن ہو تو
فہرست مرتب کرتے وقت ان مقالوں کا خیال رکھیں جو پہلے ہی لائبریری والی انگریزی انسائیکلو پیڈیا آف

والسلام

لمتس

محمد شفیع

اسلام میں موجود ہیں۔

جناب فصیح الدین بلخی صاحب

ریشا رڈ
محہ گڈری، پٹنہ سیٹی

University of the Panjab

Department of Urdu Encyclopaedia of Islam

University Library

Building

Lahore 13.x.1955

K.B.M. Mohammad Shafi

M.A (P.B) M.A (Cantal) D.D.L

Chairman Editorial Board

Urdu Encyclopaedia of Islam

University of the Panjab, Lahore

Ref No. 1558

Dear Fasihuddin Balkhi

I thank you very much for your letter dated 15.9.1955 and 17.9.1955.

Can you undertake to write for us the following articles in Urdu and send the same within about two months.

1. Mulla Gholam Bihari Containing about 800 Urdu words.
2. Nawab Ali Ibrahim Khan containing about 600 words in Urdu.

An early reply is requested.

Yours Sincerely

Mohammad Shafi

Fasihuddin Balkhi

Mahalla Guzri

Patna City-8

University of the Panjab
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam
University Library
Lahore

Lahore 5th Dec. 1955

By airmail

K.B.M. Mohammad Shafi

M.A (P.B) M.A. (Cantab) D.O.L

Chairman Control Board

Urdu Encyclopaedia of Islam.

Ref. No. 1781/Contr

Dear Mr. Fasihuddin Balkhi

Thanks for your letter of the 19th October 1955 in which you had informed me that you would send the following articles in Urdu within two months.

1. Mulla Gholam yahya Bihari

2. Nawab Ali Ibrahim Khan

Will you kindly let me know if these articles will reach me by the end of this month.

An early reply would be appreciated.

yours Sincerely.

Mohammad Shafi

Fasihuddin Balkhi

Mahalla Guzri

Patna City - 8

بلخی صاحب کے مضامین صوبہ بہار کے اکثر جرائد میں کثرت سے شائع ہوئے، جناب قیوم خضر ایڈیٹر "اشارہ" نے اس امر کی تفصیل سے وضاحت کی ہے، موصوف لکھتے ہیں۔

"۱۹۵۳ء کے دسمبر ۱۹ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں نے دوبارہ اشارہ نکالنے کا مشورہ طلب کیا تو خاموش سوچنے لگے، کھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا خضر صاحب! میں کسی کو بھی بہار میں رسالہ نکالنے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں مگر آپ کہتے ہیں تو ضرور نکالیں، پیسوں سے تو نہیں مگر مضامین سے میں مدد کرتا رہوں گا۔ بلخی صاحب نے اپنا یہ وعدہ مرتے دم تک نبھایا، مجھے فخر ہے کہ بلخی صاحب کے جتنے مضامین اشارہ میں چھپے وہ بہار کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں چھپے۔"

جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم ایڈیٹر "تہذیب" نے بلخی صاحب کی مضمون نگاری کے سلسلے میں اپنی یوں تاثر پیش کیا ہے۔

"میں نے ان سے مضمون کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً وعدہ فرمایا، پہلے ضیاء عظیم آبادی پر ایک مفصل مضمون لکھا پھر ایک بے حد قیمتی مضمون "ماہ و سال کی تاریخ" پر پھر ایک مضمون "عروض و موسیقی کے تعلق پر" یہ سارے مضامین نہایت ہی عالمانہ تھے، افسوس کہ آخری مضمون کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی اور تہذیب بند ہو گیا اور یہ مضمون کسی دوسرے رسالہ کی زینت بنا۔ بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان کے مضامین صرف تاریخی اور تحقیقی نوعیت ہی کے نہیں بلکہ انہوں نے دیگر فنون لطیفہ، موسیقی اور نجوم جیسے فنون میں بھی مضامین لکھے ہیں۔ موصوف کا مضمون موسیقی و شاعری کا نام قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے یہ بتایا ہے کہ موسیقی اور شاعری کا باہمی تعلق کیا ہے۔ فن موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

"۱" جو شخص موسیقی کی ماہیت سے واقف نہیں اس فن لطیفہ کو گالے بجانے اور ناچنے تک محدود سمجھتا ہے، دراصل موسیقی وہ علم ہے جس سے آواز و حرکات و سکانات کا

۱" بلخی صاحب مقالہ قیوم خضر مخطوطہ ۲" مضمون موسیقی و شاعری مطبوعہ رسالہ بصورت چٹنہ ماہ جولائی ۱۹۵۶ء۔ مضمون روز و ماہ و سال کی سرگزشت مطبوعہ رسالہ تہذیب چٹنہ دسمبر ۱۹۵۲ء

اصول اور قواعد کے مطابق ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو۔

بلخی صاحب نے موسیقی اور شاعری کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں لکھا ہے۔
 ”اردو کے شعرا نے اپنے اپنے کلام میں کہیں کہیں موسیقی کی اصطلاحیں نظم کی ہیں
 چنانچہ ذوق کے ایک قصیدہ میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں۔“

مائل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چار دست
 اس قدر ساز و ضرب سا کہ آواز بلند پھر یہ گزرا کھرج کا تو ہو پیرادھیوت
 لیکے انگڑائی کہیں بننے لگی رام کلی اٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنے ملت
 اس طرح امانت کے دیوان میں بھی متعدد اشعار ہیں مثال کے طور پر ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔
 جنگلا الانیتا ہے درے دشت میں وہ کھل
 بلبل ترے ترے کاس کو خیال ہے

بلخی صاحب کا ایک مضمون ”روز و ماہ و سال کی سرگزشت“ رسالہ تہذیب و سہ ماہی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔
 اس مضمون سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کو علم نجوم سے کتنی واقفیت تھی۔
 ”تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم قدیم زمانہ میں ملک چین، مصر اور بابلیوں کے
 تھا۔ مشہور منجم ٹولیمی (Ptolemy) جو ۱۲۷ تا ۱۵۱ء تک اسکندریہ میں اس کے
 عقیدے کے مطابق دنیا ثابت اور ساکت تھی۔ ٹولیمی نے دن کی ابتدا آفتاب کے نصف النہار
 ہو جانے پر یعنی دوپہر سے شمار کیا اور اس کو نجومیوں نے بھی مان لیا۔ چوبیس گھنٹوں کی گنتی
 ہمارے کس کی ایجاد ہے، سات دنوں کی مدت کو ہفتہ کہتے ہیں۔ ہونائیوں کے یہاں ہفتہ کا کوئی
 شمار نہ تھا اور روم والوں نے تھیوڈوسی کی حکومت کے بعد ہفتہ کی مدت کا شمار کیا لیکن
 قیاس کیا گیا ہے کہ چین، بابل اور شاید ہندوستان میں ہفتہ کا شمار تھا، ہفتہ کا ہر ایک دن

۱۔ مضمون موسیقی و شاعری، مکتبہ رسالہ مصور پٹنہ، جولائی ۱۹۵۶ء

۲۔ مضمون روز و ماہ و سال کی سرگزشت، مکتبہ رسالہ تہذیب، پٹنہ دسمبر ۱۹۵۲ء

ایک سیارے کے نام سے منسوب ہے جیسے سینچر یا مسٹر ڈے یعنی یوزر حل، اسی طرح اور دنوں کے نام بھی سیاروں سے منسوب ہیں، اس کا سبب صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں جو سات سیارے انسان کو سب سے زیادہ روشن نظر آئے ان کو قابل پرستش سمجھ کر ہر ایک کو ایک دن سے منسوب کیا گیا مگر عربوں میں دنوں کے نام سیاروں سے منسوب نہیں، ان کے یہاں سات دنوں کے نام سبت، احد، الثین، ثلاثہ، اربعہ، خمیس اور جمعہ ہیں۔ دنیا کی ہر قوم میں سال کی تقسیم بارہ ہی مہینوں پر ہے۔ قرآن میں مذکور ہے ان الشہر عند اللہ اثنا عشر شہرا یعنی مہینے اللہ کے نزدیک بارہ ہی ہیں۔

فصلح الدین بلخی مرحوم کی مضمون نگاری کے ضمن میں ان کے تحقیقی مضامین کی نوعیت کافی اہم ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بلخی صاحب ادب میں تحقیق کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ ایک محقق اپنی تحقیق میں (Field work) کو کافی مقدم سمجھتا ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم اپنی تحقیق میں Field work پر کافی اہمیت دیتے تھے، اپنے تحقیقی کاموں کے دوران جہاں انہیں کوئی امر انکشاف ہوتا اسے درست منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے چنانچہ بحیثیت محقق بلخی صاحب کے مضامین کافی اہمیت کے حامل ہیں، بلخی صاحب کا مضمون امیر سینائی اور داغ دہلوی کی قبریں رسالہ "صبحِ نو" مئی ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے امیر سینائی اور داغ دہلوی کی قبروں کے کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں۔

قطرہ بارخ رحلت نصی امیر سینائی لکھنوی سے

۱۔ امیر کشور معنی امیر سینائی خدا کے عاشق صادق اور نبی کے پیرو
۲۔ گئے جو خطر پر ہیں تو ان کی نسبت پر جلیل نے یہ لکھا دوسرے جناب امیر

۱۸ ۱۳۵۵ھ

۳۔ داغ دہلوی کی قبر کے کتبہ کی نقل۔

۱۹۔ مضمون "امیر سینائی اور داغ دہلوی کی قبریں" مطبوعہ رسالہ "صبحِ نو" مئی ۱۹۵۸ء

رفت از دہر چون فصیح الملک لرزہ افتاد در مقامی ہند
 استاد نظام آصف بہاہ مورد لطف شاہ جامی ہند
 راست برقا منش قبائے سخن زبید بروی خطاب جامی ہند
 سالک نظمیں لسان سلک گہر جوہری سخن نظمیں ہند
 شد وفاتش بشام یوم الحج دفن شد روز عید سامی ہند
 آہ از دل کشید سائل گفت مدفن پاک داغ نامی ہند

بلخی صاحب کا مضمون مولوی شجاع الدین علی رسالہ صبح نوا پر ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا یہ مضمون بھی بلخی صاحب کا ایک واقع اور معلوماتی ہے۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے مولوی شجاع الدین علی کی بیگم گیتی آرا اور ان کے والد حضرت یتیم اللہ کی قبروں کے کتبات کی نقلیں پیش کی ہیں ساتھ ہی ساتھ بلخی صاحب نے ان کتبات کے اقتباس کو بھی اپنی تحریر میں پیش کیا ہے بلخی صاحب نے لکھا ہے :
 ”مولانا یتیم اللہ کے کتبہ مزار سے واضح ہے کہ وہ حقیقی نسب تھے اور امام باقر کی اولاد میں تھے۔ ۱۵۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱۸ھ میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے، علوم ظاہری اور باطنی میں یکساں زمانہ تھے۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ کے اصرار سے شاہی مقربوں میں شامل رہے جو تعلقات دینی کو ترک کر کے صوفیان با صفا کے فیضان صحبت سے متمتع ہوئے اور چالیس سال درس و تدریس عبادت و ریاضت میں بسر کر کے ۱۲۲۱ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔“

اے شجاع الدین علی رضوی کے مزار کے منظوم کتبہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی بڑے عالم متقا تھے، علم طبعی و الہی میں کمال حاصل تھا اور حل مساکلی و جواب امکان و بقائے نفس انسانی، علم لام و بوحش ادیان وغیرہ میں تیس برس منہمک رہے پھر صوفیائے کرام سے کسب فیض کیا بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مادم کو نہ چھوڑیں معرفت الہی ممکن نہیں، آخر سطر میں ان کا سن وفات ۱۲۲۲ھ درج ہے۔

۱۔ گیتی آرا بیگم کے مزار کے لوح میں یہ مضمون ہے کہ نواب گیتی آرا بیگم بنت نواب
رفعت النساء بیگم بنت شاہ عالم بادشاہ لال قلعہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائی
اور سید شجاع الدین علی خاں بہادر کی منکوحہ ہونے کے سبب اس خاندان کے مقبرہ میں مدفون
ہوئیں اور ان کا سن وفات ۱۲۵۶ھ درج ہے۔

۲۔ بلخی صاحب کا مضمون ”مثنوی گوہر جوہری رسالہ مصور پینہ نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا“ اس تحقیقی مضمون
میں مضمون نگار نے مثنوی جوہری اور اس کے مصنف شاہ آیت اللہ جوہری کے مفصل حالات قلمبند
کئے ہیں، نیز اردو کی ابتدائی فنون و نامائے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ انہوں
نے لکھا ہے۔

۳۔ یہ سمجھنا کہ اردو کسی خاص مقام میں پیدا ہوئی راقم کے خیال میں محض دھوکا ہے پنجاب
سے حدود بنگال تک اور دکن میں جو زبان کچھ لفظی اختلاط کے ساتھ عام طور پر بولی جاتی تھی اس کو
مسلمانوں نے فارسی رسم الخط میں رائج کیا، ابتدا میں اس کو زبان ہندی کہتے تھے۔ مصحفی نے
اپنے تذکرہ شعرائے اردو کا نام تذکرہ ہندی رکھا۔

۴۔ بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم تحقیقی مضمون ”ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام“ رسالہ صنم
پینہ ماہ نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ بلخی صاحب مرحوم نے سکھوں کی مقدس ہستی نند لال گویا کے
فارسی دیوان کو حاصل کیا، گویا کا مذہب نانک شاهی تھا لیکن ان کے کلام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ
گویا نے اپنی فارسی شاعری میں حافظ شیرازی کے گہرے رنگ کو قبول کیا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے
لکھا ہے۔

۵۔ مجھے تربت کے ایک فارسی شاعر نند لال گویا کا تعلیمی دیوان ہاتھ آیا جس کے تمام تر

۱۔ مضمون مولوی شجاع الدین مصور رسالہ صنم پینہ نومبر ۱۹۵۸ء

۲۔ مثنوی گوہر جوہری مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ مصور پینہ نومبر ۱۹۵۵ء

۳۔ ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ صنم پینہ ماہ نومبر ۱۹۵۸ء

اشعار عارفانہ مضامین سے بھرے ہیں۔ سلاست زبان اور تخیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعر بلبل شیراز کا مقلد ہے۔“

داع دہلوی کے عظیم آباد آئے کے حال سے صوبہ بہار کے شعرا اور ادبا اچھی طرح واقف ہیں چنانچہ وہ غزل جو انہوں نے عظیم آباد میں کہی اس میں عظیم آباد کا ذکر موجود ہے غزل کا مقطع یہ ہے۔
کوئی چھٹیا پڑے تو داع کلکتہ چلے جائیں عظیم آباد میں ہم منتظر ساولہ کے بیٹھے ہیں
لیکن امیر مینائی کے عظیم آباد آئے کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے سب سے قبل ادبی دنیا کو یہ روشناس کرایا کہ امیر مینائی بھی داع دہلوی کی طرح عظیم آباد تشریف لائے تھے۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

”واقعیہ یوں ہے کہ حکیم محمد حسن ہادی خاں مرحوم نایاب خلف حاجی امیر حسن خاں بن دیوان مولا بخش خاں سی آئی۔ اسے رئیس عظیم رسول پور ضلع تربہت ابتدا میں عبد الواحد سیما ب کے شاگرد ہوئے۔ میر وزیر علی لکھنوی سے مشورہ سخن کرتے تھے، پھر منشی منظر علی امیر شاگرد مصطفیٰ کو غزلیں دکھائیں ۱۲۹۲ھ میں ان کے انتقال کرے پر مفتی امیر احمد نے امیر مینائی سے رجوع کیا لیکن ہونہ ان کے حلقہ تلمذ میں داخل نہ ہوئے کہ ۱۳۰۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کا دیوان برائے اصلاح امیر مینائی کے پاس بھیجا گیا اور بعد اصلاح اس کو مولوی اعجاز حسن خاں خلف نایاب مرحوم نے طبع کرایا۔ بعد میں نایاب مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی مہدی حسن خاں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۳۰۵ھ میں انہوں نے امیر مینائی کو عظیم آباد آئے کی دعوت دی۔ امیر مینائی اپنے ارشد تلامذہ ریاض و کوثر کے ساتھ تشریف لا کر لال کوٹھی عظیم آباد میں شاداب کے مہان رہے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کا کافی چرچہ تھا، عظیم آباد کے بعض شعرا نے بھی ان سے ملاقات کی۔“
نصیح الدین بلخی کی مضمون نگاری میں ان کی تذکرہ نویسی کی بھی خصوصیتیں ملتی ہیں، اس سلسلہ

سے امیر مینائی عظیم آباد میں مقالہ نصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ اشارہ نمبر ۹۵۹

ہیں ان کے کئی مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق کسی معروف شاعر کی زندگی کے ان نام گویوں کو منظر عام پر لانا مقصود ہے، ساتھ ہی ساتھ جن بزرگوں کو انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا ان کے حلیہ کو بھی ملجی صاحب بیان کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی طرز رہائش پر بھی مختصر روشنی ڈالتے ہیں، ملجی صاحب کا ایک قیمتی مضمون ”عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر“ رسالہ ”تہذیب“ پٹنہ اگست ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ملجی صاحب مرحوم نے ضیاء مرحوم کے برادر نسبتی حافظ عبدالغنی مرحوم کی وہ تقریظ جو ضیاء کے دیوان کے ساتھ شائع ہو چکی ہے نیز تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کے قلمی مسودہ کی بھی نقل پیش کی ہے۔ ضیاء کی شاعرانہ خصوصیت کے سلسلہ میں ملجی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”مستقدین شعرائے اردو سے لے کر متاخرین تک آپ جن جن شعرا کا نام لیں گے ان سبھوں نے مشق سخن میں عمریں گزارنے کے بعد ایک امتیازی حیثیت اور عام مقبولیت حاصل کی، میں آپ کو ایک ایسے شاعر کا حال سناتا ہوں جس نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور اکیس سال کی عمر میں صرف چھ برس کے بعد انتقال کے وقت ایک دیوان اس کے ساتھ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں قدر دالوں کے دلوں میں اپنی خوشگئی کا نقش پائیہ چھوڑا۔“

اس کے بعد ملجی صاحب مرحوم نے ضیاء مرحوم کے حلیہ کو یوں بیان کیا ہے۔

”اے“ ان کی رنگت بہت گوری بدن چھریا چہرہ بیضاوی کسی قدر لانا آنکھیں بڑی بڑی بڑی ناک بلند اور داہنی جانب گال پر پٹ یا زخم کا نشان جو بدنامی معلوم ہوتا تھا۔ ضیاء کی طرز رہائش پریوں لکھا ہے۔

”اے“ اکثر انکر کھا اور چوڑی دارپا جامہ اور لکھنؤ کے پلہ کی ٹوپی پہنتے تھے۔ کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے۔ چال ڈھال اور گفتگو میں متانت اور شائستگی کا بہت خیال رکھتے تھے۔“

فیض الدین ملجی مرحوم کا ایک دفعہ مضمون ”علامہ شوق نہوی“ رسالہ اشافہ پٹنہ دسمبر ۱۹۵۸ء

میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے علامہ شوق نیوی کی ادبی حیثیت، ان کے خاندانی حالات اور ان کی خاندانی ادب داری، ان کی تصانیف اور ان کی ادبی معرکہ آرائیوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہ سارا ہی ساتھ ان کی وضع قطع اور ان کی ہندوستان گیر شہرت سے تفصیلی بحث کی ہے، بلخی صاحب مرحوم نے ان کی شخصیت کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

”شوق نیوی عظیم آبادی ایک خوشگوشا کے علاوہ بڑے محقق زبان، کامل الفن اور عالم متوجہ بھی تھے اور اپنے معاصرین میں اساتذہ دہلی و کھنڑے سے کم نہ تھے۔“

ان کی وضع قطع کے بارے میں یوں لکھا ہے :

”ان کی وضع قطع میں کوئی نمائش نہ تھی، طبیعت میں بہت سادگی تھی، علماء کی وضع پر معمولی قسم کے کپڑے زیب تن ہوتے تھے، رنگ ساوا و قریباً نہ اور دار صحن معمولی وضع کی تھی، گفتگو میں متانت بہت تھی۔ اشعار پر تاثیر لہجہ میں پڑھتے تھے اور فرط جوش میں اکثر اٹھ اٹھ جلاتے تھے۔“

فضیح الدین بلخی مرحوم کا وہ مضمون قابل قدر ہے جس میں انہوں نے اپنے بھائی مولوی عزیز الدین بلخی مرحوم کے حالات لکھے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ایسا احساس ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنے بھائی کے حالات اور ان کی ادبی خدمات کے ضمن میں انہوں نے غیر جانبداری کا سہارا لیا ہے بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، انہوں نے ایسی روش اختیار نہیں کی جس سے ان پر مدحت سرائی کا الزام عائد ہو۔ نیز ذاتی عقیدت یا رنگاؤ کو دخل دیا ہو، اس مضمون کے آخر میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی راقم کے حقیقی منجھلے بھائی تھے، مجھے یقین ہے کہ ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ذاتی عقیدت یا رنگاؤ کو کوئی دخل نہیں، جس طرح میں نے عظیم آباد کے مشاہیر

کا تذکرہ قلمبند کیا ہے اسی طرح یہ بھی محض حقیقت اور واقعی حالات پر مبنی ہے۔

اس مضمون کی ابتدا میں بلخی صاحب مرحوم نے راز بلخی کی شخصیت پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے خاندان بلخیہ کے حالات کو لکھا ہے۔ اس کے بعد راز بلخی کی وضع قطع اور طرز معاشرت کو بیان کرتے ہوئے ان کے علمی مشاغل اور تصنیف و تالیف کا جائزہ لیا ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

”شعر و شاعری کا مذاق فطری تھا، اردو کے بہترین شاعریں تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے

ایک ماہنامہ رسالہ ”رویتا زمانہ“ نامی جاری کیا تھا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ تادمِ مرگ

جاری رہا، انہوں نے اول ایک ضخیم کتاب دین و دنیا لکھی جس میں مذہب اور انسان کے

عقائد اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی تھی، یہ کتاب طبع ہونے نہ پائی تھی، ان کی دوسری

کتاب ”انسان کی پرواز“ ہے اس میں فنِ غبارہ بازی اور ہوائی جہاز کی ایجاد کی تاریخ اور

سائنس و فنک تحقیقات کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔

ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ”تاریخ شعرائے بہار“ ہے، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم

ہے کہ شعرائے ریختہ کا سب سے پہلا تذکرہ غلام حسین شورشِ عظیم آبادی متوفی ۱۱۹۵ھ نے

لکھا تھا۔ دو ذرا تذکرہ عشقی سنہ ۱۲۰۰ھ میں وجیہ الدین عشقی نے مرتب کیا تھا۔ تذکرہ میر حسن

کے مطابق جو شش عظیم آبادی نے بھی ایک تذکرہ لکھا تھا لیکن اب تک کسی کو دریافت نہ

ہوا، بہر کیف ان تذکروں کے بعد صوبہ بہار میں ”تاریخ شعرائے بہار“ ایک قابلِ قدر تذکرہ ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک گرانقدر مضمون حضرت یاس بہاری کی شخصیت اور شاعری سے متعلق

رسالہ سہیل گیا مارچ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں انہوں نے قصبہ بہار شریف کی ادبی اہمیت

اور یاس بہاری کے خاندانی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری سے بحث کی ہے۔ یاس بہاری کے

متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”ان کو زبان اور تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے، غزلوں کے علاوہ مثنوی،

اے مضمون یاس بہاری مصنف فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ سہیل گیا مارچ ۱۹۵۹ء

قصیدہ، قطع، رباعی، مخمس، مسدس اور قومی نظمیں خوب کہی ہیں، جدت طرازی کو ہاتھ سے جانتے نہیں دیتے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم کے ایسے مضامین بھی کافی قابل قدر ہیں جو خود شعرا کے خود نوشتہ حالات پر مبنی ہیں، بلخی صاحب مرحوم نے ان شعراء کے خود نوشتہ حالات بڑی کدوکاوش سے حاصل کیا تھا، رسالہ کوئلہ ماہی ڈالٹن گینج نے ستمبر ۱۹۶۱ء میں ایک گننام مضمون ”داغ کا ایک بہاری شاگرد“ کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس مضمون میں ادارہ کا ایک فوٹ نوٹ بھی شامل ہے، اس فوٹ نوٹ کی عبارت یہ ہے۔

”لے“ ذیل کا مضمون داغ کے ایک بہاری شاگرد سید عبدالحی ہاتف ولد سید ولایت حسین پچھنے ضلع مونگیر کے خود نوشتہ حالات سے اخذ ہے، انہوں نے داغ دہلوی سے بذریعہ مراسلت اصلاح لی تھی اور ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار کے موقع پر داغ کے پاس حاضر ہو کر ان کے مشاہیر شاگردوں کے حلقے میں شامل ہوئے تھے اور دہلی کے بعض مشاعروں میں بھی شرکت کی تھی، ناظرین کے لئے یہ مضمون خاص طور پر دلچسپی کا حامل ہے (ادارہ)“

تعجب کی بات ہے کہ رسالہ ”کوئلہ“ ڈالٹن گینج نے اس مضمون کو کیوں گننام شائع کیا، دوسری بات یہ ہے کہ مضمون بلخی صاحب کی زندگی میں شائع ہوا، بلخی صاحب نے ادارہ کو ممانعت کی ہوگی کہ ان کے نام سے شائع نہ کیا جائے، بہر حال ہاتف پچھوی کی شخصیت کو پردہ خفا سے منظر عام پر لانے کے لئے بلخی صاحب مرحوم کی ذات ہے۔ اس مضمون کی عبارت یہ ہے :

”شاءِی کا باقاعدہ آغاز روز افزوں ترقی کے ساتھ دہلی میں ہوا، منشی قربان علی بسمل سے جو اس زمانہ میں نسیم نامی ماہوار کے ایڈیٹر تھے اصلاح لینا شروع کیا، کچھ دنوں بعد حکیم ضامن علی مرحوم جلال لکھنوی کی شاگردی اختیار کی، پھر فصیح الملک استاد داغ دہلوی

لے داغ کا ایک بہاری شاگرد مضمون رسالہ کوئلہ ڈالٹن گینج ستمبر ۱۹۶۱ء
لے بقیہ صفحہ ۳۳۵ کا فوٹ نوٹ دیکھئے۔

کے ساتھ تلمذ میں داخل ہوا اور ان سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگا۔ جب استاد مرحوم حضور نظام کے ساتھ ۱۹۰۳ء کے دہلی دربار میں تشریف لائے تو بارہا بالمشافہ بھی اصلاح کا شرف حاصل ہوا۔“

بلخی صاحب مرحوم کا ایک مضمون حضرت شوق قدوائی اور علامہ شوق نیموی کا ایک شاگرد ”رسالہ کوئل ڈالٹن گینچ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون حضرت حافظ شک پوری کا خود نوشتہ ہے (جو شوق قدوائی اور شوق نیموی کے شاگرد تھے) یہ مضمون بلخی صاحب کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ رسالہ کوئل نے اپنے فوٹ نوٹ کے ساتھ اس مضمون کو شائع کیا، عبارت یہ ہے۔

”حضرت حافظ شک پوری کا خود نوشتہ تذکرہ تقریباً چالیس سال سے فیض الدین بلخی صاحب کے پاس موجود تھا لیکن سورا اتفاق اب تک منظر عام پر نہ آسکا تھا، ادارہ کی درخواست پر بلخی صاحب نے اصل مسودہ اس رسالہ میں شائع کرنے کے لئے عنایت کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔“

مرحوم حافظ شک پوری نے طویل عمر پاکر ۱۹۳۷ء سے بعد رحلت کی ان کے خود نوشتہ حالات میں ذاتی واقعات کے علاوہ ان کے بعض معاصروں کا بھی ضمیمہ ذکر آگیا ہے جس سے اس تذکرہ کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے (ادارہ)

اس مضمون کی عبارت یہ ہے:

”الغرض فن شاعری میں مجھے دونوں کامل الفن استاد شوق نیموی مرحوم و شوق قدوائی مرحوم سے شرف تلمذ ہے اور میں دونوں شوق مرحومین کا بغایت شکر گزار ہوں اور ان کے لئے دعا خواں ہوں۔“

بلخی صاحب مرحوم کا ایک مضمون ”تراجم تراجمی موزوں“ رسالہ اشارہ پینے میں شائع ہوا۔ اس مضمون

”فیض الدین بلخی مرحوم کا مضمون شوق قدوائی اور علامہ شوق نیموی کا شاگرد مطبوعہ رسائل کوئل، ڈالٹن گینچ ماہ اپریل ۱۹۶۲ء

میں بھی ان کی تذکرہ نگاری کی جھلکیاں بدرجہ اتم موجود ہیں نیز یہ مضمون ان کی تحقیق نگاری کا ضامن ہے، راجہ رام نرائن موزوں کی شخصیت اگرچہ ایک تاریخی ہے نیز ان کا ادبی مقام کافی رفیع ہے، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”مہاراجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم صوبہ بہار فارسی کے صاحب دیوان اور خوشگو شاعر تھے، شیخ علی حزیں متوفی ۱۱۷۸ھ کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان ۳۰۴ صفحات کا محیط ہے ان کے علاوہ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ موسوم بہ دستور الانشا بھی ان کے وارث رائے متھرا پرشاد صاحب کے پاس ہے جن میں سیکڑوں مکتوبات ہیں جو اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں، سفینہ خوشگو میں بھی ان کا ذکر ہے۔“

بلخی صاحب مرحوم نے موزوں کے شاعرانہ مقام کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔
 ”مشہور صاحب دیوان شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا ذکر اکثر تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ سفینہ خوشگو میں بھی ان کا ذکر موجود ہے، تذکرہ عمدہ نسخہ ملوکہ انڈیا آفس لاہور لائن اور سخن شہار مؤلفہ نسخہ میں بھی ان کا ذکر راقم کی نظر سے گذرا ہے۔
 بلخی صاحب مرحوم کا مضمون ”اجاگر چندالفت“ رسالہ اشارہ میں شائع ہوا، اس مضمون میں مضمون نگار نے الفت کے ادبی مقام کا جائزہ لیا ہے، نیز ان کی شاعرانہ خصوصیت سے بھی بحث کی ہے، بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

”اے اجاگر چندالفت عظیم آباد کے متقدمین ہندو شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ انشا پردازی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، آغا حسین عاشق مؤلف تذکرہ نشر عشق بندہ بن خوشگو مؤلف سفینہ خوشگو اور ڈاکٹر عبداللہ مصنف ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ اور مولوی عزیز الدین بلخی مؤلف تاریخ شعراء بہار نے

ان کا ذکر کیا ہے۔“

فصیح الدین بلخی مرحوم کو بزرگان دین سے والہانہ لگاؤ تھا، جس خاندان کے فرد تھے اس کا تقاضہ بھی یہی تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی خاندان بلخیہ کے بزرگان دین نے کیا کیا خدمتیں انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم مضمون ”اطراف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام“ رسالہ انسان پورنیہ نمبر جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ چنانچہ اس مضمون میں بلخی صاحب نے پورنیہ کے صوفیائے کرام کی دینی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ان بزرگان دین نے اپنے اخلاق محسنہ سے دینی تبلیغ و اشاعت کی چنانچہ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

”جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ ہو کر نہیں کیا ہے وہ اکثر غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب و تعلیم مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اشاعت دین سے کوئی سروکار نہ دکھا۔ انہوں نے مذہبی معاملہ میں کوئی درست انداز نہ کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا رسوخ قائم ہونے سے پہلے اکثر دور دست مقاموں کو صوفیائے کرام نے اپنی ریاضت گاہ قرار دیا تھا ان کی بے لوث بے تعصب اور بے طمع زندگی اور خدمت خلق لوگوں کو مال کی کڑی تھی، راہ کی دشواریوں اور سفر کی صعوبتوں کے باوجود صوفی درویشوں نے ساتویں صدی ہجری سے اطراف پورنیہ کو اپنی ریاضت اور خدمت خلق کے لئے منتخب کیا تھا، مناقب الاصفیا مولفہ حضرت مخدوم شعیب فردوسی شیخپوری متوفی ۹۲۴ھ اور مونس القلوب بلغونات حضرت مخدوم احمد لنگرہ ریالخی متوفی ۸۹۱ھ اور بعض تذکروں سے پایا جاتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں اطراف پورنیہ میں سہروردیہ سلسلہ حضرت شیخ تقی الدین سہروردی سے جاری ہوا۔

فصیح الدین بلخی کا ایک اہم مضمون ”شبلی نعمانی“ رسالہ صبح نو اگست ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے شبلی نعمانی کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے قابل قدر اور مشہور ترین بزرگوں میں تھے، ان کی ذات میں اتنی خوبیاں تھیں کہ ایک شخص میں کمتر پائی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو زبان کے محقق ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے مورخ، تذکرہ نگار، شاعر، ادیب، فلسفی، محدث، ناقد، ماہر تعلیم اور دیفار مر بھی تھے۔ ہندوستان کے علاوہ اسلامی میں بھی شہرت رکھتے تھے اور براؤن نے *Literary History of Persia* میں ان کی مشہور کتاب شعر المعجم کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔“

ملی صاحب مرحوم کا مضمون ”عظیم آباد کا اک خوش نویس شاعر“ رسالہ صدائے عام خاص نمبر میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ملی صاحب مرحوم نے عظیم آباد کا مشہور و معروف شاعر باقر عظیم آبادی کی شخصیت و شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ باقر عظیم آبادی و جیدالہ آبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے نیز ان کی شخصیت اس طور پر بھی نمایاں ہے کہ داغ دہلوی ۱۲۹۹ھ میں عظیم آباد تشریف لائے تھے تو انہوں نے جناب باقر کے گھر پر قیام کیا تھا اور جناب باقر عظیم آبادی کے اصرار پر داغ نے اپنی مشہور غزل کہی تھی جس کا مطلع یوں ہے

کوئی جھینسا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں
اس مضمون میں ملی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”لے جن لوگوں کو داغ کے عظیم آباد آنے کا حال معلوم ہے یا جنہوں نے داغ کی مشنری فریاد داغ پڑھی ہے ان کے لئے باقر عظیم آبادی کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ ۱۲۹۹ھ میں جناب داغ عظیم آباد آئے تو میر باقر ہی کے مکان میں مقیم ہوئے چنانچہ فریاد داغ میں خود فرمایا ہے

میر باقر کے گھر قیام ہوا خوب دعوت کا اہتمام ہوا
اس شعر کے ساتھ میر باقر اور اہل عظیم آباد کی تعریف میں داغ نے یوں کہا ہے۔
یہ شرافت کبھی نہیں دیکھی یہ مروت کہیں نہیں دیکھی

لے ملی صاحب کی خود نوشتہ تحریر راقم کو جناب کے شرما سے حاصل ہوئی جس کے لئے راقم مدوح کا ممنون ہے۔

دیں یہ جہاں کو جس قدر پائیں بخش دیں گھر کا گھر اگر چاہیں

مذکورہ بالا مضامین کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نویسی میں تذکرہ نویسی کی خوبیاں موجود ہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم علم کے سمندر تھے لہذا ان کے مضامین صرف ایک دائرے ہی تک محدود نہیں انہیں اردو زبان و قواعد اور فن عروض پر مہارت تھی اس ضمن میں ان کی ایک اہم غیر مطبوعہ تصنیف ”دستور سخن“ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم مضمون ”اردو کے قواعد و لغات کی تدوین“ رسالہ تہذیب اپریل ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یہ لکھا ہے کہ اردو زبان میں کتنی قواعد اور لغت ترتیب دی گئی ہے، نیز اس مضمون کو پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان جس کس میری میں مبتلا ہے اس امر سے بلخی صاحب مرحوم بھی اچھی طرح واقف تھے، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”جن لوگوں نے اردو زبان کے ارتقاء پر تاریخ کی روشنی میں غور نہیں کیا ہے ان کو یہ سن کر تعجب سا ہوتا ہے کہ اردو کی سب سے پہلی گرامر ملک پریشا جرن کے رہنے والے نے لکھی۔“ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے اردو زبان میں جتنی گرامر مرتب ہوئی اس کا سلسلہ وار طور پر انہوں نے بحث کی ہے، مضمون کے آخر میں انہوں نے اردو اور ہندی کے جھگڑے کے متعلق اپنی گراں قدر رائے پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

”موجودہ زمانہ میں ہندوستان اور پاکستان میں جو زبان کا جھگڑا ہے اس کو یہ سراسر فرقہ دارانہ تنگ نظری سمجھتا ہوں، جن میں کئی زبانوں نے مستقل ادبی زبان کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے، میں ان میں سے کسی کا مخالف نہیں بلکہ ہر ایک زبان کی ترقی کے مساوی موقع دیئے جانے کا حامی ہوں مگر اس جھگڑے نے اردو کی ماہیت کے متعلق چند غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندی ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کے تمام افعال مثلاً آ رہا ہے، جا رہا ہے دیکھتا ہے وغیرہ سب ہندو الاصل ہیں۔“

بلخی صاحب کا مضمون ”مخالفت قیاس“ رسالہ اشاعت مارچ اپریل ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا، اس مضمون

میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

”جو عیوب کلام کی فصاحت میں محل ہوتے ہیں ان میں ایک وہ ہے جس کو اہل فن کی اصطلاح میں مخالفت قیاس کہتے ہیں، لفظ قیاس بغوی یا قواعد صرف نحو کے خلاف استعمال کرنا اور نفاک اضافت یا بلا ضرورت اضافت دینا اس عیب میں داخل ہے، شعرائے اردو کے کلام میں یہ عیب مفصلہ ذیل صورتوں میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مثالوں میں جو مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام پیش کئے گئے ہیں اس سے اعتراف مقصود نہیں اور نہ ان غلطیوں سے ان کے رتبہ میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے، ان کے زمانے میں اکثر الفاظ اس طرح متداول تھے یا وہ خود ان کو اسی طرح استعمال کرتے تھے بعد میں جوں جوں زبان نے ترقی کی نصیحتیں بعض کو متروک اور بعض کو مروج کیا، بہر کیف مثالیں ملاحظہ ہوں۔
اے کسی لفظ میں حرف ساکن کو متحرک یا متحرک کو ساکن استعمال کرنا۔

۱۔ تو تو کہتا تھا نہیں تجھ بن آرام و چین اب جدائی میں مری کیونکر صبر پیدا ہوا (دومن) صبر میں بائے مودہ ساکن ہونا چاہئے۔ شاعر نے متحرک مفتوح استعمال کیا ہے۔
۲۔ شرط پیچم ہے کہ کار و نہ دکھاؤ اس کو ذبح کے پہلے قضا سے نہ ڈراؤ اس کو (دبیر) لفظ کار و میں حرف رائے مہملہ دراصل ساکن ہے لیکن شاعر نے متحرک استعمال کیا ہے۔
مذکورہ بالا سطور میں بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نویسی کا جائزہ لیا گیا ہے، ان مضامین کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم میں ایک مورخ، محقق اور تذکرہ نگار کی جو خوبیاں ان میں موجود ہیں ان کے علاوہ انہیں فنون لطیفہ میں بھی خاص مہارت تھی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے کئی کتابوں کے مقدمے بھی سپرد قلم کئے ہیں، ان مقدموں کو بھی مضامین کے زمرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ان کی روشنی میں بلخی صاحب مرحوم نے تین کتابوں کے مقدمے سپرد قلم کئے ہیں۔ اول الذکر ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے کلام ”جلوہ دارغ“

کا مقدمہ دوم و ثانیہ ہی کے مجموعہ کلام ”نکبت گل“ کا مقدمہ اور آخری الذکر تذکرہ شعرائے صاحب گنج کا ”نفوس کارواں“ کا مقدمہ بھی بلخی صاحب نے لکھا تھا۔
 ”جلوہ داغ“ کا مقدمہ بلخی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے اصرار پر لکھا تھا۔
 چنانچہ ڈاکٹر مبارک مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

P.O. Begum pur

Patna

19 $\frac{12}{45}$

بلخی صاحب سلمہ تعالیٰ

سلام و دعائے خیر، کل آپ کا کارڈ ملا، آج اصل مسودہ جاتا ہے، آپ میری شاعری کے متعلق جو فلسفیانہ مقدمہ لکھنا چاہتے ہیں ضرور لکھئے زوردار لکھئے اور ضرور لکھئے۔ میرے خاندانی حالات مسودہ مرحلہ میں ہیں مگر ترمیم کی ضرورت ہے، پٹنہ میں آپ کا قیام ہوگا۔ مسودہ کی ابتدا بھی مجھے پسند نہیں، یہ سب مضمون نکال دیا جائے گا۔ غرض کہ یہ ترمیم اور اضافہ آپ کے دوران قیام عظیم آباد میں ہوگا، اللہ اللہ آپ وہاں سے روانہ ہوں تو مجھے اس مضمون کا کارڈ لکھ دیجئے گا تاکہ فلاں تاریخ پٹنہ میں پہنچیں گے۔ یہ فرمائش ہماری نوٹ کر لیجئے، ہمیں آپ سے اس مخصوص میں ملنے کی ضرورت ہے۔ والسلام

دعا گو

مبارک

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے ”جلوہ داغ“ کا مقدمہ لکھا، یہ مقدمہ کافی دقیق ہے اس مقدمہ میں بلخی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے خاندانی حالات کے علاوہ ان کے طرز کلام سے بھی خصوصی طور پر بحث کی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

”اے آپ نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی شعر یا کوئی مصرعہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں استاد کی

”اے“ جلوہ داغ ”کلام ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی ص ۱۔

زبان اور استاد کا رنگ اور طرز ادا نمایاں نہ ہو، یوں تو داغ دہوی کے شاگردوں میں بہترے نامور اور شاہ شیراز ہوئے جن کے کلام اردو شاعری کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ لیکن مبارک عظیم آبادی نے اتباع کلام کو اس حد تک نکسہ پہنچایا ہے کہ ان کے بیشتر اشعار داغ ہی اشعار معلوم ہوتے ہیں اور داغ کے اشعار کے ساتھ پڑھ جائیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہو، دراصل ان کے کلام کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس نے ان کو داغ کے شاگردوں میں ایک امتیازی حیثیت کا تہادارث بنایا۔

”جلوہ داغ کی اشاعت کے بعد جناب عطا کا گوی نے مبارک صاحب کے کلام پر سخت اعتراض کیا دراصل یہ دہلی ہوئی چنگاری ایک بار پھر سلگی، چنانچہ عطا صاحب کے جتنے اعتراضات تھے ان کا جواب ایک مضمون کی صورت میں رسالہ اشارہ پٹنہ ۱۹۵۲ء میں قسط دار شائع ہوا، یہ مقالہ جناب یاس بہاری کے نام سے شائع ہوا، دراصل یہ مقالہ بلجی صاحب مرحوم نے لکھا تھا۔ چنانچہ بلجی صاحب مرحوم کی خود نوشتہ تحریر راقم کے پاس محفوظ ہے۔ عطا صاحب کے جتنے اعتراضات تھے وہ سب بالکل بے جا تھے، اس امر کی شہادت کے لئے جناب محمود علی خاں صبا تلمذ شاد عظیم آبادی اور جناب قیوم خضر کا نام لینا کافی ہے۔ راقم نے اس موضوع پر عرض فصیح الدین میں تفصیلی طور پر بحث کی ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا سطور میں بلجی صاحب کے جتنے مضامین کا جائزہ لیا گیا ان سب کو کتابی شکل میں ”مقالات فصیح“ حصہ اول اور ”باقیات فصیح“ حصہ دوم کے نام سے شائع کیا جاسکتا ہے، آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ چھان بین کے بعد بھی بلجی صاحب کے دو مضامین ”عظیم آباد میں شعراء کے مزارات“ شائع شدہ ”معاصر“ پٹنہ اور ”صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت“ شائع شدہ رسالہ نگار لکھنؤ مئی ۱۹۵۳ء دستیاب نہ ہو سکے۔ ذیل میں ہم بلجی صاحب مرحوم کے ان مضامین کی فہرست پیش کر رہے ہیں۔

(۱) منیر اور بہار میں مسلمانوں کی آمد رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء

(۲) قلندر پتھاس کی تاریخی سرگزشت شائع شدہ رسالہ معاصر پٹنہ ستمبر ۱۹۴۹ء

(۳) پلاسوں کی تاریخی سرگزشت ”رسالہ گوئل سہ ماہی ڈالٹن گنج ۱۹۶۱ء“

- (۴) عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر
 (۵) مثنوی گوہر جوہری
 (۶) عظیم آباد کا ایک جوانمزرگ شاعر
 (۷) روز و ماہ و سال کی سرگزشت
 (۸) اردو قواعد و لغت کی تدوین
 (۹) اطراف پورنیہ کے بزرگوں کا حال
 (۱۰) موسیقی اور شاعری
 (۱۱) راسخ عظیم آبادی
 (۱۲) ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام
 (۱۳) تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف
 (۱۴) عظیم آباد میں امیر مینائی کی آمد
 (۱۵) موزوں عظیم آبادی
 (۱۶) اُجاگر چند اُلفت
 (۱۷) مولوی شجاع الدین رضوی
 (۱۸) امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں
 (۱۹) امیر مینائی
 (۲۰) شبلی نعمانی
 (۲۱) شوق نیروی
 (۲۲) مخالفت قیاس
 (۲۳) سر قمر و توارد
 (۲۴) قدوی کا ایک مسدس
 (۲۵) شوق نیروی اور شوق قدوائی کا ایک شاگرد
- شائع شدہ رسالہ صدائے عام پٹنہ خاص نمبر
 رسالہ مصور پٹنہ ماہ نومبر ۱۹۵۵ء
 رسالہ تہذیب پٹنہ اگست ۱۹۵۳ء
 " " " دسمبر ۱۹۵۲ء
 " " " اپریل ۱۹۵۳ء
 " انسان پورنیہ نمبر ۱۹۵۵ء
 " مصور پٹنہ جولائی ۱۹۵۴ء
 " صغیر پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹ء ماہ نومبر
 " " " نومبر ۱۹۵۸ء
 " اشارہ فروری ۱۹۵۹ء
 " " " ستمبر ۱۹۵۹ء
 " " " جنوری ۱۹۵۹ء
 " " " جنوری و فروری ۱۹۶۰ء
 " صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء
 " " " مئی ۱۹۵۸ء
 " " " اگست ۱۹۶۱ء
 " " " اشدھ دسمبر ۱۹۵۸ء
 " " " اپریل ۱۹۵۲ء
 " " " ۱۹۵۲ء
 " " معاشرہ جلد ۲ حصہ ۷ ۱۹۵۲ء
 " کوئی ڈالٹن گنج اپریل ۱۹۶۲ء

تاریخی کتابوں میں شاہ عالم اول کی حکومت کی تاریخ کا قلمی نسخہ موجود ہے اور شاید ہندوستان میں اس کے چند نسخے پائے گئے ہوں، ظفر نامہ تیموری کے قلمی نسخے بھی چند ہی جگہ پائے گئے ہیں۔ ایک نادر اور قابل ذکر چیز راجہ منگل کیشور کا وہ خود نوشتہ بھی ہے جس میں اس نے نادر شاہ کے حملہ اور محمد شاہ کے دربار کی کاروائیوں کا حال شجاع الدین محمد خاں ناظم بنگال کو لکھا تھا، ایران کے صفوی بادشاہوں کی تاریخ "فوائد صفویہ" سلطان محمد صفوی کی لکھی ہوئی ہے۔ سفر نامہ کی بعض کتاب بھی بہت نادر ہے، سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ میں ملا احمد سبجانی اس ملک میں آئے انہوں نے یہاں کے سماجی، تاریخی اور عام حالات کئی صفحاتوں میں لکھے تھے، اس کتاب کا قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔

لمحی صاحب مرحوم کا ایک تاریخی مضمون "درگوں کی کہانی اور رہتاس گڑھ" آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے مورخہ ۴ اگست ۱۹۵۸ء کو دوپہر لگ بھگ دو بجے نشر ہوا، اس مضمون میں لمحی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

رہتاس گڑھ راجہ ہرش چند کے بیٹے رہتاسو کا بنایا ہوا ہے مگر چھوٹا ناگپور کے اداؤں لوگ کہتے ہیں جب کرناٹک سے آکر بسے تو انہوں نے رہتاس گڑھ بنایا مگر ان باتوں سے رہتاس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ گڑھ کسی ہندو کا بنایا ہوا ہے مگر اس وقت جو گڑھ کے دروازے اور دیواریں اور مکانات باٹے جاتے ہیں وہ مغلوں کے ہیں، آئین اکبری اور تاریخ بدایوں کے مطابق ۱۵۳۸ء میں جب ہمایوں نے چنار گڑھ پر قبضہ کر کے بنگال پر چڑھائی کی تو شیر خاں نے چتاس داس کو لالچ دلا کر اپنی عورتوں اور خزانوں کو رہتاس گڑھ میں رکھنے کے بہانے سے ڈولیوں کے اندر سپاہیوں کو بھیج کر گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ لمحی صاحب کا ایک مضمون "بہار شریف کا میلہ اور عرس" مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے دن میں لگ بھگ دو بجے نشر ہوا اس مضمون میں لمحی صاحب نے حضرت شیخ مخدوم شرف الدین بہار شریف کی سیرت اور ان کے اخلاق حسنہ پر یوں روشنی ڈالی ہے، موصوف نے یوں لکھا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں بہار میں مخدوم شرف الدین احمد ایک بڑے نامی صوفی گزشتہ ہیں جو

یہ کہتے تھے کہ اصل دھرم اور مذہب اپنے پیدا کرنے والے یعنی خدا کی محبت اور پریم اور جنت کی سیوا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ سچے دل سے ملتے تھے اور کسی سے کینہ کپٹ نہ رکھتے تھے، ان کو دنیا کی کسی چیز کا لوبہ اور لالچ نہ تھا یہاں تک کہ سامراج تعلق شاہ نے راجگیر کا پرگنہ ان کی جاگیر مقرر کر دیا تو انہوں نے اس کو نہ لیا اور واپس کر دیا، یہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ بڑے لکھے آدمی بھی تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی ان کے بہت سے دوہے اب تک لوگوں کو یاد ہیں۔

بلنجی صاحب کا ایک تاریخی مضمون "بھارت کا مہان کوت محمود گاداں" مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا، اس مضمون میں بلنجی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔
آپ نے سنا ہوگا کہ بھارت کے تیرہویں صدی عیسوی میں دکنی علاقہ میں بہمن بادشاہوں نے حکومت کی تھی۔ دکنی بادشاہوں کے زمانہ میں ۱۴۴۷ء سے ۱۴۹۱ء تک محمود گاداں نے راج کی ترقی کے لئے بڑے بڑے کام کئے۔

آگے چل کر محمود گاداں کی سیرت پر بلنجی صاحب مرحوم نے یوں روشنی ڈالی ہے۔
محمود گاداں بہت بڑا عالم تھا، ملا عبدالرحمن جامی سے اس کے خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا اور جامی نے بھی اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے، خود محمود گاداں کی تصنیف سے روضہ انشراح اور دیوان اشعار یادگار بھی ہے، خط لکھنے کا خاص ڈھنگ رکھتا تھا۔

بلنجی صاحب مرحوم کا ایک اور تاریخی مضمون "اکبر کے نورتن ابوالفضل اور فیضی" مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے دن کے لگ بھگ دو بجے نشر ہوا، اس مضمون میں بلنجی صاحب مرحوم نے دربار اکبری سے تعلق رکھنے والی دوبھاری بھرم ادبی شخصیت فیضی اور ابوالفضل کے حالات لکھے ہیں۔ نیز ان لوگوں کے ادبی کارناموں کو بھی اجاگر کیا ہے، اس مضمون میں بلنجی صاحب مرحوم نے سب سے قبل فیضی کے حالات لکھے ہیں اور اس کے بعد ابوالفضل کے، اس مضمون کی ابتدا بلنجی صاحب نے یوں کی ہے۔

اکبر بادشاہ کے نورتن مشہور ہیں، اس نورتن سے اس کے دربار کے ایسے نوازش خاص مراد ہیں جو اپنے آپ میں غیر معمولی قابلیتیں اور صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہیں کی ذات سے دربار کی خاص رونق رہتی تھی اور آج تقریباً چار سو برس کے بعد بھی یہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن میں اس وقت آپ کو ان میں سے صرف دو کے حالات سناتا ہوں، ایک ملک الشعراء فیضی دوسرے علامہ ابوالفضل ء

اس کے بعد ملحق صاحب مرحوم نے فیضی کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے۔

فیضی شیخ مبارک کا بیٹا تھا جو اپنے زمانہ کا مشہور عالم فاضل تھا۔ فیضی ۱۵۴۷ء ۹۵۴ھ میں اگرہ میں پیدا ہوا اس کا نام ابوالفیضی تھا، شاعری میں کچھ دن اپنا تخلص مشہور رکھا پھر فیضی تخلص اختیار کیا، اس نام سے اس کی شہرت ہوئی۔ بچپن سے جوانی تک بلکہ یوں کہئے کہ اکبر کے دربار آنے کے قبل تک اس کی زندگی نہایت غربت میں گزری، علم و ادب اور شاعری میں یکتائے زمانہ ہوا۔ ۱۵۶۶ء ۹۷۴ھ میں اس کی شاعری کا چرچہ شکر اکبر نے اس کو دربار میں طلب کیا، فیضی کی اصل قابلیتوں کا پتہ اس کی تصانیف سے ملتا ہے، شاعری میں اس کا ایک دیوان بتا شیر صبح ہے، غزلوں کے علاوہ اس کے نادر قصیدے ہیں جو بادشاہ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں، اکبر کی فرمائش پر فیضی نے محزون اسرار کے طور پر ”مرکز روایت“ لکھی، یہی مجنوں کے طرز پر نعل و من لکھی جو کالی داس کی اصل تصنیف کی طرح فصیح و بلیغ ہے، کتاب ہفت پیکر کے جواب میں ہفت کشور اور سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ بھی لکھا تھا لیکن غالباً ناتمام رہ گئی اس لئے کہ اس کا مکمل نسخہ دریافت نہ ہوا، ییلادقی سنسکرت میں حساب کی نامی کتاب ہے فیضی نے اس کا بھی ترجمہ کیا، کہا جاتا ہے کہ اس نے بھاگوت اور وید کا بھی ترجمہ کیا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

ابوالفضل کے حالات کے سلسلے میں ملحق صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

اپنے بڑے بھائی فیضی سے بھی زیادہ مشہور ہوا۔ ۱۵۵۱ء ۹۵۸ھ میں پیدا ہوا۔ بچپن سے

جوانی تک فیضی کی طرح اس کی زندگی بھی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گزری، ابوالفضل
 ۱۵۷۳ھ میں فیضی کی سفارش سے اکبر کے دربار میں آیا۔

ابوالفضل انشا پردازی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، ہر مطلب کو جس طرح چاہتا تھا
 نہایت آسانی سے مناسب الفاظ میں ادا کرنے پر قادر تھا، اس کی تاریخی تصانیف میں
 اکبر نامہ اور آئین اکبری بہت مشہور ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اور مضمون "جائسی کی پدماوت" مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو
 پٹنہ سے پڑنے آٹھ بجے شب میں نشر ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:
 پندرہویں صدی عیسوی میں ملک محمد جائسی ہندی کا بہت بڑا کوی گذرا ہے، اس کی
 لکھی ہوئی کتابوں میں پدماوت اور اکھراٹ زیادہ مشہور ہیں، اس کا فقوڑا حال گریسن
 نے بھی لکھا ہے۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کا جائزہ لینے کے بعد ان کی بھرپور علمی و ادبی شخصیت
 کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

۱۷ (فٹ نوٹ ص ۳۲۱ کا) اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ رانچی و منس کلج کی شعبہ اُردو کی ریڈر محترمہ
 ڈاکٹر رفعت سجاد نے ہاتھ بچنوی کی شاعری پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری
 حاصل کی۔ ہاتھ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام ان کی پوتی مقیم نواہ دہلی سے حاصل کیا۔ نیز ہاتھ مرحوم کی
 دوسری اہلیہ سے ملاقات کی اس وقت ان کی عمر لگ بھگ نوے سال تھی۔

۱۸ بلخی صاحب مرحوم کا یہ خیال ہے کہ زید وے کی جگہ زید بادرا صحیح ہونا چاہئے۔ کتبہ کندہ کرنے
 والے نے غلطی سے زید وے کندہ کر دیا۔ اس موضوع پر جناب اختر مظفر پوری اور جناب ضبط
 موٹیہاری اور بلخی صاحب کے مابین رسالہ صبح تو میں ادب بحث چلی۔

باب دہم

فصیح الدین بلخی بہ حیثیت شاعر

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ادبی دنیا میں شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ادب میں شعری صنف سے زیادہ نثری صنف کی طرف توجہ کی بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کے ادب میں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کی لیکن بلخی صاحب مرحوم نقد شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کے تمام رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ فی عرض اور فن بلاغت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں خود بھی شرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کے تینوں بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم، جناب عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی مرحوم اور جناب نظام الدین بلخی مرحوم داغ دہلوی کے اچھے شاگردوں میں تھے۔

آج کے مرحوم عظیم آبادی میں کل کا بخشی محلہ علم و ادب کا گہوارہ تھا، بخشی محلہ میں شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں، غالب دہلوی کے شاگرد جناب فخر الدین سخن ثم دہلوی عظیم آبادی یہاں آکر اس طرح مقیم ہوئے کہ یہیں ہو کر رہ گئے۔ راقم الحروف نے گذشتہ ابواب میں اس کی تفصیلی بحث کی ہے۔ سردست دہلوی کی ضرورت نہیں۔ گویا اس ادبی ماحول میں بلخی صاحب مرحوم نے آنکھ کھولی جناب عبدالرؤف ندوی مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کی شاعری سے متعلق اپنی اپنی اظہار خیال کیا ہے۔ ”آپ کو شعر گوئی سے بھی مذاق تھا اور پاکیزہ مذاق تھا مگر اصنافِ شاعری میں

قطعات اور تاریخی قطعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں نے پایا ہے آپ کے مذاق شاعری اور نقد شعرو سخن کا اندازہ آپ کے کتابچہ 'انشاد شاد' سے ہو سکتا ہے کہ استاد الشراشاد عظیم آبادی کی ظاہری و باطنی، معنوی معائب و محاسن کی جزدی گرفت کی گئی ہے۔ اس کے معیار پر اسانڈہ سخن کے کلام بھی نہیں اُترتے ہیں۔" لے

اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم نے عظیم آبادی کی شعری محفلیں دیکھیں۔ انہوں نے شاد عظیم آبادی اور اپنیج کے جھگڑے دیکھے۔ شعراء کی معاصرانہ چٹکلیں دیکھیں، عظیم آباد کے نامی گرامی مشاعروں میں شرکت کرنے کے مواقع انہیں ملے، چنانچہ یہ شاعرانہ فضا بلخی صاحب مرحوم کو شاعر کی حیثیت سے ابھرنے میں کارآمد اور کارساز ثابت ہوئی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے شاعری میں اپنے ابتدائی دور میں کس سے اصلاح لی یہ کہنا مشکل ہے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں کسی سے بھی اصلاح نہ لی ہو۔ بہر کیف ان کے کلام میں داغ دہوی اور میرانیس کی گہری چھاپ ہے، بلخی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم غالب کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور سنبھلے بھائی راز بلخی ناسخ کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے، جہاں تک ان کے سنبھلے بھائی کا تعلق ہے جناب نظام الدین بلخی مرحوم باضابطہ طور پر داغ دہوی کے شاگرد تھے۔ بلخی صاحب مرحوم کا کلام بہت ہی مختصر ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا۔ تلف ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی بیاض محلہ گدڑی پٹنہ سیٹھی کے مکان سے چوری ہو گئی۔ ان کا کلام جو کچھ بچا ہے وہ ان کی یادداشت کا نتیجہ ہے۔

جناب تھجور شمش اور جناب کیول کرشن شرما کی بدولت ان کا کلام تھوڑا بہت محفوظ ہو سکا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات سے ایک سال پیشتر اپنے صاحبزادے کے یہاں ڈالٹس گنج تشریف لائے تھے چنانچہ ان دونوں حضرات کے بارہا اصرار پر ان کی یادداشت میں جو کچھ محفوظ تھا وہ کلام آج موجود ہے۔ بہر حال بلخی صاحب مرحوم کے مختصر سے کلام کی روشنی میں ان کے

کلام کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کے کلام کی جہاں تک خصوصیت ہے ان کا کلام ابتداء میں اور سو قیامہ پن سے بالکل پاک ہے۔ جہاں تک ان کے کلام کا تعلق ہے ان کے کلام میں میرا بیسی اور داغ کی فصاحت نمایاں طور پر موجود ہے یعنی بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا بہترین نمونہ ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مجد سحت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز	پابند وہ بھی حلقہ جوہر میں رہ گئی
اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن	مشتی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی
دل پر ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے	تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے
بہتر ہے صاحبی سے فضاہت کی زندگی	گوشہ میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں

شعراے عظیم آباد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے میر کے رنگ و آمنگ کو بھی اپنے کلام میں برتا ہے۔ راج، جوشش، تپاں اور سجاد ان شعرا نے میر کے کلام کے گہرے رنگ کو قبول کیا۔ ضیا عظیم آبادی تو بالکل میر ثانی ہیں اور آج بھی ان کے مشہور شعر کو میر کے شعر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

شعر یہ ہے

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سادل میں تو ما ہے

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

یہاں تک کہ شعرا نے متاخرین کے کلام میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر ملتی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کا جس دور سے تعلق ہے اس دور کے بھی شعرا نے میر ہی کے رنگ کو اپنے کلام میں نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر شاد عظیم آبادی، ضیا عظیم آبادی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، مشرقی منیری، باقر عظیم آبادی، اکبر دانا پوری، مرزا یاس ریکانہ چنگیزی وغیرہ شعرا کے کلام میں میر کا رنگ موجود ہے۔ راقم نے گذشتہ ابواب میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بہر حال بلخی صاحب مرحوم نے بھی میر کے رنگ کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یوں دل کی آرزو دل مضطر میں رہ گئی آندھی سی اٹھ کے گنبد بے دریں رہ گئی

حکمت میں اگرچہ ہم بھی فلاحوں سے کم نہیں کیا کیجئے رکھی جو مقدر میں رہ گئی
یہاں تک کہ شاعر کی یہ بھی خواہش ہے کہ مرنے کے بعد اس کا نام و نمود دنیا میں برقرار نہ رہے
چنانچہ لمبھی صاحب مرحوم نے کس قدر سلیس شعر کے ڈھانچے میں ڈھالا ہے۔
اس کی کسے ہوس ہے کہ نام و نشان رہے دنیا میں رہوں نہ میری داستان رہے
انسان کو مرنے ہی کے بعد چین و سکون نصیب ہوتا ہے کیونکہ اس دنیا میں راحت نصیب نہیں
ہوتی اور مرنے کے بعد انسان کو دو گز زمین بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اس مضمون کو لمبھی صاحب
مرحوم نے یوں پیش کیا ہے۔

راحت ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی : دو گز کسی گلی میں زیریں مل ہی جائے گی
لمبھی صاحب مرحوم کے کلام میں بے ثباتی عالم کا بھی حال ملتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کا شاعر بے ثباتی
عالم کا رونا روتا ہے چنانچہ اردو شاعری میں میر یا غالب یا آتش یا اقبال جیسے شعرا کے کلام میں بے ثباتی
عالم کا حال ملتا ہے، بہر حال لمبھی صاحب مرحوم کی بھی نگاہ اس حقیقت سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس
خاک نے بڑے بڑے شاہان نامور کو اپنی آغوش میں سلا دیا۔ آج نہ شہنشاہ اکبر کی سطوت ہے نہ شاہجہاں
کی امارت بہر حال شاعر اس مضمون کو یوں پیش کرتا ہے۔

کیا کیا ملے ہیں خاک میں شاہان نامور : اکبر رہے جہاں میں نہ شاہجہاں رہے
چنانچہ مرنے کے بعد لحد میں کسی انسان کا استخوان بھی باقی نہیں رہتا خواہ کسی کا مقبرہ تاج محل جیسا کیوں
نہ ہو بقول شاعر

روئے زیریں پہ تاج محل بھی بنا تو کیا : باقی نہ جب لحد میں کوئی استخوان رہے
موت کے سامنے رستم جیسے مشہور پہلوان کا بھی زور نہیں چلتا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ اس دنیا میں
انسان کو بہت عاجزی و انکساری کی زندگی گذارنی چاہئے۔
پیک اجل کے سامنے رستم کا زور کیا : میں یوں رہوں کہ جیسے کوئی تانواں رہے
اس دنیا میں انسان بہت کچھ کمال حاصل کرتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا زوال ہی ہوتا ہے چنانچہ
شاعر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دور ملک میں کیجئے حاصل کمال کیا : ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا
بلخی صاحب مرحوم کی بعض غزلوں کے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں نظم و شعر کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مثال
کے طور پر

دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف : دشمن ہمارے کر کے سب انتقال کیا
پیری میں کیا کروں ہوس عشق و عاشقی : بکھتے ہوئے چراغ کو دوں انتقال کیا
رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترپھی نگاہ سے : اُلٹی پھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا
خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے : آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو
بلخی صاحب مرحوم اپنے دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی مشاعروں میں بھی اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے۔ اس کی دو
مثالیں پیش کرتے تھے۔

محدثن اسکول کے ہڈا ستر جناب سیدانوار کریم مرحوم ایک علم دوست انسان تھے۔ ان کی علم دوستی کا
حال یہ تھا کہ محدثن اسکول پٹنہ سینی میں برابر محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی لہذا بلخی صاحب مرحوم نے اپنی ایک طرخی
غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی تھی اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں : اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں
اور اس غزل کا مقطع یہ ہے

دعویٰ سخن کا ہم لوگوارا نہیں فصیح : پیش نظر ہو عیب ہو عرض ہنر کریں

دوسری مثال یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات کے ایک سال پیشتر اپنے صاحبزادے پروفیسر نادر بلخی
کے یہاں تشریف لائے تھے چنانچہ حلقہ شعر سخن ڈالٹن گنج کے بچپسواں طرخی مشاعرہ کی دو طرخی غزلیں بلخی
صاحب مرحوم نے مشاعرہ میں پڑھی تھیں اور یہ دونوں غزلیں بلخی صاحب مرحوم کی آخری غزلیں ہیں، یہ مشاعرہ
بلخی صاحب مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا اور یہ دونوں طرخی غزلیں بلخی صاحب مرحوم نے جناب ہجور بخش کے
اصرار پر کبھی تھیں پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا : اپنے کئے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے۔

دورِ فلک میں عیش میسر ہو کر فصیح و اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہِ سال کیا

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو ۛ پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو

اس غزل کا مقطع یہ ہے

اپنی زباں پہ حرف نہ آئے کبھی فصیح ۛ روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

بلخی صاحب مرحوم فنِ شاعری کے رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شادِ عظیم آبادی جیسے مشہور شاعر کے کلام کی فنی خامیاں اپنے کتابچہ انشاد شاد میں پیش کی ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم سے اکثر معتقدین شعراً مشورہ سخن کرتے تھے چنانچہ دورِ جدید کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم کا خود قول ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں بلخی صاحب مرحوم سے مشورہ سخن کیا تھا اور حسن نعیم کا یہ بھی قول ہے کہ آج اردو شاعری میں جو انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے بلخی صاحب کی دین ہے۔

جناب دفا براہی بھی اکثر ان سے مشورہ سخن کرتے تھے، مثال کے طور پر داغ دہلوی کے نامور شاگرد جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اپنی کوئی غزل بھی بغیر بلخی صاحب مرحوم کو دکھائے ہوئے نہیں پڑھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی صحبت کے باعث بلخی صاحب مرحوم نے داغ کی شاعری کا گہرا رنگ قبول کیا اور بلخی صاحب مرحوم کا ہر شعر بالکل داغ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو شاعری میں میر انیس اور داغ دہلوی فصاحت کے بادشاہ ہیں، بلخی صاحب کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے، بہر حال بلخی صاحب مرحوم نے اپنی شاعری میں میر انیس اور داغ دہلوی کے رنگ کو قبول کیا۔

بلخی صاحب مرحوم فنِ شاعری میں تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے، جہاں تک کہ صوبہ

بہار میں فنِ شاعری میں تاریخ گوئی کا سوال ہے اس فن میں جناب سلسل سنہاروی مرحوم اور نواب محمد تقی جان قمر گبادی مرحوم اس فن میں کمال رکھتے تھے لہذا بلخی صاحب مرحوم کے کچھ حاصل شدہ تاریخی قطعات درج کئے جاتے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم کے لوحِ مزار کے کتبہ کا تاریخی قطعہ لکھا تھا، یہ تاریخی قطعہ فارسی زبان میں ہے جو درج ذیل ہے۔

قطعه تاریخ وفات برائے لوح مزار حضرت حفیظ الدین بلخی مرحوم

سرمانہ کل من علیہا خان و سقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

جاں بجاں آفریں سپرد آخر	آں کر یے کہ بود مرد سخن
رونق خاندان حفیظ الدین	صاحب فضل بلخی نامی
ز آنکہ از نسل ابراہیم بود	نسب ظاہر شرافت نسبی
کان احسان معدن اخلاص	شمع فیض و محج خوبی
ذی مروت خلیق دریا دل	صاحب جود ہمت عالی
نکتہ داں و ادیب دانشمند	ماہر علم و فن فہیم و ذکی
قائل لا الہ الا اللہ	پیر دی دین حق محب بنی
مسجد کہنہ در وطن نو کرد	از برائے رضائے رب قوی
رفت از مرگ او سرور عالم	گم شد از دل نشان زندہ دلی
زور بازو من اجل بشکست	دور ماندم ز بے پروا بالی

سال فوتش دل حزن فصیح

گفت فردوس آشیان بلخی

۵۲ ۱۲ ھ

قطعه تاریخ وفات برائے لوح مزار جناب سید جمال الدین بلخی وکیل

عزیز ما جمال الدین بلخی	لبیق و حق شناس فیض گستر
حلیم نیکو ، پاک طینت	فہیم و صاحب ادراک جوہر
بے گلشت جنت رفت ازیں جا	بفردوس بریں از دار ششدر
ز مرگ در دل احباب پشرد	چو گل در گلستان از باد صرصر

بجست از دل چو تاریخ و فائقش
بقصر الخلد شد گفتا سن فوت

فصیح عاجز و غمگین و مضطر
غم این مرگ ہم تاریخ دیگر

۱۳۶۱ھ

جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے مقالہ ”فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت“ میں بلخی صاحب مرحوم کے دو تاریخی قطعات کو درج کیا ہے اول الذکر تاریخی قطعہ ان کے برادر اکبر سید حفیظ الدین بلخی مرحوم کا اور دوم قطعہ تاریخ جامع مسجد اورنگ آباد کا ہے۔

سزنامہ قطعہ ان المساجد باللہ فلا تدعوا مع اللہ احدا

در زمان سید حامی دیں	شاہ اورنگ زیب عالمگیر
خان والا گھر فدائی خاں	از برائے رضائے رب قدیر
بر سر راہ مسجد جامع	ساخت بہر شانزیاں کثیر
دل عبادت گہ خدا گھنٹا	بے پے سال بنا کے تعمیر

۱۱۰۷ھ

جناب مولوی احمد اللہ ندوی مصنف تذکرہ مسلم شعرائے بہار نے جلد سوم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کا ذکر شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔ موصوف نے ناظم بلخی کے مجموعہ کلام آغاز سحر کے مقدمہ کے حوالے سے کیا ہے، اس مقدمہ کو حضرت مہجور شمس مرحوم نے سپرد قلم کیا ہے۔ احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کے مضمون میں یوں لکھا ہے۔

لے فصیح الدین ام فصیح تخلص بلخی نسب نسبت ہے، والد ماجد کا نام ڈاکٹر غیث الدین

نوٹ: عبدالرؤف ندوی نے اپنے مقالہ کے حاشیہ میں یوں لکھا ہے جو درج ذیل ہے :-

شاہ رائیہ شیر شاہی پرچوک بازار میں یہ کتبہ اورنگ زیب مسجد جامع مسجد کے نام سے زبان زد ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مسجد مہدی عالمگیری کی یادگار ہے مگر کوئی کتبہ نہیں ہے، ناظم نے تعمیر نو کے لئے اس کے تاریخی قطعہ کی فراش کی کہ سنگ مرمر پر کندہ کرا کر نصب کریں تاکہ اس کی تاریخی حیثیت معلوم ہو جائے۔

لے ملاحظہ ہو تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنف حکیم سید احمد اللہ ندوی جلد سوم ص ۲۲۸ تا ۲۲۹

بلخی ہے، عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے اور اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔
 ۱۸۸۵ء سال ولادت ہے اور ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء بمطابق ۷۷ سال داعی اجل کو لبیک کہا۔
 جناب فصیح الدین بلخی مرحوم تاریخ نگاری، تذکرہ نویسی اور تخلیق زبان و ادب کے کمال کی بدولت نہ صرف
 صوبہ بہار بلکہ پورے پاک و ہند میں متعارف تھے۔
 موصوف کی تصنیفات میں تاریخ مگدھو مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہے ۱۹۲۲ء ق م سے ۱۹۲۳ء
 تک کی کامل تاریخ ہے، دوسری کتاب تذکرہ نسوان ہند ہے جس میں متحدہ ہندوستان کی پانچ سو خواتین
 یعنی شاعرات، مصنفات، کالمات، شہرات اور مقدمات کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار
 اصناف کے علاوہ بعض کتابیں موسوم بہ دستور سخن اور رسالہ تذکرہ ومانیت کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ
 عنقریب شائع ہونے والی ہیں، ایک تنقیدی رسالہ انشاد شاد بھی شائع ہو چکا ہے، حکومت پاکستان
 کے ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ترتیب دیا ہے اس میں غلام محی بہاری
 اور نواب علی ابراہیم خان غلیلی کے حالات یونیورسٹی نے آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔
 اس کے بعد مولوی احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں
 مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کے کلام کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک روایتی شاعر تھے اور اساتذہ
 کی قدیم روایت کو اپنے کلام میں بحسن و خوبی پیش کیا کرتے تھے۔

غزل (۱)

یوں دل کی آرزو دل مضطرب رہ گئی	آندھی سی اٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی
مجھ کو ملی سشراب وہ دور اخیر میں	جوٹھی کسی کی پچ کے جو ساغریں رہ گئی
مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز	پابند وہ بھی حلقہ جوہر میں رہ گئی
مثل حباب غرق ہوئے بحر عشق میں	پانی کی بوند مل کے سمندر میں رہ گئی

اس تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے شائع ہونے کا علم مولف تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو نہ تھا۔

کیا کیجئے کمی جو مقدر میں رہ گئی
 اٹھ اٹھ کے وہ بھی ایک ہی ٹھوکر میں رہ گئی
 خوشبو کسی کی زلف مغبر میں رہ گئی
 دیکھا تو اک نہ ایک کمی ہر میں رہ گئی
 مٹی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی
 ماند چرخ عقل بھی چکر میں رہ گئی

حکمت میں گرچہ ہم بھی فاطمیں سے کم نہیں
 اُس فتنہ گر سے بڑھ کے قیامت نہ چل سکی
 دل امتحان ہوئے دفا میں تو جہل گیا
 گل ہائے رنگ رنگ کو سمجھتے تھے لاجواب
 اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن
 کھلتی نہیں فصیح حقیقت جہان کی

(۲)

البت جتائے جائیں گے ہم ہر ہی کیوں نہ جائے
 لعل و زرد و زرد و گوہر ہی کیوں نہ جائے
 صحن چین میں اڑ کے کوئی پر ہی کیوں نہ جائے
 اسی گھر کو چھوڑ کر کوئی اس گھر ہی کیوں نہ جائے
 خاک نثر اد خاک کے اندر ہی کیوں نہ جائے
 ہر چند آبرو سے مبر ہی کیوں نہ جائے
 ہر چند سیکھ کر کوئی منتر ہی کیوں نہ جائے

وہ بے دفا کہیں کے کوئی مری کیوں نہ جائے
 جاتی ہے جان مال کے جانے کا ذکر کیا
 معراج ہے ایر قفس کے لئے یہ سیر
 نقل مکان نہیں یہ قیامت کلبہ سفر
 پھٹتا ہے کوئی عالم بالا سے واسطہ
 واعظ کو ذکر کوثر و تسنیم سے ہے کام
 سنا ہے کون سحر بیانی وہاں فصیح

(۳)

دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی
 اُس سنگ آستان سے جس میں مل ہی جائے گی
 اک روز آسمان سے زمیں مل ہی جائے گی
 داد اس کی تہ سے پرانہیں مل ہی جائے گی
 صورت کوئی نہیں سے جس میں مل ہی جائے گی

راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
 میں شوق جبہ سائی میں درنگ پہنچ تو لوں
 یوں خاک میں جو چاند سی مٹی میں صورتیں
 کس کس طرح سے ہم نے چھپا لیا ہے راز عشق
 ہاں اپنے دل میں حوصلہ عشق چاہئے

راحت ملی نہ رہے زمیں پر کہیں فصیح
 کیوں کر کہیں کہ زیر زمیں مل ہی جائے گی

(۴)

دل پرستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے
 کیا کم یہ فائدہ تھا کہ دشمن نہ تھا کوئی
 راحت بھی میرے حق میں جرات سے کم نہیں
 اچھے رہے جو عشق میں بے خانماں ہوئے
 گھر سے اٹھا کے لاتے ہیں احباب دوش پر
 عمر گزشتہ کو ہمیں رونا ہے عمر بھر
 انسان اس جہاں میں برابر ہیں سب فصیح

مٹوڑا بھی لطف ہے تو نظریں زیادہ ہے
 نقصان عیب سے بھی ہنر میں زیادہ ہے
 جب دل میں درد کم ہے جگر میں زیادہ ہے
 ایسوں کی قدر آپ کے گھر میں زیادہ ہے
 منزل سے چلن راہ گذر میں زیادہ ہے
 آنسو ابھی سے دیدہ تر میں زیادہ ہے
 کم ہے نہ کوئی اپنی نظریں زیادہ ہے

(۵)

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں
 بہتر ہے صاحبی سے قناعت کی زندگی
 کٹوا ئیں سرکہ دل کو کریں نذر امتحان
 میں بھی نگاہ شوق کا آئینہ دار ہوں
 دیکھا ادھر تو شکر کیا اس نگاہ کا
 دل خوش نہ ہو تو میر جہاں اک دہال ہے
 قائل ہیں یوں تو ہم بھی کہ طاعظ ہے خوش بیاں
 مشق فنا شریست میں اپنی انل سے ہے
 دودن کی زندگی بھی ہیں تو دہال ہے
 تیری گلی کی سیر بھی ہے لامکاں کی سیر
 دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیح

اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں
 گوشے میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں
 گردن کو ہم جھکائیں کہ سینہ سپر کریں
 میری طرف بھی اہل نظر اک نظر کریں
 کس منہ سے ہم شکایت درد جگر کریں
 گذریں ہزار رنج جہاں ہم گذر کریں
 باتیں وہ کام کی ہیں جو دل پر اثر کریں
 عمر ابد بھی ہو تو یہی عمر بھر کریں
 کیا عمر جادواں کی تمنا خضر کریں
 رستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک سفر کریں
 پیش نظر ہو عیب جو عرض ہنر کریں

(۶)

اس کی کسے ہوں ہے کہ نام و نشان رہے
 دنیا میں میں رہوں نہ مری داستان رہے

دودن کی زندگی پہ بھروسہ ہو کس طرح
 کیوں آرزوئے منصب و مال و منال ہو
 کیوں آبرو ہو اپنی کسی کی نگاہ میں
 پستی میں ہے زمین بلند ہی پہ آسماں
 تھوڑی سی زندگی ہے وفا کیا وفات کیا
 کیا کیا لے ہیں خاک میں شاہانِ نامور
 روئے زمین پہ تاج محل بھی بنا تو کیا
 پیک اجل کے سامنے رستم کا زور کیا
 ہاں تو گر رستم کی تسلی اسی میں ہے
 آئی تو ہوں جہان میں خاں خرابیاں
 کس طرح آئے راز حقیقت زبان پر
 نخوت ہے آسماں میں کدورت زمین میں
 اربابِ دل کو چاہئے تھوڑی سی بخودی
 سیری نہ ہوگی عالم ہستی کی سیر سے
 تھوڑی بھی ہو تو کم نہیں فرصت نشاط کی
 صہبا ہو اور صحبت احباب زندہ دل

(۷)

دنیا میں کچھ تولدت دنیا بھی چاہئے
 پہلو میں دل تو دل میں تمنا بھی چاہئے
 اب ان کے بعد ذکر ہمارا بھی چاہئے
 بے مثل ہے جمال تو پردہ بھی چاہئے
 ملتا نہیں اگر کوئی تنکا بھی چاہئے

کچھ مکر بھی فریب بھی دھوکا بھی چاہئے
ذوقِ نظر کو دیدہ بینا بھی چاہئے
کچھ آپ کی طرف سے اشارا بھی چاہئے

سیدھی طرح نہ مانیں گے ہرگز دغا شعار
نرگس کو کیا ہو سونے گل لالہ التفات
یوں کس طرح کہوں مجھے مدِ نظر ہے کیا

(۸)

اپنے کئے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا
رتبہ میں بدر کیا بھلا اور ہلال کیا
ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا
دشمن ہمارے کر گئے سب انتقال کیا
گزریں گئے اس طرح سے مرے ماہ و سال کیا
ان کا گمان کیا ہے ہمارا خیال کیا
باغِ جہاں میں آئے کوئی ہو نہال کیا
رندوں کو استیازہ حرام و حلال کیا
بجھتے ہوئے چراغ کو دلوں اشتعال کیا
سیرِ چین سے ہوگی طبیعت بحال کیا
کوئی طبیب اس کی کرے دیکھ بھال کیا
زخمِ جگر کو ہوگا مرے اندمال کیا
الٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا
دل میں نہ دیکھ لیں گے ہم اس کا جمال کیا
آئے مری زبان پہ حرفِ سوال کیا
دل کو مرے وہ مفت کا سمجھے ہیں مال کیا
ان کا خیال کیا ہے ہمارا خیال کیا
دعویٰ عشق کیا ہے امید وصال کیا

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا
ابرو دروئے یار کی ان سے مثال کیا
دورِ فلک میں کیجئے حاصل کمال کیا
دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف
فرقت میں ایک روز بھی جینا محال ہے
ہم ان کو دوست وہ ہیں دشمن سمجھتے ہیں
صرصر کا خوف، برق کا دھڑکا، خزاں کا ڈر
بھٹی کی ہو شراب کہ جام سے ظہور
پیری میں کیا کرو ہو سس عشق و عاشقی
افسردہ خاطر کی بیا بیاں کی ہے تلاش
بیمار ہو جو نرگس بیمار کی طرح
مرہم کی جستجو ہے عینِ تجھ کو چارہ گر
رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو تر چھی نگاہ سے
کیوں جائیں کوہِ طور پہ دیدار کے لئے
اللہ نے مجھے دلِ بے مدعا دیا
آتا نہیں جو رحم کبھی حالِ نزار پر
اک کشمکش ہے دونوں طرف ہم نشیں نہ پوچھ
سودائے خام اور طمعِ خسام جانئے

جنت کو بھول جائے جو کوئی صنم ملے
زاد ہے ستر باغ سے دل میں نہال کیا
دور فلک میں عیش میسر ہو کر فصیح
اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہ و سال کیا

(۹)

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو
بہیم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو
جنتک نگاہ شوق کو لپکا ہے دید کا
محکم نہیں کہ دل کی کوئی روک تھام ہو
دنیا ہے رہگذر یہ ہرنے کی جا نہیں
گھر کی طرح کسی کا یہاں کیا قیام ہو
اس عالم خسراب کو جنت بنائیے
دنیا میں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کام ہو
آشفہ سر ہوں مجھ کو غرض بوائے گل سے کیا
ہو زلف مشک بو تو معطر مشام ہو
میں انجمن میں شمع کا پروانہ کیا ہوں
کیوں اس سے لوگادوں جو صورت حرام ہو
موقوف حشر یہ نہیں کچھ کج جو مخلق
تو جلوہ گر جہاں ہو وہیں ارادہام ہو
خواب جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے
آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو
دل پر شش گناہ سے گھرائے کسی لے
اس کی رضا ہے عفو ہو یا انتقام ہو
کیا فاقہ مستیوں میں ملے لطف زندگی
یکساں ہے روز عید کہ ماہ صیام ہو
اپنی زباں پہ حرف نہ آئے کبھی فصیح
روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

اس کے علاوہ چند غزلوں کے متفرق اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

میسبت قضا کی دل میں سمائی ہوئی ہی ہے : آئی نہیں اجل مگر آئی ہوئی ہی ہے

دیکھ کہ بھر دیکھ آنکھوں کو آرمیں رہ گیا : شوق پیدا ہو کے میرے دل میں پنہاں رہ گیا
عشق میں اس بت کے آخر لو لگی اللہ سے : شوق بن کر اک چراغ زیر داماں رہ گیا
رہنے والا تھا کوئی چکر مری تقدیر میں : بن کے تیرا حلقہ وہ زلف پریشاں رہ گیا
قتل ہو کر بھی مجھے حاصل سکدوشی نہیں : سر کے بدلے تیغ کا گردن پیا حساں رہ گیا

اُس نے اگر کرم بھی کیا تو غضب ہوا
کھینچا ستم سے ہاتھ تو جی جاں بلب ہوا
شکوہ بتوں کے جو رکابے جا ہے اے فصیح
تجھ پر خدا کا قہر خدا کا غضب ہوا

جو بات چاہئے بھٹی چاہی نہ جائے گی
اہل ہوس سے چاہ نہ باہی نہ جائے گی
بد لے ہزار رنگ زمانہ مگر فصیح
بخت سیہ کی اپنے سیاہی نہ جائے گی

پوچھے کوئی تو عشق کا انجام کیا کہوں
تو ہی بتا دے لے دل ناکام کیا کہوں
دعویٰ عشق اور تمتا وصال کیا
سودائے خام یا طمع خام کیا کہوں
شمع فخر کی طرح نہ کیونکر خموش ہوں
میں بھی ہو آفتاب لب بام کیا کہوں
طوف حرم کے واسطے تقویٰ لباس ہے
دو چادر دوں کو جامہ احرام کیا کہوں

ورد اک صنم کا نام کئے جارہا ہوں میں
اک عمر سے یہ کام کئے جارہا ہوں میں
دنیا کا انتظام کئے جارہا ہوں میں
یہ کار نامہ تمام کئے جارہا ہوں میں
ناصح کی گفتگو کا خموشی جواب ہے
تقریر بے کلام کئے جارہا ہوں میں
نا کامیوں سے عشق بین دل کا میاب ہے
کو زمانہ تھا جو کام کئے جارہا ہوں میں

ترسی یاد میں تندگانی کا حاصل
کوئی لمحہ دل اس سے غافل نہیں ہے
مجھے کب ہے سجدہ سے انکار لیکن
جہیں آستانے کے قابل نہیں ہے
مروں کس لئے میں کسی فتنہ گر پر
مری زندگی اس کے قابل نہیں ہے
وہ کیا چاہئے سیر چین کی حقیقت
جسے لطف صحرابی حاصل نہیں ہے

باب یازدہم

فصح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا جائزہ

فصح الدین بلخی مرحوم کی کئی غیر مطبوعہ تصنیفات ہیں جو ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہیں کاش وہ دن قریب آئے کہ یہ تصنیفات جلد از جلد منظر عام پر آئیں۔ سطور ذیل میں ان تصنیفات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

آثار قدیمہ: بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف "تاریخ مگدوہ کے مقدمہ کے آخری حصے میں اپنی دو مزید زیر ترتیب کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ مگدوہ کی کڑیاں ہیں۔ ان میں ایک کتاب "آثار قدیمہ" ہے۔ دوسری کتاب موصوف مکمل نہ کر سکے تھے جس کا ذکر "تذکرہ نسوان ہند" میں ان کے تحریر کردہ مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے ایک ہزار مشاہیر کے حالات تحقیق و جستجو کے نتیجے میں حاصل کئے تھے جن میں لگ بھگ پانچ سو خواتین کے حالات درج تھے جن کو موصوف نے ایک باضابطہ اور علیحدہ کتاب "تذکرہ نسوان ہند" کے نام سے شائع کی۔ بہت ممکن ہے کہ چھان بین کے بعد ان اوراق کا جائزہ لے کر اور مرتب کر کے کوئی صاحب صلاحیت اس نادر تحفہ کو مشاہیر کے نام سے ترتیب دے کر شائع کرے۔

"آثار قدیمہ" بلخی صاحب مرحوم کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے کیونکہ بلخی صاحب مرحوم کی فطرت میں تحقیق و جستجو داخل تھی۔

"آثار قدیمہ" مخطوطہ کی شکل میں ۸" x ۱۲" کے سائز پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو موصوف اپنی

زندگی میں مرتب کر چکے تھے۔ اس کے مسودے کو موصوف نے خوش نویس کاتب سے قلمبند کروا کر اس کی جلد سازی کرا دی تھی۔ اس کتاب کے کچھ علیحدہ عنوانات ملتے ہیں جن کا تعلق قصبہ بہار شریف اورنگ آباد اور بہرام سے ہے۔ پوری کتاب ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی فہرست موصوف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس کتاب میں ۲۶۰ سرخیاں ہیں اور وہ اس طرح ہیں۔ عظیم آباد کے جغرافیائی حالات، گنگا و سون ندی، پن پنی، مورہ، دوپاندی، پھلگو، سٹھوانن، پنچانہ اور شکری ندی، پہاڑ، عام کیفیت، زمین، فصلیں، نباتات اور اشجار، فصل ربیع، کوہی، آلو کی کاشت، اشجار، مٹرہ یعنی پھل دار درخت وغیرہ۔

قصبہ منیر کا حال: ۹۸ھ کی مسجد، سنگر قلی خاں کی قبر ۹۹۳ھ، بڑی درگاہ اور

سدھور کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۱ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، مقبرے کا کتبہ ۱۰۳۹ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، شاہ دولت کی دنات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ، مقبرہ کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ، قصبہ منیر کی مسجد ۱۱۰۳ھ، دوسری مسجد کا کتبہ ۱۰۸۲ھ، بعض مشاہیر کا ذکر، شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ۔

قصبہ دانا پور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ شاہ محمد اکبر ابو اسلائی قدس سرہ کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۳۳۴ھ (لان سے شاہ درگاہ ارزاں تک) باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ، تبارک علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ، قبرستان میں ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پر لگا ہوا ہے ۱۰۴۲ھ یہ محمد شاہ جہاں کے عہد کی ہے۔ اصالت خاں کی مسجد ۱۲۲۴ھ، مسماۃ نوزن کی مسجد ۱۲۳۳ھ۔ بھکنا پہاڑی درگاہ شاہ ارزاں کے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲ھ، شاہ بہاول کا مزار ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۱۲۳ھ، شاہ بسنت کا مزار ۱۱۵۰ھ، شاہ کرم اللہ کا مزار ۱۱۶۱ھ، شاہ غلام حسن کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کرم بخش کا مزار ۱۲۵۲ھ، عباد اللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۹ھ، کتبہ عید گاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۷ھ، شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ۔

نمونہ سے چھم دروازہ تک پختی ٹرک (اوگٹش روڈ کے اطراف کا حال) شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، بغیر نام کا کتبہ ۱۱۲۷ھ، ایک نامعلوم شخص کی قبر اور گنبد ڈنگے کی اصلی مسجد ۱۱۹۶ھ ایک اور مسجد ایک نامعلوم قبر، مدار و مہترانی کی مسجد ۱۲۲۷ھ، شاہ باقر کا کتبہ، شاہ حمزہ علی کا کتبہ اور مزار

۱۲۲۶ھ، عید گاہ سیف خاں ۱۰۳۸ھ اور چند قبریں، شاہ کالے خاں کا مقبرہ ۱۱۲۴ھ، لان کی مسجد
 ۱۲۵۸ھ، عدالت کے احاطہ میں میجر فرلک نوکس (Furlic Knox) کی قبر ۱۷۴۲ھ، ماں
 بی بی کی مسجد ۱۲۱۶ھ، ماں بی بی کی قبر ۱۲۲۵ھ مراد پور، خدا بخش لاہوری ۱۸۹۱ھ، مراد پور کی مسجد
 ۱۲۳۳ھ، حمام کا کتبہ ۱۲۴۹ھ، پٹنہ کلج، پٹنہ وینور سیٹی کے مکانات، مدرسہ شمس الہدیٰ کی مسجد
 ۱۳۳۰ھ، انجینئرنگ کلج، گوک پور کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خادم علی کی مسجد ۱۲۵۸ھ، تاجو کی مسجد ۱۲۱۴ھ
 ۱۲۸۲ھ کی ایک مسجد، پتھر کی مسجد ۱۰۳۶ھ، موہی دفالی کی مسجد ۱۲۶۳ھ، ایک انگریز کی قبر ۱۸۲۰ھ
 صلابت خاں کی قبر کا کتبہ ۱۲۲۶ھ، حاجی چاند کی مسجد ۱۰۵۶ھ، بی بی لطفا کی قبر کا کتبہ ۱۲۷۶ھ۔
 گلزار باغ میں اثنا عشریہ کی مسجد ۱۲۶۱ھ، شیخ قمع علی کی مسجد ۱۲۵۵ھ، بی بی مدار بخش کی قبر ۱۲۵۸ھ
 شاہ عالم بادشاہ کی جلوس گاہ، پیر بخش کی مسجد ۱۲۶۵ھ۔

لودی کٹرہ سے خواجہ کلان گھاٹ تک :

ممکیہ شاہ کی قبر کا کتبہ ۱۲۵۷ھ، حسینی بیگم کی قبر، مسماۃ جعفری کی قبر ۱۹۰۳ھ، دولی گھاٹ
 میں بی بی مخدوم کی مسجد ۱۳۰۶ھ، امین الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ کی مسجد ۱۲۰۸ھ
 شیش محل کی مسجد ۱۱۹۰ھ، بانی مسجد میر بہاؤ الدین کی قبر ۱۱۹۹ھ، شیش محل کی دوسری مسجد ۱۲۶۲ھ
 ولندیزہ کا پشہ متیں گھاٹ کی مسجد اور حضرت منعم پاک کا مزار، حضرت شاہ عشق کا ممکیہ حاجی تھی کی مسجد
 اور مقبرہ، محمد کریم شاہ کی قبر ۱۳۳۳ھ، قطعہ سال وفات سعید جہاں شہزادہ محمد کریم ۱۳۳۳ھ، بخشی گھاٹ
 اور ڈاکٹر فلرٹن کا مکان رائے صاحب کا پشہ حویلی بیگمان۔

پچھم دروازے سے پورب دروازے تک عمارتوں کا حال :

محلہ گزری کی عمارتیں، مرزا معصوم کی مسجد ۱۲۲۳ھ، مرزا علی کی قبر ۱۲۶۵ھ، شیخ رضا کی
 مسجد اور ایک قبر، بادشاہ محل اور بادشاہ نواب مارکٹ، نواب لطف علی خاں روڈ، باؤا کی مسجد ۱۲۹ھ
 نواب میر الدولہ رضا علی خاں کا مقبرہ ۱۱۹۸ھ، سیٹی ہسپتال اور رحیم النساء کی قبر ۱۱۶۰ھ انگریزوں
 کا گورستان اور قتل ۱۷۷۶ھ، گڑھہ کی بڑی مسجد ۱۱۹۱ھ، گڑھہ کی چھوٹی مسجد ۱۲۱۴ھ، پادری
 کی حویلی ۱۸۱۳ھ، پادری بینڈ کش (Benedictus) کی قبر ۱۲۷۷ھ، بخشی محلہ

نواب جعفر قلی خاں کے خاندان کا گورستان، اشرف النساء بیگم کی قبر ۱۳۳۳ھ، نواب نصرت
 حسین خاں کی قبر ۱۳۳۴ھ، مولوی اکرام الحق کی مسجد ۱۲۳۴ھ جو (بلخی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے)
 ارشاد علی عرف چھٹن کی قبر ۱۳۳۳ھ، مہدی علی عرف بنق کی قبر ۱۳۳۳ھ، محمدی جان کی مسجد ۱۳۰۵ھ
 کوچہ کنگری کی مسجد ۱۲۶۱ھ، مخدوم حسن علی کا مزار ۱۲۲۳ھ، طہارت حسین کی قبر ۱۳۱۱ھ محلہ خواجہ کلاں
 ڈاکٹر صادق خاں کی مسجد ۱۲۹۹ھ، جعفر خاں کی عدالت ۱۰۷۲ھ، حسن علی کا دارالعدل ۱۲۴۲ھ
 مسجد بیگو حجام جو حقیقتاً حسین شاہ کی بڑائی ہوئی ہے ۹۱۶ھ، بیگو حجام والا کتبہ ۱۰۵۶ھ
 اورنگ کی مسجد ۱۰۷۸ھ، فخر الدولہ کی مسجد ۱۲۰۲ھ، گدام کی مسجد متصل کٹرہ شالیستہ خاں ۱۲۶۲ھ
 چوک کی مسجد ۱۲۵۱ھ، خواجہ عیسیٰ کی مسجد ۱۱۱۰ھ، مدرسہ سیف خاں ۱۰۳۸ھ، مدرسہ کی مسجد
 ۱۰۳۸ھ، عمارت چهل ستون، قلعہ عظیم آباد، قلعہ کی مسجد ۱۲۲۹ھ، شاہ معروف کی قبر، محلہ منگلپورہ
 جعفری بیگم کی قبر ۱۳۱۳ھ، اصغری فاطمہ کی قبر ۱۳۳۳ھ، سید کرامت حسین کی قبر ۱۳۲۲ھ، شیخ
 احمد عربی کی مسجد ۱۲۵۲ھ، شیخ بہاری کی مسجد ۱۲۴۴ھ، خواجہ عطار اللہ کی قبر ۱۲۶۲ھ، شیخ محمد
 بدقن کی قبر، مولوی نوروز علی کی قبر ۱۲۳۳ھ، مولوی نور علی کی قبر ۱۲۶۲ھ، علی حسین ولد بخو کی قبر ۱۳۲۲ھ
 حاجی عباس کی قبر ۱۳۴۴ھ، منظر حسین کی مسجد ۱۳۰۴ھ، میاں جان کی قبر ۱۲۷۱ھ، جگی چورابہ گلشن
 حیدری کنگیا ٹولہ سونا ٹولی شاہ کی اہلی لودی کٹرہ، دندی بازار کا حال، بام صاحب کی مسجد ۱۲۴۳ھ، بلاقی
 کی مسجد ۱۲۰۵ھ، میر قطب الدین کی قبر ۱۱۸۳ھ، رس بٹے کی گلی کا گورستان، سید علی عظیم کی قبر ۱۳۳۴ھ
 سید نظام الدین کی قبر ۱۳۰۵ھ، گھسولی بی کی قبر ۱۳۴۱ھ، گلشن حیدری، گلشن حیدری کی مسجد
 ۱۲۵۴ھ، امام بازے میں منبر کا کتبہ ۱۳۱۵ھ، سید نجف علی کی قبر ۱۲۶۱ھ، نواب یوسف علی خاں
 کی قبر ۱۳۱۴ھ، عبدالحسین خاں کی قبر ۱۳۱۰ھ، کلثوم بیگم کی قبر ۱۳۲۳ھ، بشارت حسین کی قبر
 ۱۳۰۸ھ، محمد ذاکر کی قبر ۱۳۲۲ھ، سونا ٹولی میں ڈاکٹر معشوق علی کی قبر ۱۳۴۶ھ، منگلپورہ میں
 بنت سید محفوظ کی قبر ۱۲۰۱ھ، کشمیری باغ میں ایک قبر ۱۲۱۳ھ، کشمیری باغ میں مسجد ۱۲۱۹ھ محلہ
 میر کلامی شاہ ویرت علی کی قبر ۱۲۲۱ھ، محلہ شاہ کی اہلی میں مقبرہ ۱۲۱۳ھ، محلہ کشمیری کوٹھی میں فضل علی
 کی مسجد ۱۲۵۷ھ، محلہ کنگیا ٹولہ شیخ قادر بخش کی مسجد ۱۲۴۹ھ، شاہ غلام جی کی مسجد ۱۲۰۸ھ

شاہ غلام یحییٰ کی قبر، مراد النساء کی مسجد ۱۲۳۳ھ، لودی کٹرہ میں دوسری مسجد ۱۲۲۳ھ، حکیم احمد حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، دوندی بازار میں ایک گنبد کی مسجد ۱۰۶۱ھ، میدان قصاب میں قبر کا کتبہ ۱۰۵۹ھ۔

منگل سنگ روڈ پیار النساء کی قبر ۱۱۹۹ھ، منگل تالاب چوک شکار پور کی مسجد ۱۲۸۷ھ، چوک شکار پور کی دوسری مسجد ۱۳۰۲ھ، حاجی تمار کی مسجد ۷۰۰ھ، منشی کاظم علی کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۲۸ھ، حاجی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ، محلہ دول پوری شیر شاہی مسجد، محمد مراد شہید صوفی کی قبر کا کتبہ ۹۲۹ھ، ظریف الملک اشرف علی خاں فغاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۲۳ھ، شیخ عنایت حسین ذاکر امام کی قبر ۱۲۴۹ھ، مسماۃ نصیب کی قبر ۱۲۸۶ھ، حسینی بیگم کی مسجد ۱۲۴۲ھ، قبر سید اقبال علی رضوی بن سید حیدر علی رضوی المعروف بہ شاہ جمال حسین ۱۲۲۹ھ، فیض النساء بیگم کی قبر ۱۲۶۷ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد ۱۰۷۲ھ، ڈہائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۷۲ھ، مقبرہ سعادت خاں کچی باغ، کمیدان کی مسجد ۱۲۱۱ھ، میر اشرف کی مسجد ۱۱۸۷ھ، مسماۃ فاطمہ کی قبر ۱۱۸۹ھ، میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ، میر اشرف کی وفات کا قلعہ ۱۱۸۹ھ، میر فرحت حسین کی مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد ۱۳۰۵ھ، شاہ منصور کی قبر ۱۲۵۰ھ، ہیبت جنگ کا مقبرہ مسجد ۱۷۲۸ھ، افضل حسین کی قبر ۱۹۲۶ھ، حاجی علی بخش کی مسجد ۱۳۲۲ھ، کلثوم النساء کی مسجد ۱۲۷۰ھ، شاہ کماک کی مسجد، شاہ کماک کی مسجد ۱۲۵۳ھ، شاہ کماک کی قبر، سرائے کی مسجد ۱۲۱۹ھ، عبدالرحمن سجاد کی مسجد ۱۱۵۰ھ، قحانہ السلاخی میں بنیر نام کا کتبہ، ڈینس کوٹھی اور برز کی قبر ۱۷۷۰ھ، مسجد پیر دھڑیا کے پاس قبر کا کتبہ ۱۲۱۹ھ، مسجد پیر دھڑیا، منجلی بیگم کی قبر ۱۲۸۲ھ، شاہ دھڑیا کا مزار، محلہ لون گولے میں مسجد اور مزارات، شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ لکھی کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر، محمد حسن ولد سید غلام حسین مؤلف سیر المتاخرین کی قبر ۱۱۹۸ھ، بارے کی مسجد ۱۲۷۱ھ، عالی نسا، بیگم کی مسجد ۱۲۴۴ھ، بزرگ امید خاں کی مسجد ۱۱۷۰ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین کی قبر ۱۳۳۰ھ، میر فرزند علی کا امام بارہ ۱۲۳۵ھ، کنگن کا مقبرہ کٹرہ، السلاخی میں ایک مسجد، کٹرہ، السلاخی میں

ایک مندر، بارغ جعفر خاں، قدم رسول کی مسجد، محمد علی خاں کی قبر ۱۱۷۸ھ، نورانی چور کا مقبرہ،
بواجی کی باؤلی، مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت، مخدوم آدم صوفی، اللہ جلانی کی قبر ۱۳۳۷ھ
جھولی کی مسجد ۱۳۱۰ھ۔

اس کے علاوہ مخطوطہ مذکور کے سائز پر خوشخط حروف میں قصبہ سہرام کا حال درج ہے اس میں

حسب ذیل سرخیاں ملتی ہیں :

قصبہ سہرام و عالمگیری مسجد، آثار قدیمہ سہرام تارا چندھی دیوی مندر، حسن سور کا مقبرہ،
حسن سور کے مقبرے کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ ایک عجیب صنعت، عید گاہ کے کتبے، اتر جانب والا
کتبہ، درمیانی کتبہ، دکھن جانب والا کتبہ، سرمست خاں کا روضہ، علاء دل خاں کا روضہ، صدر جنگ
کا قلعہ حاکم، چندن پہاڑی کے قریب مسجد ۱۰۲۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ، مہدی حسن کی قبر
۱۲۰۱ھ، امام بارے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی کے بازار میں ایک مسجد ۱۰۵۵ھ، جانی کے بازار
میں امام بارے ۱۲۰۰ھ، کرن سرائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ، ۱۲۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔

اس کے بعد کاپی کی شکل میں آٹھ صفحات پر مشتمل کاغذات پر قصبہ اورنگ آباد کا حال ہے

جس میں حسب ذیل سرخیاں ہیں۔

قصبہ اورنگ آباد عبدالواحد خاں نزاہی کی مسجد ۱۱۳۳ھ، موضع سرسٹن الدین محمد کی مسجد
۱۰۷۱ھ، غلام مصطفیٰ کی قبر ۱۲۹۵ھ، انواب غلام حسین خاں کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۳ھ قصبہ
داؤدنگر مسماۃ فراست النساء کی قبر ۱۲۶۶ھ۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے جو کتبات مزارات اور دیگر تاریخی مقامات کے جمع کر کے رکھے
ہیں ان سبوں کی حیثیت آثار قدیمہ کی ہے ان میں بہت سارے آج عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن مخطوطہ
کے اوراق پر لیشاں پر اب بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ عہد ماضی کی تاریخ سے دلچسپی
رکھنے والوں کے لئے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

آثار بلخیہ : مرحوم کی دوسری غیر مطبوعہ تصنیف آثار بلخیہ ہے، یہ تاریخی نام ہے

جس سے ۱۳۲۹ھ کا تعلق ہے اس کا مخطوطہ نہایت ہی خستہ حالت میں ہے، ۲۰" x ۳۰" سائز

پر ہے اس کتاب کی ابتدا میں مرحوم نے منشاء اور سبب تالیف کتاب "آثار بلخیہ" کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے: بخلقکم من نفس واحدۃ تا رجالا کثیرا و نساء یک کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ تمام نوح انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں لہذا کسی انسان کا اپنے خاندان پر فخر کرنا محض نادانی ہے۔ آیت کریمہ کی روشنی میں یہ فرمایا ہے کہ خاندان کا محض تعارف کرنا اس لئے مد نظر ہے کہ حضرت ابراہیم ادھم بلخی اور ان کی اولادوں میں بعض بزرگوں کے حالات ہماری بصیحت اور عبرت کے لئے فائدہ مند ہیں اس لئے اس کام کو ضروری سمجھا گیا۔

کتاب کے شروع میں جو مرحوم کی تحریر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشہور و معروف اولیاء اللہ حضرت ابراہیم ادھم بلخی، حضرت منظر شمس بلخی، حضرت نوشہ توحید بلخی اور ان کے خاندان کا مکمل تذکرہ زمانہ حال تک اس خاندان کے تمام واقعات مع نسب نامہ کتب تواریخ اور تذکروں سے اخذ کر کے اصل اخذوں کے حوالوں کے ساتھ تفصیل وار اس کتاب میں درج ہو جائے۔

اس کے بعد وہ باب ہے جس میں شہر بلخ کے حالات ہیں اور اس کے بعد کے باب کی سرخی حضرت ابراہیم ادھم بلخی ہے جن کے حالات تواریخ کے حوالوں سے پیش کئے گئے ہیں پہلی کتاب کتاب ۱ ہے جس کے بزبان عربی اقتباسات مع ترجمہ پیش کئے گئے ہیں، دوسری کتاب تاریخ کبیر کے بیان کو نقل کیا گیا ہے، اس کے بعد طرائق المحقق نامی کتاب کا نام درج ہے، اس کے بعد فصاحت البغی کا اصل بیان درج ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم ادھم بلخی کے توکل اور اشار کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک باب قائم کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں کتاب وسیلہ شرف کا بیان و تذکرہ صادقہ کا بیان درج ہے۔

اس کے بعد تیسرا باب شروع ہوتا ہے جس کی سرخی بلخیوں کی ہندوستان و صوبہ بہار میں آمد ہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹی سی سرخی بلخی شہزادے کا باغ ہے، اس باب کے آخر میں خاندان بلخیہ کا نسب نامہ ہے جو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب سے شروع ہو کر مولانا منظر بلخی مولانا معز الدین بلخی پر ختم ہوتا ہے۔

اس باب کے بعد چوتھا باب شروع ہوتا ہے جس کی سرخی مولانا شمس الدین بلخی ابن علی بلخی ہے۔

اس کے بعد کے باب کی سرخی مولانا مظفر برہان الدین شمس بلخی ہے یہ اس کتاب کا پانچواں باب ہے۔
 چھٹے باب کی سرخی مولانا شمس الدین بلخی و مولانا قمر الدین شمس بلخی ہے، ساتویں باب کی سرخی حضرت حسین
 بلخی بملقب نوشہ توحید بلخی ہے اس کے بعد آٹھویں باب کی سرخی مولانا حسن بلخی ہے اور اس باب کے بعد
 نواں باب ہے جس کی سرخی مخدوم احمد بملقب لنگر دریا بلخی ہے اور اس کے بعد دسواں باب ہے جس کی
 سرخی مخدوم ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی ہے، اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی
 ذکر ہے اور لکھا گیا ہے کہ مخدوم حافظ بلخی مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی کے منجھلے بیٹے تھے آپ
 ہی کی اولاد سے خانقاہ فتوح میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے بعد مخدوم شاہین بلخی مخدوم
 محمود بلخی، ابن مخدوم ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے اور اس کے بعد کتاب کا گیارہواں باب ہے جس کی سرخی
 مخدوم درویش بلخی ہے، اس کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں جن کی سرخیاں مولوی محمد واجد بلخی ابن
 قاضی طہارت التوحید بلخی و مولوی ضمیر الدین احمد بلخی تخلص بہ اوج ہے گویا یہیں پر اس کتاب کا خاتمہ ہے
 اس مخطوطہ میں کچھ سادہ کاغذات چھڑ دیئے گئے ہیں اس کے بعد قطعہ تاریخ وفات مولوی حفیظ الدین بلخی ہے
 جو بزبان فارسی ہے اور جس کے نتیجے میں فارسی زبان میں ہے اس سے ان کی فارسی النشا پردازی کا اچھا
 خاصا علم ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم اس کتاب کو اپنے بعد یعنی اپنے منجھلے بھائی عزیز الدین
 بلخی مرحوم تک لے جانا چاہتے تھے شاید اس کا موقع نہ ملا، اس پورے مسودے کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا
 ہے کہ اس کی ترتیب کتابت میں دماغ سوزی اور جانفشانی کا کام ہے جو حد درجہ مشکل ہے کاش یہ بھی
 کسی کے ہاتھوں انجام پائے۔

دستور سخن : فصیح الدین بلخی مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیفات کے سلسلے میں دستور سخن

کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، یہ تصنیف موصوف کی تیسری غیر مطبوعہ تصنیف ہے جس کا ایک حصہ موصوف
 صاف کر چکے تھے اور باقی حصہ اوراق پریشاں کی شکل میں محفوظ ہے۔

اس کتاب میں اردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقا، حروف تہجی، حروف تہجی کی قسمیں، حروف

تمازی کی قسمیں، اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد ایک سرخی اصطلاحات کی قائم کی گئی ہے

جس میں حذف و ترمیم، تخفیف مقدمہ، استنباع و امالہ، تحریک و کلین، قلت و ثقل، ابواب مترادف،

• مشترک و توابع، قیاسی و سماعی اور استقاق۔

اس کے بعد کی سرخی فصاحت ہے اس حصے میں سب سے پہلے فصاحت کی تعریف کی گئی ہے۔
اس کے بعد تنافر، ائتصال، توانی، اضافت، ضعف، تالیف، مخالفت، قیاس، نکت، اضافت،
استقاق کا بیان ملتا ہے اس کے بعد تکرار و حشو کی سرخیاں ملتی ہیں، تکرار و حشو و غرابت و تکلف و تنفرد
تناقص، تعقید لفظی، تعقید معنوی، تقدیم و تاخیر، شتر گریہ، ابتذال، سرفہ کو سمجھا کر لکھا گیا ہے، اس کے
بعد ایک سرخی فصاحت و بلاغت کا فرق ملتی ہے۔

غرض کہ اس کتاب میں قواعد و زبان سے بحث کی گئی ہے، حروف پنجی سے بھی اور اردو زبان کے
ارتقا کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اردو شاعری کی بحث کے سلسلے میں فن فصاحت
و فن بلاغت کا عالمانہ بیان ملتا ہے اور آخری حصے میں فن عروض کی تعریف کرتے ہوئے تمام طور کے بیانات
ملے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اردو شاعری کے لئے کون کون سی معقول بحر ہیں اور کون کون سی
بحر ہیں اس شاعری کے لئے مناسب ہیں غرض کہ واقعی یہ کتاب اردو زبان و ادب اور خصوصی طور پر شاعری کا
دستور العمل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نام "دستور سخن" رکھا گیا۔

علم نجوم : سوانح حیات کے سلسلے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فیض الدین بنی مرحوم ایک
ماہر نجوم بھی تھے لیکن ہمیشہ ور نجومیوں کی طرح کبھی بھی انہوں نے اپنی اس صلاحیت کا ڈھنڈورا نہیں بیٹا
بہت کم لوگ مرحوم کی اس صلاحیت سے واقف تھے اور واقف ہیں یہاں تک کہ گھر والوں کو صرف اتنا معلوم
تھا کہ مرحوم نے اپنے عہد شباب میں اس علم سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس کی اشاعت نہیں ہو سکی تھی
چنانچہ ان کے لڑکے نے اس کتاب کی اشاعت کی طرف رجحان دلایا تھا لیکن انہوں نے فرمایا کہ جب وقت
سازگار ہوگا تب تو یہ کام انجام پاتا ہے۔

یہ کتاب غور و فکر کی شہل میں ۱۰×۵ پر ہے پہلا ورق اُلٹتے ہی سرورق مرحوم کا اس پر انگریزی
میں دستخط ہے ۱۹۱۰ء لکھا ہوا ہے لیکن کتاب کے آخری حصہ پر جو کتابت تحریر کا نام ہے اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ۲ ربیع الثانی بروز چہار شنبہ ۱۳۱۰ھ میں کتابت کا کام ختم ہوا، اس کتاب علم نجوم کی
کتابت جس خوشنویس سے انہوں نے کرائی ہے اس کا نام سید مرتضیٰ حسن ہے۔ کتاب مجموعی طور پر ۱۰۹ صفحات

مخطوطہ کی شکل میں رکھی ہے۔ اگر اس کی طباعت ۱۰/۲۰x۲۰ کے سائز پر ہو تو صفحات اس سے بھی زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مسودہ میں کہیں کسی صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں کسی پر ۱۸ اور کسی پر ۱۹ سطریں ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے سے انسان احساس ہوتا ہے کہ علم نجوم پر وہ کچھ اور کھٹے فالے تھے جس کا مرتبہ ایک ہی حصہ بطور جلد اول انہوں نے مکمل کیا تھا اور حصے کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ اوراق پریشاں پر مکمل کئے گئے ہوں، علم نجوم سے متعلق اس راقم الحروف کی کوئی واقفیت نہیں اس لئے مرقم اس کتاب پر اپنی رائے زنی پیش کرنے سے قاصر ہے، صرف اس کتاب کے ترتیب وار مواد سے تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کتاب کے آخری حصہ پر چونکہ تاریخ اور سن درج ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی تھی کتاب کے آخری صفحہ کے بعد جو ایک سادہ صفحہ رہ گیا ہے اس میں مرحوم ہی کی تحریر میں مرحوم کا زائچہ پیدائش بنا ہوا ہے اور کتاب کے پہلے صفحہ پر بھی مرحوم ہی کی تحریر میں ایک دوسرا زائچہ پیدائش ہے جو ان کے اپنے بھانجے سید عزیز احمد کا ہے، پوری کتاب کئی ابواب اور فصلوں پر منقسم ہے جس کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

کتاب کھولتے ہی باب اول بروج سے متعلق آتا ہے، باب اول میں اسمائے بروج کا ذکر ہے۔ فصل دوم میں حالات بروج کا، فصل سوم میں درجات بروج کا، فصل چہارم تعلقات بروج کا، فصل ششم میں نوازا (نوجوان حصہ) ہفتم فصل اعداد بروج کا، ہشتم میں بروج کا، اسی پر کتاب کا پہلا باب ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد کتاب کا دوسرا باب سامنے آتا ہے، دوسرے باب میں تین ہی فصل ہیں جس کی پہلی سرخی پختہ لکھا ہوا ہے اس کے بعد اسمائے پختہ درج ہیں، فصل سوم خواص پختہ ہے۔ تیسرا باب ایام اوقات ولادت ہے اس کی پہلی فصل تاثرات جو کہ پختہ ہے، اس کی دوسری فصل کی سرخی خاصیت ماہ تولد ہے اور اس کی فصل سوم خاصیت بچہ ہے اور اس باب کا فصل چہارم خاصیت تاریخ پختہ فصل پنجم خواص سرخیاں امتحان اول و پدرو بود، تعمیر کا امتحان دوم سمت مکان پیدائش امتحان دروازہ مکان تولد امتحان حقیقت تولد امتحان پیدائش، امتحان تعداد دعوت اور زچہ خانہ، امتحان زچہ بڑے خاندان امتحان چارپائی حاملہ طریقہ دریافت یا امتحان پرشن کنڈلی (زائچہ سال اس کے بعد

اسی باب کا فصل چہارم آتا ہے جس کی سرخی اقسام خانہ ہے اس کے بعد پانچویں فصل ہے جس کی سرخی
مصنوعات دروازہ خانہ ہے اس کے بعد چھٹی فصل ہے جس کا عنوان خواص ستارگان ہے اس کے بعد
فصل ہفتم ہے جس کا عنوان خواص ستارگان مطابق ستارگان ہے، اس باب کے آخری فصل میں کئی
چھوٹی چھوٹی سرخیاں پائی جاتی ہیں اور اسی سرخی پر کتاب کا اختتام ہے یعنی مجموعی طور پر اس کتاب میں
پانچ ابواب ہیں، اس کتاب کو پڑھنے سے انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں ستاروں کی چال
اور زائچہ پیدائش یعنی جنم کنڈلی بنانے کے طریقے سمجھا کر لکھے گئے ہیں، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو اردو
میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے معلوماتی، دلچسپ اور دلفریب ہوگی۔

باب دوازدهم

فصح الدین بلخی کا نثری اسلوب

قبل اس کے کہ ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کا جائزہ لیں یہ ضروری ہے کہ اردو کے اسالیب نثر کے ارتقا کا ایک خاکہ ہمارے سامنے پیش ہو۔

اردو ادب میں نثر اولین کی کتابیں مذہبی امور پر مبنی ہیں لہذا ان میں مذہب اور تصوف سے متعلق مخصوص عربی اصطلاحات موجود ہیں، کشف و مراقبہ، مشاہدہ، کرامت، معرفت، شریعت، طریقت، قیامت، محشر، ناسوت، جبروت، ممکن الوجود، واجب الوجود، وحدت الوجود، سالک و عارف وغیرہ اصطلاحیں کثرت سے موجود ہیں، خواجہ محمد بندہ گیسو دراز کی کتاب معراج العاشقین ہو یا میران جی خٹم العاشق کی جل ترنگ ہو یا شاہ برہان الدین حاتم کی حکمت الحقائق یا سید محمد عبداللہ کا ترجمہ نشاط العشق، ان ساری کتابوں میں اصطلاحیں ایسی ملتی ہیں۔ ان بزرگوں کی تصنیف و تالیف کا واحد مقصد مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت تھا، لہذا ان کی زبان کچھ حد تک سلیس و سادہ ہے۔

دسویں صدی ہجری میں اردو کی نشوونما ایک خاص انداز میں شروع ہوئی ہے، مولانا کا احکام الصلوٰۃ ۱۰۳۲ھ ملا وجہ کا سبرس ۱۰۴۵ھ، میزان یعقوب کا ترجمہ شمائل الاتقیاء ۱۰۷۸ھ یا شاہ ولی اللہ قادری کا ترجمہ معرفت السلوک ۱۱۱۰ھ وغیرہ کتابوں کا اگر باہم موازنہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ ان کی عبارتوں پر فارسی اسلوب بیان کی چھاپ نمایاں ہے۔

اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محی الدین درو اپنی کتاب اردو کے اسالیب بیان میں

لکھتے ہیں :

”اس دور کی آخری تصانیف باقر آغا خاں کی ہیں جو غالباً جدید اسالیب بیان اور قدیم طرز الشارحہ ازی کی درمیانی کڑیاں ہیں یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اردو نشر میں علمی موضوعات پر قلم اُٹھایا۔“

یائے معروف اور یائے مجهول، تکریر و تانیث میں اس وقت بھی دوبار کے مانند کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا، تاہم اس عرصے میں اردو زبان کے لفظی خزانے میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ دکن میں چار صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں سوائے فضلی کی کربلی کتھا و وہ مجلس سے پہلے اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

ڈاکٹر رفیع سلطانہ لکھتی ہیں :

”انہوں نے نوار دراللفاظ کے ذریعے اردو کی بڑی مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے، اردو کا سب سے بڑا کا نامہ غرائب اللغات کی تصحیح ہے۔“

اردو نظم کے بعد اردو نشر کی تعمیر کرنیوالے سودا کا نام خصوصی طور پر لیا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے دیوان کا دریا چہ اردو نشر میں لکھا۔

فرٹ ولیم کلج سے قریب تر زمانے سعادت یار خاں رنگیں نے ایک رسالہ قلمبند کیا، اردو نشر کے آغاز اور ارتقا میں اس کے سولہ شعری تصنیفات کا ذکر ملتا ہے۔

اس عہد میں مرزا جان پیش نے ایک مختصر رسالہ شمس البیان لکھا، ڈاکٹر جاوید نہال کے خیال کے مطابق ۱۲۰۷ھ میں لکھی گئی اور یہ کتاب پہلی بار مرشد آباد سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید نہال اپنی کتاب ”انیسویں صدی میں برنگال کا اردو ادب“ میں یوں رقمطراز ہیں :

”اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے مرزا جان پیش کی شمس البیان کو

۱۔ اردو کے اسالیب بیان ص ۱۲

۲۔ اردو نشر کا آغاز و ارتقا ص ۳۶۶ بحوالہ شاد عظیم آبادی اور ان کی نشر و نگاری ص ۳۷۲

۳۔ ملاحظہ ہو ”انیسویں صدی میں برنگال کا اردو ادب“ ص ۳۳۷، ۳۳۸

خاص اہمیت حاصل ہے۔ پیش نے اپنی کتاب میں دلی کے محاورات اور ضرب المثل استعمال کئے ہیں۔ سید انصار اللہ خاں کی تصنیف ”دریائے لطافت“ اور ”رانی کبنتکی“ کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے ”دریائے لطافت“ ۱۸۰۸ء میں تصنیف ہوئی تھی اور ۱۹۲۴ء میں بعد ان کے بیٹے مولوی سید الدین خاں نے مرشد آباد سے شائع کی۔ اردو نثر کی ترویج و ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج نے نمایاں خدمت انجام دی، اگرچہ یہ کالج سیاسی مقصد کی بنا پر کھولا گیا تھا۔ اس ضمن میں جان پارٹھوک گل کرسٹ کا نام خصوصی طور پر لیا جاسکتا ہے جنہوں نے اردو زبان و ادب کی بے پناہ خدمت انجام دی لیکن آج ان کے حالات پردہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس شخص نے نہ صرف اردو زبان کی خدمت کی بلکہ ہندوستانی ادیبوں اور مصنفین کو یکجا کر کے کئی مفید کتابیں لکھوائیں۔

ڈاکٹر جاوید نہال اپنی تصنیف ”انیسویں صدی کے بنگال کا اردو ادب“ میں فورٹ ولیم کالج اور اردو نثر کے بارے میں اپنی اپنی اظہار خیال فرماتے ہیں:

”فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو کا نیا دور شروع ہوا، اردو نثر کی باقاعدہ تحریک شروع ہوئی اور نثر کا ابتدائی اسلوب سامنے آیا۔“

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے اردو نثر کی راہ ہموار کرنے میں نمایاں خدمت انجام دیں، میر تقی دہلوی، منظر علی خاں، نہال چند لاہوری، حیدر بخش جدری اور شیر علی افسوس وغیرہ، ماسوا ان کے کالج کے گمنام مصنفوں میں نہال چند لاہوری مترجم قصہ گل بکاؤلی، باسط خاں مصنف گل صنوبر میر معین الدین فیض مصنف چشمہ فیض (چشمہ فیض پند نامہ عطار کا ترجمہ ہے) سید حمید الدین بہاری مصنف خوان نعمت وغیرہ۔

گل کرسٹ نے نہ صرف کالج کے ملازمین سے کتابیں لکھوائیں بلکہ ان حضرات سے بھی کام لے جو کالج کے منشی نہیں تھے۔

میر الوائقا سم مصنف حسن اختلاط، شاکر علی مترجم قصہ الف لیلی، مرزا مغل مترجم بوستان سعدی، اخلاق البقی مصنف غلام اشرف۔

فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں میرامن کی باغ و بہار کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی باغ و بہار کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری درود اپنی کتاب اردو کے اسالیب بیان میں یوں لکھتے ہیں۔

۱۔ ”میرامن پہلے شخص ہیں جنہوں نے صاف سیدھی اور با محاورہ اردو لکھی، ان کی زبان نہایت سلیس تھی، باغ و بہار کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اس کا یقین نہیں آسکا کہ وہ اٹھارہویں صدی کے قریب لکھی گئی، ان کی زبان وہی ہے جو ایک صدی کے بعد نذیر احمد نے استعمال کی ہے۔“

آغا محمد باقر کا خیال ہے:

۲۔ ”بقول سر سید احمد ان کو اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو یر تہی میر کو نظم میں۔“
فورٹ ولیم کی جو دہلوی دوا دین موجود تھیں یا پرورش پارہی تھیں اس کے نتائج مستقل طور پر مزید کا ثبوت ثابت ہوئے۔ انہیں اصولوں کو برت کر سر سید احمد، ڈپٹی نذیر احمد اور ذکار اللہ نے اردو نثر نگاری کو تہذیب و تمدن سے قریب تر کر دیا۔ بیشتر حضرات دہلی کالج میں اردو نثر دوسرے اصناف ادب کے لئے استعمال کی گئیں۔

اسی زمانے میں ایک مذہبی تحریک پیدا ہوئی جو سر سید احمد بریلوی کی تحریک ہے۔ اس تحریک کو ہم تحریک وہابیہ کے نام سے پکارتے ہیں، اردو نثر کو پروان چڑھانے میں علمائے صادق پور کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں اصول اور فن نگاری کی دہلوی دوا دین پرورش پارہی تھی۔ سر سید احمد،

۱۔ اردو کے اسالیب بیان ص ۲ بحوالہ شاد کی نثر نگاری
۲۔ تاریخ نظم و نثر اردو ص ۱۱۱ بحوالہ شاد کی نثر نگاری

ڈپٹی نذیر احمد اور ذکار اللہ نے اردو نثر نگاری کو زندگی کے دوسرے مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔

۱۔ "غالب نے اگرچہ خطوط لکھے مگر ان کی نثر بھی ایسی بوجھل و بے گارنگی ہے اور اس طرح مختلف رجحانات اور شعاعیں ان کی نثر سے نکلتی ہیں جو بعد میں آنے والی مختلف اصناف نثر کو یکساں متاثر کی ہیں۔ غالب کے بعد آنے والے تمام لوگوں نے ان کی نثر سے فائدہ اٹھایا ہے، مولانا محمد حسین آزاد کے ضمن میں رام بابو سکسینہ کا یہ خیال ہے:

عنا نثر میں شاعری کرتے ہیں اور شاعری کرتے ہوئے نثر لکھتے ہیں۔"

مگر حالی اور سرسید غالب ہی کی راہ پر گامزن ہوئے، سلاست، روانی اور بے تکلفی ان کے نثر کی نمایاں وصف ہے۔ ذیل میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی نثر کا جائزہ لے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی نثر میں فورٹ ولیم کالج اور سرسید تحریک تینوں خوبیوں کو انہوں نے اپنی نثر میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کا اسلوب: فصیح الدین بلخی مرحوم ادبی دنیا میں مورخ، محقق، ناقد اور ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر شعیب راہی نے فصیح الدین بلخی اور ان کے اسلوب پر ایک گراں قدر مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو رسالہ زبان و ادب اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے وہ لکھتے ہیں:

"فنکار کے فنی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت جہاں ایک طرف ان مخصوص اصناف ادب کی دوہلیوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے جس سے فنکار متاثر ہوا ہے وہیں دوسری جانب اس کے گہر بلو خاندانی نسلی روایت کو بھی ذرا موش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فصیح الدین بلخی کا تعلق اس خاندان سے تھا جس میں تصوف، روحانیت، فقر اور درویشی کا دار و درہ رہا ہے، جس خاندان کے فقرا اور درویشوں نے اپنی خالفتا ہوں میں بیٹھ کر روحانیت کا درس دیا ہے اور سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، جہاں تصنیع اور ظاہر داری، بے جانہ و نمائش

کا کوئی گزر نہیں، جس کی سادگی، صفائی، آلہ کاری اور شگفتگی ان کے اسلوب کا طرہ امتیاز ہے، ان کا اسلوب فقر اور درویشوں کی طرح ظاہر داری اور تکلفات سے پاک ہے۔
میں نے سوانح حیات کے سلسلے میں یہ عرض کیا ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ بلخی صاحب مرحوم فورٹ ولیم کالج کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر رواں اور سلیس ہے جس کی داغ بیل میرامن نے ڈالی تھی اور سرسید گروپ ہوتے ہوئے پروان چڑھی ڈاکٹر شعیب لاہی لکھتے ہیں :

”ان کی خاندانی روایت بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں ناول نویسی یا افسانہ نگاری کی طرف مائل کرتی انہوں نے تاریخ، تحقیق اور تنقید کو موضوعات کی حیثیت سے منتخب کر لیا، فصیح الدین کی ادبی دنیا وسیع تھی تاہم تاریخ تحقیق اور تنقید میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔“

تاریخ ایک خشک موضوع ہے، اس موضوع کے لئے جس قدر ٹھوس حقائق، تاریخی شواہد اور تحریری ثبوت کی ضرورت ہے مورخ اپنے بیان کی صداقت کو پہلے غور کرتا ہے عام طور پر تاریخ نگاروں کے یہاں موضوع کے اعتبار سے عبادت خشک اور بے کیف ہوتی ہے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم نے تاریخ نگاری کے لئے جو موضوع اور اسلوب اختیار کیا ہے اس میں ادبی لطافت بھی موجود ہے اور داستانی دلچسپی بھی۔

”موصوف کی کتاب تاریخ مگدھ ۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے ذریعہ شائع ہوئی ہے جو خالص مگدھ کی ایک تاریخ ہے۔ حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم نے دوسرے تاریخ دانوں کے علاوہ فارسی کی منظوم تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ تاریخ میں ادبیت اور شہریت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، مینرکب فتح ہوا اور یہاں مسلمانوں کے سب سے پہلے قدم کب آئے مختلف تاریخوں کے حوالوں سے

بحث کرتے ہوئے اس کے ثبوت میں فارسی کے دو اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

مینر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۱۷۶۶ء ۱۱۷۸ھ میں حضرت تاج
فقیر اور قطب سالار نے راجہ مینر کو شکست دے کر مینر پر قبضہ کیا اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے
ان میں پچیس آدمیوں کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں اور اس کی فتح کی تاریخ بھی حسب ذیل ہے:

یافت چوں بر راجہ مینر ظفر داد امام از دیں جمائے رانوی
ہست منقول از بزرگان سلف سال آن دین محمد شد قوی

ان اشعار کو پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے بیان کی صرف صداقت ہی نہیں بلکہ مسلسل
تاریخی حوالوں سے ان کے بیان میں یکسانیت پیدا ہو رہی ہے، شعر نثر کے مقابلے بلاشبہ زیادہ
موثر اور لطیف ہوتا ہے اور حضرت فصیح الدین لمحنی مرحوم اس نکتہ سے واقف تھے۔ ڈاکٹر شعیب راہی
لکھتے ہیں:

”اے“ تاریخ نگاروں میں ان کا اسلوب عام طور پر رواں بے ساختہ اور پرکار ہے، ان کی
نثر اس قدر غیر جانب دار ہے کہ کسی طرح بھی لغزش نہیں ہوتی، قتل ہو یا جاں بخشی ہر جگہ
صاف اور سحر آؤ ملتا ہے۔“

معین الدین طغرل کے بیان میں لکھتے ہیں:

”اے“ اتفاقاً ایک دن سلطان کے مقدمۃ الجیش میں ملک محمد شیر انداز اور اس کا بھائی
ملک مقدر کہیں چالیس سواروں کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوئے تو چند بقال نظر آئے اور ان کو
گرفتار کر کے طغرل کا بیٹہ پوچھا تو پہلے انہوں نے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔ شیر انداز نے ان بقالوں
کو مالک بارہک کے پاس روانہ کیا اور خود ایک بلند سیلہ پر چڑھ کر دیکھا تو طغرل لشکر کو بالکل

اے ملاحظہ ہو فصیح الدین لمحنی اور ان کا اسلوب، مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی شائع شدہ رسالہ

ربان و ادب پٹنہ اکتوبر ۱۹۷۷ء

اے ملاحظہ ہو تاریخ نگاروں کے مصنف فصیح الدین لمحنی۔

غافل پایا۔ اس کے ہاتھی گھوڑے بھی چرائی میں مشغول تھے اس فرصت کو غنیمت جان کر تیس چالیس سواروں نے جو اس وقت موجود تھے اچانک طغرل کی خیمہ گاہ پر حملہ کر دیا، ان سواروں نے نعرہ بلند کیا کہ ”سلطان بلبن کا اقبال قائم رہے“ طغرل نے خود سلطان بلبن کے آہنچے کا گمان کیا، گھبراہٹ میں ظہارت خانے سے نکل کر بغیر زین کے گھوڑے پر سوار ہو کر مدی کو عبور کرنا چاہا، اسی وقت ملک مقدم نے ایک تیر سے اس کا کام تمام کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر رکھ لیا، بعد میں ملک باریک کا لشکر بھی پہنچ گیا اور طغرل کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے سلطان بلبن کے پاس لے گیا، سلطان بلبن نے ملک مقدم کو ”طغرل کش“ کا خطاب دیا اور لکھنؤ کی واپس آ کر باناروں میں دو رنگ سولیاں کھڑی کرائیں اور طغرل کے تمام اہل و عیال اور اعیان و انصار کو مجرم قرار دیکر قتل کرایا۔“

اس پوری عبارت میں کہیں بھی اکناہٹ اور پھیکا پن نہیں محسوس ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف کے مزاج میں خود بھی ٹہراؤ ہے، فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کا یہی کمال ہے، جو تاریخ میں واقعات کی انغیش اور تحقیق کے علاوہ طرزِ تحریر کی خصوصیتیں بھی موجود ہیں۔ داستانوی انداز کے علاوہ ادبی اور شعری لطافت بھی موجود ہے، کہیں کہیں قاری کو انسانی نفسیات کی جلوہ گری بھی ملتی ہے، ان تمام خوبیوں نے تاریخ نگار کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے، تاریخ نگار میں چند بے حد دلچسپ داستان بھی پائی جاتی ہے، شہزادہ سلیم اور مہر النساء کے عشقیہ واقعات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

”۱۰۶۸ء میں شہزادہ سلیم نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف الہ آباد آ کر خود مختارانہ

حکومت شروع کی..... صوبہ بہار قطب الدین خاں (نواب حضرت سلیم چشتی کی جاگیر پایا یہ وہی قطب الدین خاں ہے جو ۲ صفر ۱۰۱۵ء کو بردوان میں علی قلی شیر افغن شہر مہر النساء کے ہاتھوں قتل ہوا، کہا جاتا ہے کہ قطب الدین خاں نے جہانگیر بادشاہ کے ایما سے شیر افغن کو یہ صلاح دی تھی کہ مہر النساء کو طلاق دے کر فوراً آگرہ بھیج دے، واقعہ

واقعہ کی اصلیت جو کچھ بھی ہو، بغا ہر بات کی بات میں قطب الدین اور شیر انگن میں ایسی
 بگڑ گئی کہ آنا فنا تلوار چل گئی اور دونوں مقتول ہوئے ۔
 سلطان غیاث الدین اور حافظ شیرازی کی حکایت قارئین کی دلچسپی کے لئے بیان
 کی گئی ہے ۔

ایک مرتبہ غیاث الدین اعظم شاہ مشرقی بنگال کی طرف گیا ہوا تھا اتفاقاً اس
 سفر میں کوئی مرض ایسا لاحق ہوا کہ اس کو زیست سے یاس ہو گئی ۔ اس وقت اس کی تین
 بیویاں بھی ساتھ تھیں جن کے لقب سر و محل، گل محل اور لالہ محل تھے ۔ اس نے ان کو
 وصیت کی کہ میرے مرنے پر نعش کو تم اپنے ہاتھوں سے غسل دینا لیکن غیاث الدین اعظم
 شاہ نے مرض سے شفا پائی تو اس کی اور بیویوں نے ازراہ طعن ان تین حرموں کو عسالہ
 کہنا شروع کیا انہوں نے موقع پا کر اعظم شاہ سے شکایت کی، اس وقت عالم انبساط
 میں اعظم شاہ کی زبان پر بر جستہ یہ مصرع آیا :

سطر ساقی حدیث سر و گل ولالہ می رود

لیکن اس کے برابر کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہیں آیا اور دربار کے شعرا بھی حسب دلخواہ مصرعہ نہ لگا سکے
 اعظم شاہ نے یہ مصرعہ طرح ایک قاصد کے معرفت کچھ تحائف کے ساتھ حضرت شمس الدین حافظ شیرازی
 کے پاس روانہ کیا اور حضرت حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی ۔ حضرت حافظ بھی بنگال آنے کے
 شائق تھے لیکن کبر سنی اور صعوبت سفر کا اندیشہ رفع نہ ہوتا تھا، تاہم ایک غزل کہہ کر روانہ کیا جس کے
 تین اشعار کو دیوان سے تعلق ہے اس لئے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں ۔ پوری غزل دیوان میں موجود ہے

ساقی حدیث سر و گل ولالہ می رود ایں بحث بانگلاشہ عسالہ می رود

شکر دہن شوند ہمہ طوطیان ہند زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ از شوق مجلس سلطان غیاث الدین خامش مشوکہ کار تو از نالہ می رود

لے ملاحظہ ہو تذکرہ نسوان ہند مصنفہ فیض الدین بلخی مرحوم ص ۱۲ اشعارات ۔

س واقعو کو مختلف تاریخی شواہد کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے، انہوں نے تاریخ میں اپنے بیان کی صداقت کے لئے صرف ثبوت ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ اشعار کا سہارا بھی لیا ہے تاکہ ان کے بیان کو مزید تقویت پہنچے وہ فن تاریخ کو ادب اور شعر کی لطیف منزلوں تک لے جانے کے قابل تھے اور تاریخ نویسی میں فسانہ طرازی کے بھی قابل تھے۔ تاریخ صرف ملک ہی کی نہیں ہوتی بلکہ انسان کی بھی تاریخ ہوتی ہے بلکہ بعض مقام ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان کے خارجی حالات کے علاوہ داخلی معاملات بھی ملتے ہیں داخلی کیفیات کی ترجمانی کا مسئلہ خالص انسانی ہوتا ہے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

”شہزادہ اپنی شہزادگی کے سبب حکومت کرتا تھا اور مرشد قلی خاں کو بادشاہ کا معتمد ہونے کے سبب اپنے اعزاز کا خیال کرتا۔“

اس ایک جملہ میں شہزادہ اور مرشد قلی خاں کے مرتبے کے ساتھ ساتھ ان کی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا گیا ہے، الفاظ، طرز ادا اور جملہ کی سادگی نے اس کی کیفیت کو اور بھی ابھار دیا ہے۔

فیض الدین بلخی مرحوم کی دوسری تصنیف ”تذکرہ نسوان ہند“ ہے۔ یہ خالص خواتین کا ایک تذکرہ ہے جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ شاعرات، مصنفات، کمالات، شہرات اور مقدسات۔ یہ موصوف کا تحقیقی کا نامہ ہے۔ ہمیں دراصل یہ دیکھنا ہے کہ ان کا فن عظمت اور ان کے حالات زندگی کے پیش نظر انہوں نے کون سا محققانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ محقق ہمیشہ انداز بیان اور طرز اسلوب میں محتاط رہتا ہے وہ ہمیشہ اس بات کو مد نظر رکھتا ہے کہ کوئی جملہ یا کوئی عبارت ایسی نہیں لکھی جائے جو محققانہ طرز تحریر کم رفعت اور غیر معیاری ثابت کرے۔ فیض الدین بلخی مرحوم کا طرز اسلوب ہمیشہ فیصلہ کن ہوتا ہے، اسلوب میں کہیں بھی لغزش اور کوتاہی نہیں ہوتی۔

اور نگ زیب (عالمگیر) کی بیٹی زیب النساء مخفی کی نسبت نام طر پر جو داستانیں مشہور ہیں ان کے متعلق صرف یہی لکھ کر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

”لوگوں نے بہت سے رطیفے اور ہزلیات بھی اس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں لیکن اس کے

کلام کی پاکیزگی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ تمام تر لطیفے اور ہزلیات لوگوں کی من گڑھت
ہیں۔

یہ عبارت بہت ہی مختصر ہے لیکن اس کا طرز اسلوب فیصلہ کن ہے کہ مخفی کی شخصیت کا وقار
کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے اس میں الفاظ کی پاکیزگی اور فیصلہ بڑی معنویت اور گہرائی کے حامل ہیں
الفاظ شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ الفاظ کے صحیح یا غلط استعمال سے نہ صرف شخصیت کی سیرت متاثر
ہوتی ہے بلکہ محققانہ انداز بیان بھی متاثر ہوتا ہے۔

حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف ”مذکرہ نسوان ہند“ میں خصوصاً شاعرات کے حصے
میں کوئی بھی امتیاز نہیں برتا ہے۔ ان کے پیش نظر وہ تمام خواتین تھیں جنہیں شرو شاعری کا ذوق تھا اور
فکر سخن بھی کرتی تھیں۔ محل شہزادی ہو یا ادنیٰ درجہ کی طوائف ہر طبقے کی شاعرات کے سلسلے میں اس کے مرتبے
کا طرز خیال کرتے تھے۔ کسی شاعرہ کی بھی تعریف یا تضحیک نہیں کرتے بلکہ اس کی زندگی کے حالات کو
منظر عام پر لانا مقصود تھا۔ ایسے موقع پر ان کے انداز بیان میں ضبط اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو ایک
لفظ یا جملہ سے کسی مخصوص شاعرہ کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ بڑے حالات زندگی میں لکھا ہے۔
”بڑی دہلی کی ایک زن خانگی کا نام اور تخلص تھا۔ میں مشہور تھی، دہلی کا رہنے
والا گلاب سنگھ کھتری آشفۃ تخلص اس پر شیفتہ ہوا جس کے فیض سے موت نے شاعری کو شمار
بنایا۔“

آشفۃ نے کئی زن پر آشفۃ سری کی ہے، ایک دن اپنا گلاب اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیا۔ بڑا
کو ایسا تعلق ہوا کہ تپ و تی میں مبتلا ہو کر چھ ماہ کے اندر مر گئی۔
اس عبارت میں اگرچہ تفصیل نہیں۔ تاہم اس کی عاجی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی زنا دہی اور
جان نثاری کا بھی علم ہوتا ہے، آشفۃ کے تخلص کو معنوی اعتبار سے مختلف حیثیتوں سے پیش کیا ہے جس سے
عبارت میں خاص قسم کی سنگتگی اور لطافت بھی پیدا ہو گئی ہے، اسی طرح آراکش کا ذکر کرتے ہوئے صرف

ایک چھوٹا سا جملہ لکھ دیا ہے :

۱۔ ”اواکلی عمر میں کسی قدر آوارہ حال تھی۔“

فیض الدین بلخی لفظ کے انتخاب میں اس قدر مہارت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ چابک دست اور باشعور تھے کہ کوئی بھی جملہ غیر شعوری طور پر نہیں نکلتا، آرائش کے ذکر میں آگے چل کر لکھا ہے۔

۲۔ ”بعد کو اس نے ایک مرد سے عقد کر لیا اور باقی عمر نہایت سلامت روی میں گزاری۔“

آرائش کو انہوں نے آوارہ حال لکھا ہے۔ آوارہ حال اور آوارگی میں فرق ہے، مزاج کی آوارگی بڑی مشکل سے اصلاح پذیر ہوتی ہے، حال کی آوارگی صورت حال بدل جانے کے بعد بحال ہو جاتی ہے

یہی سبب ہے کہ آرائش میں سلامت روی آگئی۔ فیض الدین بلخی مرحوم شخصیتوں کی خارجی تصویر پیش کرنے

میں مہارت رکھتے تھے۔ یہ تصویریں بڑی ہی دلچسپ اور ہاڈب نظر ہیں۔ ان میں سادگی بھی ہے اور پرکاری

بھی۔ صنم اسد اللہ خاں غالب، خواجہ غلام غوث بے خیر اور مرزا حاتم علی کی ہم جلس اور ہم عصر تھی۔

اس کے حالات میں لکھا ہے :

۳۔ ”اس کے زمانے میں درگاہ صنم نوعمر تھی اور پیشانی پر قشقہ لگا رہتا تھا، صنم کی خارجی

تصویر کا کتنا کھلا اور صاف عکس ہے۔

فیض الدین بلخی کی طرز تحریر میں طنز و طراقت کا رنگ عمومی طور پر نہیں ملتا ہے کیونکہ ان کا

طرز و اسلوب تاریخ یا تنقید یا تحقیق ہر جگہ بے حد سنجیدہ ہے لیکن کہیں حالات اور کیفیات کو

اس طرح پیش کیا ہے کہ لہکا سا تبسم قاری کے ذہن پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرز میں تبسم کے بجائے

خلوص کا پہلو نمایاں ہے جو نیک نیتی اور غیر جانب داری کی دلیل ہے۔ اجڑے سرو کا ذکر کرتے ہوئے

لکھا ہے :

۴۔ ”تذکرہ نسوان ہند مصنف فیض الدین بلخی مرحوم ص ۶۳ حمد شاعرات

” ”

” ” ” ” ” ” ” ”

اندازہ ہو جاتا ہے۔ ممتاز محل کے بیان میں لکھا ہے :

”جہاں گیر خود بیٹے (شاہ جہاں) کی برات لے کر دہلی (ممتاز محل) کے گھر گیا تھا،
مہر پانچ لاکھ روپیہ قرار پایا تھا اور دو لہائے موتیوں کا بیش بہا ہار دہلی کے گھر میں ڈالا
تھا۔“

اس عبارت میں تحقیق کے ساتھ افسانوی انداز بھی پایا جاتا ہے، تحقیق اور افسانے کا یہ انداز
بھی بہت خوشگوار ہے اس طرح تحقیق میں حد درجہ اثر انگیزی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تحقیق میں
تاثراتی تحریر بھی فصیح الدین بلخی کے اسلوب کا نمایاں وصف ہے، ”زوجہ داؤد خاں کے تذکرے میں لکھا ہے:

”اس عورت (زوجہ داؤد خاں) کی خودکشی کا واقعہ دنیا کے عجیب و غریب واقعات
ہیں، اس کا شوہر داؤد خاں والی گجرات حسین علی خاں امیر الامرا کے مسلح اور زرہ پوش
سپاہیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو اس عورت نے زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی کی ٹھان لی لیکن
سات ماہ کی حاملہ تھی اور بچہ کو اپنے شوہر کے نام و نسل کی یادگار چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے
غنجر سے اپنا پیٹ بہت احتیاط کے ساتھ چاک کیا اور بچہ کو پیٹ سے نکال کر بطور امانت
ورثا کے سپرد کیا اور عدم کی راہ لی۔“

تحقیق میں طرز تحریر کا یہ تاثراتی رنگ بھی ان کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ہے، فصیح الدین بلخی مرحوم
نے اپنی طرز تحریر میں تاثر، جاندار اور جذباتی کیفیت پیدا کرنے کے لئے جا بہ جا اشعار بھی بیش
کئے ہیں۔

یہ اشعار ہمیشہ خیالات کے دریچوں سے ظاہر ہوتے ہیں، اس بے ساختگی کے سبب انداز میں
دلکشی اور اثر انگیزی پیدا ہو گئی ہے، جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی تھی بادشاہ زادی ہونے
کے باوجود تصوف سے خاصہ شغف رکھتی تھی۔ اس کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے

”جہاں آرا نے ستر برس کی عمر میں ۹۲ھ میں انتقال کیا اور حسب وصیت حضرت
نظام الدین کے احاطہ میں مدفون ہوئی، مدفن پر یہ شعر کندہ ہے
بغیر بزمہ نہ پوشد کسے مزار مرا : کہ قبر پوش غریباں ہوا گیاہ بس است

جہاں آرا کے پورے حالات کی روشنی میں یہ شعر اس قدر جذباتی کیفیت کا حامل ہے کہ قاری کے دل میں داخلی تاثرات کی لہریں موج زن ہو جاتی ہیں، عام طور پر تحقیق کی عبارتوں میں ایک قسم کی خشکی اور ثقل پائی جاتی ہے۔ تحقیق بذات خود ایک خشک موضوع ہے اور خشک عبارت ادبی فن تحقیق کو باضابطہ مجروح کرتی ہے۔ اس پر عبارت اگر بحیدہ نامافوس اور غیر لطیف ہو تو یہ محقق کے اسلوب کی خفائی کی دلیل ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خشک سے خشک تحقیقی موضوع کو دلچسپ انداز میں پیش کئے ہوئے ہیں قارئین کو خشک موضوع کا احساس نہیں ہوتا۔

مقدسات کے سلسلے میں ان کا انداز بیان عقل سے زیادہ جنون کے قریب رہا ہے زندگی میں خود ان کی شخصیت پر بھی جنون کا غلبہ رہا ہے جو تصوف، روحانیت اور سلوک کا فیضان ہے، مقدس شخصیتوں کے ذکر میں ان کے انداز بیان میں تقدس اور پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو جنونی اور روحانی کیفیات کا رنگ غالب ہے، الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں ہٹاؤ اور ضبط و نظم ہے عبارت کی اٹھان، ترتیب اور اختتام کچھ ایسا ہے کہ شخصیت کی بزرگی، تقدس اور مرتبہ کا پورا خیال ہے، ساتھ ہی ساتھ ان کے مرتبہ کا بھی احساس ہوتا ہے حضرت قمر خاتون (والدہ محترمہ حضرت فرید الدین شکر گنج) کے ذکر میں لکھ ہے :

”انہیں حضرت (قمر خاتون) کے فیض پرورش سے حضرت شکر گنج نے اجودھن میں توطن اختیار کی تو اپنے بھائی حضرت نجیب الدین متوکل کو ان کے (اپنی والدہ) لائے گئے لے بیٹھا۔ وہ ان کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ راہ میں پانی کی ضرورت ہوئی تو ان کو ایک درخت کے سائے میں بیٹھا کر پانی کی تلاش میں نکلے، واپس آئے تو ان کو نہ پایا۔ ادھر اُنھیں دیکھنے پر کچھ ہڈیاں نظر آئیں۔ ان کو ایک پھیلی میں جمع کر لیا لیکن وہ ہڈیاں پر اسرار طور پر غائب ہو گئیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے قمر خاتون کے حقائق سے متعلق کوئی بھاری بھر الفاظ نہیں استعمال کئے صرف سادہ طور پر واقعات کا ذکر کیا ہے یہی انداز بیان انہوں نے حضرت زلیخا بی بی (والدہ ماجدہ حضرت نظام الدین اولیاء) کے تذکرے میں بھی اختیار کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے :

”دوسرے مہینے حضرت نظام الدین اولیاؒ رقوم بوسی کے لئے حاضر ہوئے تو ان کی والدہ نے فرمایا کہ آئندہ مہینہ میں تم کس کی قدم بوسی کرو گے“ حضرت نظام اولیاؒ ہر ماہ اپنی والدہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتے تھے

حضرت نے مضطرب ہو کر پوچھا کہ مجھے کس کے سپرد کرتی ہیں۔ ماں نے جواب دیا : آج کی شب تم اپنے بھائی کے ساتھ رہو۔ کل تمہارے سوال کا جواب دوں گی، حضرت نے حسب حکم بھائی کے گھر میں رات گزاری اور صبح کو حاضر ہوئے تو ماں نے کہا۔ اپنا دامن ہاتھ میرے ہاتھ میں دو، حضرت نے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو ماں نے کہا اے خدا میں تیرے سپرد کرتی ہوں، اسی وقت بی بی زینبؓ کی روح پرواز کر گئی۔“

یہ عبارت کس قدر سیدھی سادی ہے۔ نہ غیر مانوس استعارے نہ فارسی کی عبارت موجود ہے، دراصل یہ وہ واقعات ہیں جن سے خود ملنی صاحب مرحوم متاثر تھے۔

فیض الدین ملنی مرحوم ایک ناقد تھے، تنقید میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے۔ ان کے تنقیدی مثالوں کی روشنی میں ان کے طرز و اسلوب کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

عمومی طور پر تنقید کو عام فہم ہونا چاہئے۔ ناقد کا بیان اور طرز اسلوب سمجھ میں آنا چاہئے۔ اگر یہ خوبی طرز تحریر میں نہیں برتی جاتی تو تنقید بے اثر ہو جائے گی۔ تنقید میں فیض الدین ملنی کا طرز و تحریر موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے مضامین کی نوعیت اگرچہ تحقیقی ہے مگر جا بجا ان کا تنقیدی شعور جھلکتا ہے۔ جن سے ان کے تنقیدی اسلوب کا پتہ چلتا ہے، ضیاء عظیم آبادی کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔ ”ان کا کلام محض تخیل نہیں بلکہ اپنے ذاتی جذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے۔“ یہ جملہ بظاہر بہت مختصر ہے مگر معنوی اعتبار سے ضیاء کے تمام کلام پر محیط ہے، آگے چل کر

لکھنا ہے :

”ملاحظہ ہو تذکرہ سوانح ہندوستان فیض الدین ملنی ص ۱۳۱ حصہ مقدسات

”ملاحظہ ہو عظیم آباد کا جوان درگ شاعر“ مقالہ شائع شدہ رسالہ تہذیب

۱؎ "جن لوگوں نے دنیا کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف

ہیں کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان ہے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کے چھوٹے چھوٹے جملے بڑی معنویت کی حامل ہیں، ان کی طرز تحریر سے صفائی طبع کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا یہی طرز بیان ان کی اکثر تنقیدی عبارتوں میں ملتا ہے، عزیز الدین بلخی مرحوم پر مقالہ لکھتے وقت جب ان کی شاعری کیا ہے تو لکھا ہے :

۲؎ "اردو میں اکثر مشکل زمین ایجاد کر کے طبع آزمائی کرتے تھے اور محاورہ بندی کا خیال

رکھتے تھے۔"

گویا مشکل زمین ایجاد کرنے اور محاورہ بندی کا خیال رکھنا راز عظیم آبادی کے کلام کی بنیادی خصوصیتیں تھیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

النشاد شاد : فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں میں انشاد شاد کا نام سب سے اہم ہے، بلخی صاحب مرحوم نے اس کتابچے میں شاد عظیم آبادی کے کلام پر فنی اور اصولی تنقید کی ہے بلخی صاحب مرحوم نے کلام شاد پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے :

کفر است در شریعت ما کینہ داشتن

آئین ماست سببہ چو آئینہ داشتن

آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے :

۳؎ "وہی صاحب اور حمید صاحب پرکار کی طرح سر پھیر کر دائرہ تلمذ میں گردش کرتے

ہیں اور میں نے آزادانہ قلم اٹھایا ہے اس لئے میری ادراس کی سرحدیں بالکل جدا گانہ ہیں

میں نے فن کے معیار پر جانچ کر دکھایا ہے کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیا ہے۔"

۴؎ ملاحظہ ہو عظیم آباد کا جواں مرگ شاعر مقالہ شائع شدہ رسالہ تہذیب، پٹنہ

۵؎ تاریخ شعرائے بہار کا مکتب مقالہ شائع شدہ اشارہ پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء

۶؎ رسالہ انشاد شاد مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

تنقید میں فصیح الدین بلخی مرحوم کا انداز بالکل موثر اور بے باک ہے اور جو کچھ کہتا ہے روشن
دلیلوں کے ساتھ کیا ہے۔

”لے شتر گریہ اور ضائق کی عدم مطابقت قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے“ عجیب
ہے کہ شاد صاحب نے فرمایا ہے۔

چلے جائیں گے ہم جو محفل سے تیری
کوئی اور میری جگہ آ رہے گا

”ہم اور میری کیا“

تنقید کا یہ انداز بیان کس قدر مدلل اور بے باک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے
”قاری کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔ ان ہی مسائل پر ان کا ذہن کس قدر صاف تھا جو کچھ انہوں نے کہا ہے
انتہائی صاف اور سٹھرے انداز میں کہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے چند عنوانات قائم کر کے شاد سے مثالیں
پیش کی ہیں جن میں عامیانه مذاق، سوقیانہ انداز بیان، زبان اور محاورے کی غلطیاں، تناقض، شتر
گریہ، حشو و زوائد، ردیف کا چسپاں نہ ہونا، زبان و فن سے نا آشنا ہونا، سرفہ کلام، شاد کا
اختراع و تصرف وغیرہ اہم عنوانات ہیں اور انہی کے ذیل میں کلام شاد کے فنی تناقض کو اجاگر کیا گیا ہے
ہمیں اس سے یہ بحث نہیں کہ یہ تنقید اور طریقہ تنقید کہاں تک درست ہے، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ
تحریر کا انداز اور پیش کش کا طریقہ کتنا سادہ، جاذب اور دلکش ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

”شب آخر ہے ذرا غنچوں کو دیکھ اور خوش ہواے بلبل

ترے نالوں سے کمختوں کی چھاتی پھٹی جاتی ہے

یہ شعر شاد کے مایہ ناز اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں کہ شاد نے اس کو نہایت
شد و مد سے پڑھایا اور وہ خود اس کے مقابلہ میں غالب کا شعر نقل کر کے فرماتے ہیں کہ غالب کا بھی

ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا ہے

کہتا ہے کون نامہ بلبیل کو بے اثر

پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے (غالب)

غنجوں کو کم بخت کہنے کی کوئی وجہ نہیں اور چھاتی پھٹتی جاتی ہے کی جگہ چھاتیاں پھٹتی جاتی ہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس شعر سے شاگردوں کی عقیدت مندی اور شاعر کی زباندامانی اور اسادی کا بھرم کھل گیا ہے

پڑھے منکوحی کلمہ دیکھ کر طرف رقم میرا

عصا موسیٰ نبی کا تیرے حیدر کی تعلیم میرا (شاد)

اس محل پر پڑھے سے پڑھنے لگے زیادہ فصیح ہوتا اور موسیٰ نبی یا داؤد نبی شاید ویسی پادری بولتے ہوں گے۔ اُردوئے معالیٰ کو اس سے کوئی سروکار نہیں، مطلع کا مضمون داغ کے مطلع دیوان سے اُڑایا ہوا معلوم ہوتا ہے ملاحظہ ہو

عددے سامری دیکھے اعجاز رقم میرا

عصائے موسیٰ ہے حمد خالق میں قلم میرا (داغ)

تجربہ ہے کہ ولی صاحب داغ کے مطلع کے متعلق فرماتے ہیں کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا۔

نبی کا لفظ محض بیکار اور مانع فصاحت ہے

کھلا ہے بام پر جوڑا کسی کے بعد مشکیں کا

کہ مجھ تک بوئے گیسو کارواں درکارواں پہنچی (شاد)

بام اور جوڑا اور جسد اور گیسو اور کارواں درکارواں محض الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقتاً شاعر نے وحید الہ آبادی کے شعر کو غارت کیا ہے۔ قواد الکلام شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے نظم کیا تھا انقباض کرنے سے ناقص و کمال کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

معطر ہے اسی کو چے کی صورت اپنا صحرا بھی

کہاں کبھی ہیں زلفیں یار نے خوشبو کہاں تک ہے (وحید)

انشاد شاد میں ایسی مثالیں بہت سی ملتی ہیں۔ یہ طرز اسلوب کس قدر مدلل قابل قبول اور عام فہم ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کے طرز بیان کی ایک خوبی ہے کہ انہوں نے فنی اور شعری بحث بھی کی ہے۔ ان فنی اصولوں اور نکتوں کو انہوں نے بڑی خوبی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ایسی عبارتیں اگرچہ بہت کم اور بہت مختصر ہیں۔ ان کی صفائی، سادگی اور جامعیت بڑی قابل قدر چیزیں ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

۱؎ ”فن بلاغت سے واقفیت رکھنے والا جانتا ہے۔ تشبیہ واستعارہ کی خوبی و لطافت وجہ تشبیہ یا وجہ جامع کے لوازمات و ملحوظ رکھتے ہیں۔ مختصر ہوتی ہے۔“
۲؎ ”فصحا کا قول ہے کہ جس شعر کے معنی بیان کرنے میں تاویل کی حاجت ہو بے معنی ہے۔“

۳؎ ”اصطلاحات کے اعتبار سے کلام میں قریب المخرج حروف کے جمع ہونے سے تلفظ میں چونکہ تکرار ہوتی ہے اس کو تنا فرماتے ہیں۔“
انشاد شاد میں اس قسم کے جملے جن سے کوئی نہ کوئی فن اور اصطلاحی بحثیں عموماً خشک ہوتی ہیں، پڑھنے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا لیکن بلخی صاحب مرحوم کے طرز اسلوب کا کمال ہے کہ ان کا طرز بیان مقصدی ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

۴؎ ”وہ (حمید صاحب) صفحہ ۲۷ میں فرماتے ہیں کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کا (یعنی شاد کا) طرز میرانیس سے کسی طرح کم نہیں، کیا اس بیان سے میرانیس کی توہین نہیں ہوتی ہے۔ شاد ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کو استاد فن اور میرانیس کا ہمسر کہنا یا بلاغت میں غالب سے برتر اور سلاست زبان میں دارع سے بہتر قرار دینا سراسر لغو اور مضحکہ خیز بات ہے۔“

۱؎، ۲؎، ۳؎ رسالہ انشاد شاد مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم
۴؎ ” ” ” ” ” ” ”

انشاد شاد میں فصیح الدین بلخی مرحوم نے شاد کے کلام پر جتنی بھی تنقیدیں کی ہیں وہ سب مدلل، بے باک و صاف ہیں۔ ایک ناقد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے کسی بھی شاعر کے کلام سے بحث چھیڑے تو اردو شاعر کے کلام کو دائرہ تنقید میں لینے سے قبل وہ اپنی ذاتی رائے نہ چھیڑے بلکہ فن عروض اور فن بلاغت سے بھی اس کی گہری واقفیت ہو۔ عام طور پر تنقید نگار اس فن سے بالکل ناواقف ہیں جس کے نتیجے میں ان کی تنقید محض ذاتی رائے تک ہی بالکل محدود ہو جاتی ہے لیکن بلخی صاحب مرحوم نے کلام شاد سے قبل قلم اٹھاتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی مراد شاد کی تحقیر نہیں بلکہ ان کے طرز اسلوب کا کمال ہے کہ فن بلاغت اور فن عروض کی خشکی سے قاری کے ذہن کو دور کراتے ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار: فصیح الدین بلخی مرحوم کی تیسری مطبوعہ تصنیفات میں "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، یہ تذکرہ تین ادوار میں منقسم کر کے لکھا گیا۔ دور متقدمین میں وہ شعرا ہیں جو ۱۲۰۰ھ تک مشق سخن کرتے تھے۔ دور متوسطین میں وہ شعرا ہیں جنہوں نے ۱۳۸۰ھ تک شعر و شاعری کا بانار گم رکھا تھا، تذکرہ نگار نے اس تذکرہ کی تصنیف و تالیف کا مقصد بیان کیا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اردو زبان جس کس میری اور بے بسی کے عالم میں مبتلا ہے وہ بلخی صاحب سے پوشیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف کے مقدمہ میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے

ملے "ہندو شعرائے بہار" بہار کا پہلا تذکرہ ہے اور اس سے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صوبہ بہار میں فارسی اور اردو زبان و شاعری کے رواج و ترقی میں ہندوؤں نے کس کشادہ دلی سے حصہ لیا ہے اور اب تک لے رہے ہیں نہ

محو کیا نقش محبت ہو کہ ارباب وفا
جتنے ملتے گئے اتنے ہی نمودار ہوئے (راسخ عظیم آبادی)

بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف کے مقدمہ میں اپنا منشا ظاہر کرتے ہوئے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ کوئی بھی جملہ بھاری بھر کم نہیں یا طنزیہ لب ولہجہ میں نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ انہوں نے راسخ عظیم آبادی کے اس شعر سے اردو زبان کی اس ملک میں موجودہ حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ دراصل یہی ان کے اسلوب کا ایک اچھوتا ادبے مثال کمال ہے۔

ماجرام نہاں موزوں کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :
 ”ہمارا جہ رام نہاں موزوں کا ایک ناظم صوبہ دار ناری کے صاحب دیوان اور خوشگو
 شاعر تھے۔ شیخ علی حزیں متوفی ۱۷۸۷ء کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان جو
 ۳۸۴ صفحات پر محیط ہے، راقم کی نظر سے گزرا ہے اس کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ موسوم
 بہ دستور الانشار بھی ان کے وارث رائے مستقر پرشاد کے پاس جس میں سیکڑوں مکتوبات ہیں
 جو اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں، یہ عبارت بہت ہی مختصر ہے لیکن
 موزوں کی ادبی شخصیت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کوئی بھی جملہ بھاری بھر کم نہیں۔“

اس قسم کی مثالیں جا بجا پیش کی گئی ہیں مزید دہرانے کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر شعیب راہی
 فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :

”فصیح الدین بلخی مرحوم نے طرز اسلوب کے معاملہ میں فورٹ ولیم کالج دہلی کالج اور سرسید
 تحریک تینوں مراکز ادب کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس
 کوشش میں اتنے کامیاب ہوئے، ان کے انداز بیان میں بے باکی، صفائی اور انصاف پسندی،
 پاکیزگی اور لطافت اپنے خاندان کی صوفیانہ اور درویشانہ اور روحانی روایتوں سے پیدا
 ہوئی۔ ان کے طرز اسلوب میں ان کی شخصیت کی پوری جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات
 میں جس قدر صاف گو، پاکیزہ اور لطیف تھے ان کی نثر بھی اسی قدر صاف، پاکیزہ اور لطیف
 ہے۔“

۱۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار ص ۱۱۱
 ۲۔ ملاحظہ ہو فصیح الدین بلخی اور ان کا اسلوب مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی، شائع شدہ رسالہ زبان و ادب، انوار

کتابیات

- (۱) اپنی تائش میں مصنف کلیم الدین احمد مرحوم
- (۲) آغاز سحر مجموعہ کلام نادم بلخی
- (۳) اردو کے ہندو شعرا
مصنف خواجہ عبدالرؤف عمرت
- (۴) اردو تنقید پر ایک نظر
مصنف کلیم الدین احمد مرحوم
- (۵) اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر
مصنف ڈاکٹر محمود الحسن رضوی
- (۶) انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب
مصنف ڈاکٹر جادید نہال
- (۷) انشا و شاد (رسالہ) مصنف فصیح الدین بلخی
- (۸) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقار
مصنف ڈاکٹر اختر ادیبوی
- (۹) بہار میں اردو تذکرہ نگاری
مصنف ڈاکٹر مسعود عالم
- (۱۰) بہار تھوڑی ایجنز (بہار انگریزی) مصنف آر۔ آر۔ داکٹر
- (۱۱) تاریخ شعرا بہار جلد اول
مصنف سید عزیز الدین بلخی
- (۱۲) تاریخ نگار مصنف فصیح الدین بلخی
- (۱۳) تجزیہ کلام غالب مصنف رفیع الدین بلخی
- (۱۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول تا ششم
مصنف حکیم سید احمد اللہ ندوی مرحوم
- (۱۵) تذکرہ نسوان ہند مصنف فصیح الدین بلخی
- (۱۶) تذکرہ ہندو شعرا بہار، ایضاً
- (۱۷) تلخیص جلوہ خضر مرتبہ ڈاکٹر طفر ادگانوی
- (۱۸) جلوہ داغ و دیوان ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی
- (۱۹) سراج و منہاج مصنف ڈاکٹر اختر ادیبوی
- (۲۰) سلسلہ فردوسیہ مصنف پروفیسر محسن الدین وردائی
- (۲۱) شاد و عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری
مصنف ڈاکٹر وہاب اشرفی
- (۲۲) صغیر بلگرامی بحیثیت ناقد و شاعر
مصنف ڈاکٹر طفر ادگانوی

مخطوطات

- (۱) آثار بلخیہ مصنف فصیح الدین بلخی ملوکہ راقم
- (۲) آثار قدیمہ " " " "
- (۳) بہارین اردو شکر ارتقا ۱۸۵۱ء تا ۱۹۱۴ء
- مصنف ڈاکٹر مظفر اقبال مخزونہ پٹنہ یونیورسٹی لاہور
- (۴) بہارین اردو شاعری کا ارتقا ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۴ء
- مصنف ڈاکٹر مظفر اقبال مخزونہ پٹنہ یونیورسٹی لاہور
- (۵) دستور سخن مصنف فصیح بلخی ملوکہ راقم
- (۶) شرح العقیدہ (بزبان فارسی) مصنف مولانا مظفر بلخی مخزونہ خدا بخش لاہور پٹنہ
- (۷) مکتوبات مولانا مظفر بلخی (بزبان فارسی) مخزونہ خدا بخش لاہور پٹنہ

مختلف مقالات مخطوطہ

- (۱) ایک روشن داغ نہ رہا مصنف سید علیم الدین بلخی
- (۲) بلخی صاحب مصنف سہیل عظیم آبادی مرحوم
- (۳) پٹنہ یونیورسٹی لاہور پٹنہ ادر مرحوم بلخی صاحب مصنف ڈاکٹر خواجہ فضل امام
- (۴) حضرت فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت مصنف مولانا سید عبدالرؤف ندوی مرحوم
- (۵) سودہ بھی خوش ہے مصنف سید عبدالغنی
- (۶) عقیدت فصیح الدین بلخی بہ عقیدت شرف الدین بہاری مصنف کلیم سید شاہ تقی بلخی

۲۳) صوفی میری کی نثر نگاری

- مصنف ڈاکٹر طیب ابدالی
- (۲۴) عظیم آباد کا ایک یادگار شاعرہ مصنف ڈاکٹر یوسف خوشیدی
- (۲۵) نثری ڈم مود منت ان بہار (بزبان انگریزی) مصنف ڈاکٹر کے کے دتا
- (۲۶) فنکار سے فن تک مصنف پروفیسر ابوذر عثمانی
- (۲۷) کھلا چلیج (رسالہ) مصنف حمید عظیم آبادی
- (۲۸) مرزا علی فدوی حیات اور شاعری مصنف ڈاکٹر سید محمد حسنین
- (۲۹) مشاہیر شواہد مصنف مولوی محمد عباس
- (۳۰) مشرقی بنگال میں اردو مصنف ڈاکٹر سید انبال عظیم
- (۳۱) مقالات قاضی عبدالودود مرتبہ کلیم الدین احمد
- (۳۲) مقدمہ تاریخ شعرائے بہار مصنف سید عزیز الدین بلخی
- (۳۳) نساخ سے وحشت تک مصنف سید لطیف الرحمن
- (۳۴) وسیلہ شرف و ذریعہ دولت مصنف صوفی میری
- (۳۵) وہابی مود منت ان انڈیا (بزبان انگریزی) مصنف ڈاکٹر قیام الدین احمد
- (۳۶) یادگار عشق مصنف شائق عظیم آبادی
- (۳۷) بہار لغت مصنف یوسف الدین بلخی

- (۳۱) رسالہ اشارہ پٹنہ اپریل ۱۹۶۲ء
 (۳۲) رسالہ زبان و ادب پٹنہ اکتوبر ۱۹۵۷ء
 (۳۳) پٹنہ یونیورسٹی ریسرچ جرنل مختلف نمائیں
 (۳۴) بہار رجٹل سروے کمیٹی رپورٹ
 مرتبہ ڈاکٹر کے کے دتا مختلف نمائیں
 (۳۵) فہرست نمائش مخطوطات
 منجانب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن
 بابت ۱۹۵۶ء

- (۲۳) صدائے عام خاص نمبر ۱۹۵۱ء
 (۲۴) رسالہ سپنی گیا ۱۹۵۸ء
 (۲۵) " " " ۱۹۶۲ء
 (۲۶) رسالہ اشارہ پٹنہ مارچ اپریل ۱۹۵۳ء
 (۲۷) " " " دسمبر ۱۹۵۸ء
 (۲۸) " " " فروری ۱۹۵۹ء
 (۲۹) " " " ستمبر ۱۹۵۹ء
 (۳۰) " " " جنوری ۱۹۶۰ء

قطر تاریخ اشاعت

فصح الدین بلخی حیات اور کارنامے

از: حضرت شارق جمال ناگپوری

شاد باش اے مظفر بلخی

پاگئی آج اپنا حق تحقیق

پوری تحقیق میں فصاحت ہے

کہا کس نے؟ کہ ہے ادق تحقیق

آپ کی یہ ہے بر فصیح الدین

خوب علمی ورق ورق تحقیق

